جموں و کشمیر میں اردو ادب:
نمائندہ تخلیقات و تصنیفات کا تنقیدی جائزہ
(1950 سے 2000)

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

مقالہ نگار

لیاقت علی

نگراں

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویج ،لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی ،نئی دہلی ،110067

2017

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
भारतीय भाषा केन्द्र
Centre of Indian Languages
भाषा, साहित्य एवं संस्कृति अध्ययन संस्थान
School of Language, Literature & Culture Studies
नई दिल्ली–110067, भारत NEW DELHI-110067, INDIA

Dated: /07/2017

DECLARARTION

I hereby declare that the research work done in this Ph.D Thesis entitle **"JAMMU WA KASHMIR MEIN URDU ADAB: NUMAINDA TAKHLEEQAT O TASNIFAAT KA TANQEEDI JAIZA (1950 TO 2000)" (URDU LITERATURE IN JAMMU AND KASHMIR: A CRITICAL STUDY OF SELECT WRITINGS 1950 TO 2000)** by me is the original research work and it has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/Institution.

LIAQAT ALI
(Research Scholar)

19/7/17

PROF. KHWAJA MD. EKRAMUDDIN
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

PROF. GOBIND PRASAD
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/JNU

GRAM: JAYENU, Tel.: (91-011) 26741557, 26742676 Extn.: 4217, (D) 26704217; Telefax: (91-011) 26704217
Email: chair_cil@mail.jnu.ac.in, jnucil@gmail.com

جموں و کشمیر میں اردو ادب:
نمائندہ تخلیقات و تصنیفات کا تنقیدی جائزہ
(1950 سے 2000)

انتساب

پیاری بیٹی

ماہرہ لیاقت کے نام

☆☆☆

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
☆	ابتدائیہ	05
☆	اظہار تشکر	10
1۔	جموں وکشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش	12
	☆ حواشی	46
2۔	جموں وکشمیر میں اردو ادب کا آغاز وارتقاء	49
	☆ حواشی	111
3۔	1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اردو نثر کا تنقیدی جائزہ	113
	☆ حواشی	197
4۔	1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ	201
	☆ حواشی	292
5۔	1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اردو صحافت کے مزاج ومعیار ایک جائزہ	295
	☆ حواشی	340
6۔	1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ	341
	☆ حواشی	382
	☆ حاصل مطالعہ	384
	☆ کتابیات اور رسائل وجرائد	394

ابتدائیہ

جموں وکشمیر دنیا کے ان خطوں میں سے ایک ہے جو برصغیر اور دیگر ممالک کے لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث رہے ہیں۔خوبصورتی کے لحاظ سے جنت عرضی کا شرف حاصل ہے۔اُن تمام خصوصیات کا تذکرہ سیاحوں،مورخین، مقامی ادیبوں، غیر مقامی ادیبوں اور دیگر اہل قلم نے کیا ہے۔ جموں وکشمیر کے داخلی حسن کا اعتراف یہاں کے سنسکرت عالموں کے علاوہ فارسی کے عالموں اور عربی کے علماء وادباء، مقالی زبانوں کے شعراء کے کارناموں سے ہوتا ہے جن کی مثالیں دنیا ادب میں آج بھی دی جاتی ہیں۔علاوہ ازیں جموں وکشمیر کو اپنے پانچ ہزار سالوں کی تاریخ محفوظ رکھنے کا شرف بھی حاصل ہے۔جس میں ہندوراجگان کے ادوار، مسلم بادشاہوں کا دور، چک خاندان کا دورِ حکومت، مغل حکمرانوں کا دورِحکومت، افغانوں کا دورِحکومت اور پھر پہلے سکھوں کا قبضہ اس کے بعدان کو شکست دیکر کشمیر پر انگریزوں کا قبضہ اور پھر ریاست کو فروخت کرنے کی مصدقہ تاریخ ’’راج ترنگنی‘‘ میں محفوظ ہے۔

جغرافیائی، لسانی، تہذیبی اور معاشرتی طور پر کئی حصوں میں بٹی ہوئی ریاست ہے جن میں تین حصے اہم ہیں، جموں، سرینگر اور لداخ۔صوبہ جموں میں ڈوگری، پہاڑی، گوجری اور پنجابی زبانیں رائج ہیں جبکہ سرینگر میں کشمیری زبان کا چلن عام ہے، لداخ میں شینا، بلتی اور کوہستانی بولیاں بولی جاتی ہیں۔رسل ورسائل کے فقدان اور بلند و بالا پہاڑی رکاوٹوں کے نتیجے میں کم آمیزی کے باعث یہ زبانیں آپس میں بہت کم میل رکھتی ہیں۔اہل جموں وکشمیر نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے اردو زبان کا استقبال کیا اور فروغ دینے میں دلچسپی لی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق جموں وکشمیر اور اردو زبان کے اس مضبوط، مستحکم اور پائیدار رشتے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ’’کشمیر کا حال دیکھ کر مجھے

خاص حسرت ہوئی، شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں اردو اس قدر مقبول اور رائج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے‘‘۔

جموں وکشمیر کی اس سرکاری اور عدالتی زبان کے ابتدا سے ہی متعدد شاعر اور نثر نگار سرگرم اور اپنی اپنی بساط کے مطابق گلشن اردو کی آبیاری میں مصروف رہے ہیں۔ جموں وکشمیر کو قدرت نے جن خصوصیات سے نوازا ہے ان کو اگر تلاش کرنا چاہیں تو ادب ایک ایسا آلہ کار ہمیں میسر ہے جس میں تمام رنگ اپنی مختلف جہتوں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ادب خواہ جذبے کی صورت میں شعر کا پیکر اختیار کرے یا اس میں فکر وخیال نثر میں ڈھل کر سامنے آئے، تخلیقی روایت کی جہت کا یہ دھارا مذکورہ روایات کو خود میں سموئے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

یوں تو تحقیقی اعتبار سے شاعری پہلے اور نثر بعد میں ظہور پذیر ہوئی لیکن میلان، رویے، رجحان اور تحریک کی صورت میں ایک مسلسل ارتقا دونوں میں کارفرما رہتا ہے۔ آج شاعری اور نثر دونوں میں موضوع، اسلوب، ہیت اور فن کی سطح پر جو مہتمم بالشان سرمایہ میسر ہے اس کے پیچھے ایک پوری روایت موجود ہے جو تغیر وتبدل سے ہمکنار ہوتی ہوئی مختلف صورتوں میں ہم تک پہنچتی ہے۔ جموں وکشمیر میں تخلیق کی اس شعری ونثری روایت کو پروفیسر عبدالقادر سروری، حبیب کیفوی، برج پریمی، حامدی کاشمیری، پروفیسر ظہورالدین، پروفیسر شہاب عنایت ملک کے علاوہ دیگر محققین وناقدین دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کر چکے ہیں۔ اردو ادب کا طالب علم ہونے کے ناطے میری یہ خواہش تھی کہ جموں وکشمیر میں لکھے گئے اردو ادب کا مطالعہ کروں۔ دوران مطالعہ یہ احساس ہوا کہ ریاست میں جس قدر ادب تخلیق کیا گیا ہے اس کو تحقیقی وتنقیدی انداز میں پرکھنے کی مربوط کوشش نہیں ہوئی۔ یہی وہ خیال تھا جس کے پیش نظر استادِ محترم پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی مشاورت اور نگرانی سے اس موضوع کا انتخاب کر کے جموں وکشمیر کے تاریخی اور لسانی پس منظر میں وہاں کے نامور اہلِ قلم کو متعارف کرانے اور ان کے فنی مرتبہ متعین کرنے کی سعی کی

گئی ہے۔ میں نے اس مقالے کو چھ ابواب میں مکمل کرنے کی کوشش کی ہے جن کی تفصیل و ترتیب حسب ذیل ہے۔

باب اول:

جموں و کشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش:۔ کسی بھی زبان کو کما حقہ سمجھنے کے لئے اس ملک کے لسانی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی پس منظر کو جاننا از بس ضروری ہے جس سے اس زبان کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اس باب میں جموں و کشمیر میں اردو زبان سے قبل کی لسانی صورت حال، جموں و کشمیر میں فارسی کی آمد اور مغلیہ دور میں فارسی کے عہد زریں سے بحث کی ہے۔ اردو اور مقامی زبانوں کے لسانی تعلقات اور اس کے پس منظر کا اجمالی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

جموں و کشمیر میں اردو زبان کی آمد کے اسباب و عوامل کا تعین کرتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ زبان وہاں کسی فاتح کے لشکر کے جلو میں نہیں آئی بلکہ سیاحوں، تاجروں، مزدوروں، زاہرین، یاتریوں، سرکاری اہلکاروں، علما و مشائخ، مبلغوں، قوالوں، کے ساتھ آتی جاتی رہی اور ریاست میں اپنا ٹھکانا بناتی رہی۔ اس باب میں ایسے عوامل کی نشاندہی کی گئی ہے جو جموں و کشمیر میں اردو کی آمد اور فروغ کا باعث بنے۔

باب دوم: **جموں و کشمیر میں اردو ادب کا آغاز و ارتقاء:۔** جموں و کشمیر میں اردو زبان کی آمد کے اسباب و عوامل، اہل جموں و کشمیر کی زبان اور اردو کا لسانی تعلقات، اردو شاعری اور اردو نثر کے ابتدائی آثار جیسے جیسی موضوعات قائم کئے گئے ہیں۔ اس باب میں جموں و کشمیر میں اردو ادب کی ابتدائی نگارشات، اسالیب اور تصانیف پر بحث کرنے کے علاوہ ان کے وجود پر بھی تحقیقی بحث کی گئی ہے۔

باب سوم:

1950 کے بعد جموں و کشمیر میں اردو نثر کا آغاز و ارتقاء:۔ جموں و کشمیر میں اردو زبان برگ و بار لے آئی تو

اہل جموں وکشمیر نے اس زبان کو وسیلہ اظہار بنایا اور بہت کم عرصے میں اچھے کامیاب فن کار پیدا ہوئے۔ یہ باب صرف اردو کے نثری ادب تک محدود ہے جس میں نثری اصناف کے علاوہ غیر نثری اصناف خاص طور پر خودنوشت کی روایت کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔اس باب میں جموں وکشمیر کے منتخب نثر نگاروں کی نگارشات اور اسالیب کے علاوہ ان کے فن پر بھی تنقیدی بحث کی ہے۔

باب چہارم:

1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا آغاز وارتقاء:۔ جموں وکشمیر جو اپنے خارجی و داخلی حسن کی وجہ سے موضوعات کی اماج گاہ ہے۔اس باب میں جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے آغاز سے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے اور جن شعراء نے اپنے شعری ادب کے گلشن کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی اور کرنے مصروف کار ہیں، ان کے شعری سرمایہ کا مشروحاً جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب پنجم:

1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اردو صحافت کا مزاج و معیار ایک جائزہ:۔ یہ باب جموں وکشمیر میں اردو صحافت پر مختص ہے۔اہم اخبارات کے علاوہ اہم صحافیوں کی خدمات کو بھی بیان کیا ہے اور ساتھ ہی دور حاضر میں اردو صحافت کی کیا پیش رفت ہے اس پر بھی بحث کی ہے۔

باب ششم:

1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اردو تحقیق وتنقید:۔ اس باب میں جموں وکشمیر میں اردو تحقیق وتنقید کی روایت اور محققین و ناقدین کی کاوشوں کو بروئے کار لانے کی سعی کی ہے۔جموں وکشمیر میں دور حاضر میں اردو تحقیق و تنقید کی کیا صورتِ حال ہے اس بحث سے جو نتائج سامنے آئے وہ یہ کہ گذشتہ دو برسوں سے آج کہیں زیادہ

زرخیز اور بہتر ہے۔ اگرچہ ان محققین و ناقدین میں چند نام ہیں جن کو تنقید و تحقیق کے اساتذہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس باب میں حامدی کاشمیری، ظہور الدین، اکبر حیدری، برج پریمی، یوسف ٹینگ اور قدوس جاوید کے علاوہ دیگر محققین اور ناقدین کی خدمات کا جائزہ کہیں تفصیلاً اور کہیں اختصاراً لیا ہے۔

آخر میں اپنے اس تحقیقی مقالے کا حاصل مطالعہ پیش کیا ہے جس میں مقالے کی تلخیص پیش کرتے ہوئے چھ ابواب کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ آخر میں کتابیات کے علاوہ رسائل و جرائد کی بھی ایک فہرست بطور حوالہ پیش کی گئی ہے، جن سے دورانِ تحقیق استفادہ کیا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

اظہارِ تشکر

تحقیقی مقالے کی تکمیل پر سب سے پہلے ذات باری تعالیٰ کی بارگاہ میں کروڑ ہا سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں۔جس ذات نے مجھے اس مقالے کو مکمل کرنے کا حوصلہ، ہمت اور توفیق عطا فرمائی اور اسکالروں کی صف میں شامل ہونے کا شرف بخشا۔

میرے اس موضوع کے لئے چند لائبریریاں ہی میرا ماخذ تھیں ۔ میں نے ان سے استفادہ کرنے کی حتی المقدور سعی کی ہے۔ان لائبریریوں میں علامہ اقبال لائبریری، کشمیر یونیورسٹی، سینٹرل لائبریری آف جموں یونیورسٹی، جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، رنبیر سنگھ لائبری، وغیرہ شامل ہیں ۔ ان لائبریریوں کے علاوہ چند بک اسٹال اور چند شخصیات کی ذاتی لائبریریوں سے بھی استفادہ کرنے کی سعی کی ہے۔جن اہم شخصیات کی معاونت سے پی ایچ۔ڈی کا یہ تحقیقی کام پایہ تکمیل تک پہنچا ان کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی۔ میں سب سے پہلے پروفیسر شہاب عناعت ملک، ڈاکٹر محمد الطاف، ڈاکٹر محمد ریاض، پروفیسر ظہورالدین، پروفیسر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر وقار احمد کا شکر گذار ہوں اگر میری راہنمائی اور حوصلہ آفزائی نہ کرتے تو شائد میں اس بھاری پتھر کو ابتداء ہی میں سونگھ کر چھوڑ دیتا۔

یہ تحقیقی مقالہ میرے والدین کی دعاؤں کا ثمر ہے جن کی دعاؤں سے میں اس قابل ہوا اور قطرہ قطرہ مواد جمع کر سکا۔اپنے والدین کا نہایت ہی شکر گذار ہوں جنہوں نے خود کو میرے لئے ہر مشکل کے سامنے صرف کیا۔اپنی والدہ جنہوں نے اپنی آغوش سے لے کر پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کی تیاری تک قدم قدم پر میری حوصلہ آفزائی کی، میری لغزشوں سے صرفِ نظر کیا اور مہربان و معاف کرنے والے خدا کی طرح میرے عیوب کی پردہ پوشی کی۔اپنے والد محترم جنہوں نے اپنی علمی بصرت سے مجھے ابتدائی تعلیم سے لے کر تحقیقی سفر کی طرف والہانہ اظہار محبت سے راغب کیا۔ان

کی سبق آموز نصیحتیں اور زندگی کی مشکلات سے مقابلے کی ترغیب نے میرے عزم و حوصلے کو جن نئے راستوں سے آشنا کیا اس سے میرا مشکل سفر آسان سے آسان تر ہوتا گیا۔ اپنے بہن بھائیوں کا شکر گزار ہوں جو ہمیشہ میرے لئے محبت و شفقت کا سرچشمہ رہے اور میری زندگی کے لئے متفکر رہے۔ اپنی شریک حیات کا بے حد شکر گزار ہوں جس کے حصے کا وقت بھی میں نے مقالے کو دیا۔ مرحوم ماموں کی بخشش کے لئے دعا گو ہوں جنہوں نے اپنی محبت کا رشتہ ٹوٹنے نہیں دیا اور اپنی محبت کا ایک حصّہ زندگی کا ساتھ نبھانے کے لئے میرے حوالے کر گئے۔ اس مقالے کی تکمیل میں بہت سے چاہنے والوں، رفقائے کار اور بزرگ ہستیوں نے میری معاونت کی۔ ان تمام کا شکر گزار ہوں

جس ہستی کا سب سے زیادہ مقروض ہوں وہ میرے بڑے بھائی حاجی محمد زبیر ہیں۔ انہوں نے میرے علمی مشاغل میں ہمیشہ ہی اتنا زیادہ تعاون کیا ہے کہ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میرے سارے علمی و ادبی کاموں کے لئے ''کریڈٹ'' کے مستحق یہی ہیں۔

اب وہ ہستی کہ جن کی راہنمائی، بہترین مشوروں اور حوصلہ افزائی کی بدولت مقالہ نویسی کا یہ مرحلہ بخیر و خوبی انجام تک پہنچا، میرے نہایت مہربان و شفیق استاد گرامی **پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین** درحقیقت علم و دانش کا وہ آفتاب جہاں تاب ہیں جن کی کرنوں سے میں نے فکر کی روشنی مستعار لی۔ میری طرح بہت سے قطرہ ہائے بے مایہ کو گوہر کرنے والی ہستی کو دل کی گہرائیوں سے میرا اسلام عقیدت!

شکر گزار

لیاقت علی

باب اول

جموں و کشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش

جموں وکشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش

زبان دراصل آوازوں کے اس بامعنی مجموعے کا نام ہے جو انسان اپنے منہ سے ادا کرتا ہے اور اپنے احساسات و خیالات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ زبان کا آغاز کب اور کیسے ہوا اس سوال کے جواب کے لئے محققین نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق مختلف نظریات پیش کئے ہیں لیکن احساس یہ ہوتا ہے کہ زبان کا آغاز ابھی تک پردۂ تاریکی میں ہے، اور محض اس قدر ہی کہا جاتا ہے کہ انسان قوت گویائی اپنے ساتھ ہی اس دنیا میں لایا ہے۔ کیوں کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی کوئی بھی قدیم سے قدیم نسل، جس کا آج تک سراغ لگا ہے، ایسی نہیں جو بے زبان ہو۔ دنیا کے کسی خطے میں بھی کوئی ایسا تصور ممکن نہیں جس میں کوئی نہ کوئی زبان نہ بولی گئی ہو۔ لسانی اصطلاح میں اگر دیکھیں تو لفظ ''زبان'' بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے، ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

> ''زبان نہ کوئی فرد ایجاد کرسکتا ہے اور نہ اُسے فنا کیا جاسکتا ہے۔ مختلف تہذیبی عوامل، رنگا رنگ قدرتی عناصر، مسلسل میل جول اور رسوم معاشرت کھل مل کر رفتہ رفتہ صدیوں میں جا کر کسی زبان کے خدوخال اجاگر کرتے ہیں۔ اس لئے دنیا کی ہر زبان میں لسانی عمل اور ادب کی تخلیق کے درمیان وقت کا ایک طویل فاصلہ ہوتا ہے۔ بولی صدیوں میں جا کر زبان بنتی ہے۔ اپنی شکل بناتی ہے اور خدوخال اجاگر کرتی ہے'' ۔[1]

لسانی عمل اور ارتقاء ایک ایسی منزل پر پہنچتا ہے جب محسوس کرنے والا انسان، سوچنے والا ذہن اور اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے والا فرد اس زبان کو اپنی صلاحیتوں، جذبات، تجربات اور احساسات کے اظہار کی سہولت پاتا ہے تو اس زبان میں ادب کی تخلیق کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ مسلمان جب برعظیم پاک و ہند میں داخل ہوئے تو عربی، فارسی اور ترکی بولتے آئے اور جب اُن کا اقتدار قائم ہوا تو فارسی سرکاری زبان ٹھری۔ تاریخ گواہ ہے کہ حاکم قومیں اپنی زبان اور اپنا کلچر ساتھ لاتی ہیں اور محکوم قومیں جن کی تہذیبی و تخلیقی قوتیں مردہ ہو جاتی ہیں، اس زبان اور کلچر سے اپنی زندگی میں نئے معنی پیدا کر کے نئے شعور اور احساس کو جنم دیتی ہیں۔ یہ قول بھی صداقت پر مبنی ہے کہ ہر بڑی تہذیب اپنی وسعت اور گہرائی کے بموجب دوسری تہذیبوں پر اپنے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

ریاست جموں و کشمیر جسے عرف عام میں کشمیر کہتے ہیں کی سرحدیں چین، افغانستان، پاکستان سے ملتی ہیں۔ جموں و کشمیر کو ''ایشیا کا دل'' اور ''برصغیر کا تاج'' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی رشتوں کے اعتبار سے کشمیر سنٹرل ایشیا کا حصہ ہے اس لئے یہ ایشیا کی انگوٹھی کا نگینہ کہلاتا ہے۔

طبقات الارض کے ماہرین کے مطابق کروڑوں سال پہلے یہ علاقہ سمندر کے نیچے ڈوبا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ طبعی حالات کی تبدیلی کے باعث پہلے تو کوہ ہمالیہ کی چوٹیاں نمودار ہوئیں اور پھر دیگر گھاٹیاں اور وادیاں ظاہر ہوئیں۔ خشکی کا پہلا سرا جو ایک جزیرے کے صورت میں نمودار ہوا وہ کوہ سلیمان تھا۔ وادی کشمیر جھیل کی صورت اختیار کئے ہوئے تھی۔ اس جھیل کا پانی بارہ مولہ کے درے سے نکلتا گیا۔ پانی کے نکاس کے بعد وادی کشمیر وجود میں آئی۔ لفظ ''کشمیر'' کے متعلق مورخین کی بہت سی روایات موجود ہیں اور ان کا زیادہ ذکر قدیم تاریخ کشمیر ''راج ترنگنی'' مصنف پنڈت کلہن اور ''مکمل تاریخ کشمیر'' میں ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں جب وادی کشمیر ایک وسیع جھیل کی شکل میں بھی اس کا نام ''ستی سر'' تھا۔[۲] اس جھیل کے آس پاس پہاڑوں کی چوٹیوں پر مختصر سی وادی بھی تھی۔ اس جھیل سے ایک ''جلودبھو'' نامی آدم خور دیو نکل کر اس آبادی کے لوگوں کو بہت تنگ کرتا تھا۔ لوگ مدتوں اسکے ظلم کا شکار رہے۔

آخر کار کشپ رشی نامی ایک بزرگ یہاں وارد ہوئے۔لوگوں نے آدم خورد دیو کے ظلم کی فریاد کی۔کشپ رشی نے اس آدم خورد دیو کا خاتمہ کر کے مظلوم لوگوں کو نجات دلائی۔اس وسیع وعریض جھیل ''ستی سر'' کے پانی کی بارہ مولہ کے قریب پہاڑ کاٹ کر نکاسی کی۔جس سے یہ وادی معرض وجود میں آئی۔ یہ جگہ ''کشپ میر'' کہلائی۔[۳] جو بگڑتے بگڑتے کشمیر ہوگئی۔ پنڈت کلہن نے کشمیر کی قدیم تاریخ راج ترنگنی میں بھی اسی طرح بیان کی ہے۔[۴] ایک دوسری روایت کے مطابق کشپ کی محبوبہ کا نام میر تھا اس وجہ سے ان دونوں کے نام سے یہ جگہ کشپ میر کہلائی جو بعد میں کشمیر ہوگئی۔[۵] تیسری روایت یہ ہے کہ ۵۵۸ ق م میں بنی اسرائیل کے کچھ قبائل ہجرت کر کے افغانستان،گلگت اور کشمیر وغیرہ کے علاقہ میں آکر آباد ہوئے۔جو قبیلہ یہاں آکر آباد ہوا یہاں کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوا جس نے اس وادی کا نام ''کشمیر'' رکھا جو'ک' اور'اشیر' کا مرکب ہے۔'اشیر' عبرانی زبان میں شام کو کہتے ہیں۔سرسبز وشاداب اور خوبصورت ہونے کی بناء پر بنی اسرائیل کو یہ جگہ شام جیسی نظر آئی۔اس لئے انھوں نے اس کا نام 'کشیر' رکھا یعنی 'شام جیسی'۔اب بھی وادی کشمیر اور گلگت بلتستان میں اسے 'کشیر' کے نام ہی پکارا جاتا ہے[۶] چارلس ایلی سن بیٹسن نے اپنی مشہور کتاب A Gazetter of Kashmir میں لکھا ہے کہ برہمنوں کے خیال میں یہ نام 'کس' یا 'کش' نہ معنی روشنی اور'میر' بہ معنی سمندر کا مرکب ہے۔یعنی 'روشنی کا سمندر'[۷] مسلمانوں کی ایک روایت کے مطابق جھیل 'ستی سر' کو خشک کرنے کا کام حضرت سلیمان پیغمبر کے حکم پر 'کشف' نامی ایک جن نے یہ کام سرانجام دیا تھا۔اس وجہ سے اس وادی کا نام 'کشف میر' پڑ گیا جو بعد میں کشمیر ہوگیا[۸]

بعض نے اس روایت کو یوں بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت سلیمان جس پہاڑ کی چوٹی پر آکر ٹھرا۔آپ نے دیکھا کہ یہاں دور دور تک پانی نظر آرہا ہے۔آپ نے اندازہ کیا کہ اگر اس پانی کو خارج کیا جائے تو اس طرح خوبصورت وادی نکلے گی جہاں انسان آباد ہوسکیں گے۔حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں جنوں کا ایک 'کاش' نامی سردار موجود تھا۔اس نے اس شرط پر پانی خارج کرنے کی خدمت انجام دینے کی خواہش کا

اظہار کیا کہ لشکر میں موجود 'میر' نامی خوبصورت پری اس کے عقد میں دے دی جائے۔ حضرت سلیمان نے اس کی یہ شرط قبول کر تیب ہوئے پانی خارج کرنے کا حکم دیا۔ جن نے بارہ مولہ کے قریب پہاڑ کاٹ کر باقی خارج دیا اور 'میر' نامی خوبصورت پری کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس طرح وادی کا نام 'کاش میر' اور بعد میں کشمیر ہو گیا۔

ڈاکٹر محی الدین صوفی کے مطابق وادی کشمیر جو زمانہ قدیم میں 'ستی سر' جھیل کہلاتی تھی اس کا پانی خارج کر کے اس کا نام 'کاش میر' رکھا گیا۔ 'کا' سے مراد پانی 'سمرا' سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں سے ہوا کے ذریعے پانی نکال دیا گیا ہو۔ گویا 'کاش میرا' سے مراد ایسی جگہ ہے جس کا پانی خارج کر دیا گیا ہو۔ ایک توضیح یہ بھی کی جاتی ہے کہ ''کشمیر'' 'کس' اور 'میر' کا مرکب ہے 'کس' سے مراد نالہ اور 'میر' سے مراد پہاڑ ہے۔ اس طرح اس سے مراد پہاڑوں اور نالوں کا ملک ہے۔ بعض کا بیان ہے قدیم ہی سے اس کا نام 'کشمیر' تھا۔ 'کم' پانی کو کہتے ہیں اور اس میں سے 'ک' لیا گیا اور 'شمیر' باہر نکالنے کو۔ چونکہ اس کا پانی باہر نکالا گیا اس لئے اس کا نام کشمیر ہوا۔9 پنڈت کلہن کی بیان کردہ داستان کے حوالے سے بعد کے مورخین نے کشمیر کی وجہ تسمیہ کے بارے میں جو مختلف نظریات قائم کئے ان میں ایک یہ بھی ہے جس پر اکثر نے اتفاق کیا ہے کہ کشمیر دو الفاظ 'کشپ' اور 'مر' کا مرکب ہے۔ سنسکرت زبان میں 'مر' کے معنی آبادی یا پہاڑی دروں کے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ اگر ہندو 'رشی' بزرگ کا نام 'کشپ' شامل کر لیا جائے تو اس کا مطلب 'کشپ' کی آبادی نکلتا ہے۔ اس ضمن میں بے شمار توجیہات اور تشریحات ملتی ہیں لیکن چند روایات حسب ذیل ہیں۔ پنڈت کلہن کی رائے:

''زمانہ سابق میں ابتدائے کلپ سے لے کر وہ زمین جو ہمالہ کے دامن میں واقع ہے۔ ابتدائی چھ منو کے عہد میں پانی سے ڈھکی ہوئی تھی اور یہاں ستی سر نامی جھیل واقع تھی۔ اس کے بعد جب موجودہ ساتویں منو کا زمانہ آیا تو پرجاپتی کشپ نے برہما، وشنو اور شیو کی رہبری میں دیوتاؤں کی مدد حاصل کر کے جلود بھورا کھشش

کو جو اس جھیل میں رہتا تھا مروا ڈالا اور اس زمین کو جو جھیل کے باعث رکی ہوئی

تھی کشمیر کے نام سے آباد کیا۔''۹

سلیم خان گمی نے بھی پنڈت کلہن کے نظیرے کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ساری وادی پرانے زمانے میں ایک بڑی جھیل تھی اور کشمیریوں کے جنم داتا کشپ

رشی نے بارہ مولا کے قریب بند توڑ کر پانی کے نکل جانے کا راستہ بنایا اور اس طرح

کشپ رشی کے نام پر اس وادی کا نام کشپ میر یا کشمیر پڑ گیا۔''۱۰

مگر اس کے برعکس محمد دین فوق نے لفظ کشمیر کی وجہ یہ پیش کی ہے کہ:

''زبان شاستری میں 'کم' پانی کو اور شمیر باہر نکالنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ ستی سر کا پانی باہر

نکالا گیا تھا اس کا نام کمشیر قرار پایا جس سے اب کشمیر ہو گیا۔''۱۱

بقول محمد سعید اسعد:

''علوم ارضیات کے ماہرین کی تحقیق کے مطابق سرزمین کشمیر آج سے دس کروڑ

سال پہلے معرضِ وجود میں آئی۔ اس سے پہلے یہ علاقہ ایک وسیع و عریض سمندر کی

تہہ پر مشتمل تھا۔ طاقت ور آتش فشاں پھٹنے اور زیرِ زمین تبدیلیاں رونما ہونے

کے سبب لاکھوں سال کے مسلسل عمل سے اس سمندر کی تہہ سے پہاڑ ابھرنا شروع

ہوئے۔ ہمالیہ اور قراقرم کی چوٹیاں نمودار ہوتی گئیں اور پانی کناروں کی طرف

بکھرتا گیا حتیٰ کہ سمندر کی ساری تہہ سے پہاڑ ابھر کر منصۂ شہود آ گئے۔ قدرتی طور پر

وادیاں اور گھاٹیاں بنتی گئیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ یہ اولادِ آدم کا مسکن بن کر

فردوس بریں کہلائیں۔''۱۲

عباس احمد آزاد میجر رافیل کی رائے کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وادی کشمیر قدیم جغرافیائی عہد میں پوری جھیل میں ڈوبی ہوئی تھی اور سینہ بہ سینہ چلی آنے والی قدیم روایات اور تاریخی روایات اس کی تصدیق کرتی تھی کچھ اسی قسم کا نتیجہ ان لوگوں نے بھی اخذ کیا ہے جو یہاں سالہا سال رہے اور مظاہر قدرت کا مطالعہ کیا۔لہذا میں بھی (رافیل) اس نتیجہ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں کہ عہد ماضی میں یہ حسین خطہ موجود تھا بلکہ اس کی جگہ پانی کی ایک وسیع جھیل تھی۔''۱۳

بقول پریم ناتھ بزار:

''چنانچہ یہ بات امکان سے باہر نہیں ہے کہ کشمیر میں پہاڑوں کے پھٹنے اور اس کے نتیجے میں ایک عظیم سیلاب کے وقوع میں آنے کی وجہ سے ہی ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیبیں ناپید ہوگئیں ہوں۔''۱۴

چارلس لکھتے ہیں:

"according to others it is derived by the Brahmins from Kas "l ight" and Mira "sea"15

ان تمام روایات میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ تمام راویوں نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ کشمیر کی وادی زمانہ قدیم میں ایک وسیع و عریض جھیل تھی بعد میں مختلف وجوہات کے باعث یہ جھیل خشک ہوگئی اور وہاں انسانی زندگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ اس فلک بوس اور پرشکوہ عمارت میں پہلی منزل کا درجہ صوبہ جموں کو حاصل یہ صوبہ پنجاب کے میدانی علاقوں سے شروع ہوتا ہوا پیر پنجال کے فلک بوس اور برف پوش پہاڑوں تک پھیلا ہوا ہے۔یہی بلند پہاڑی حصہ جموں اور کشمیر کے لوگوں میں لسانی اور تہذیبی تفاوت کا باعث ہے۔

کسی بھی خطہ میں جنم لینے والی زبان، ثقافت اور ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے اس خطہ کے تاریخی مراحل کا مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ جموں وکشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش کے مطالعے کے ضمن میں بھی یہاں کے تاریخی تناظر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے سوتے وہاں کے سیاسی اور تہذیبی زندگی سے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ بقول محمد یوسف ٹینگ:

''اردو اور کشمیر کا رشتہ یوں تو رسمی طور پر سوسوا سو سال سے زیادہ پرانا نہیں ہے لیکن اردو جس تہذیبی لہر کی کوکھ میں پلی اور پنپی اور پھر جس کے شانے پر سوار ہو کر صفت جام پھری اس سے کشمیر کی انس وآشنائی صدیوں کے عرصے پر محیط ہے۔''۱۶

کشمیر کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے راج ترنگنی کے مصنف پنڈت کلہن کے مطابق کشمیر کا اولین بادشاہ گونندا اول تھا جس کا دور حکومت ۱۲۶۰ ق م ہے لیکن ہم اپنی بات کا آغاز ۱۳۰۰ء سے کرتے ہیں جو ریاست جموں و کشمیر میں اسلامی عہد کا تمہیدی دور ہے۔ ۱۳۰۰ء میں کشمیر پر سہادیو نامی راجہ کی حکومت تھی، سہادیو کا دور افراتفری، خلفشار اور لوٹ مار کا دور تھا۔ پنڈت پریم ناتھ اس عہد کی فتنہ انگیزیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب ۱۳۰۰ء میں سہدیو تخت نشیں ہوا اس وقت کشمیر پر شرابیوں، جواریوں اور عصمت باختہ عورتوں کی حکمرانی تھی (۱۸)۔ اس عہد میں ایک تاتاری سپہ سالار ذوالقدر خان دلچہ یا زلچو کشمیر پر حملہ آور ہوا راجہ کشمیر سہادیو نے دلچہ کا مقابلہ کرنے کی بجائے بھاگ جانے میں اپنی عافیت جانی بقول سلیم خان گمی:

''اس راجہ (سہادیو) کے عہد میں بدھ مت کے ایک پیروکار اور راجہ کرم سین کے تاتاری سپہ سالار زلچو نے زاجی لا (درہ) کے راستے کشمیر پر حملہ کیا اور کشمیر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ سہادیو اس ظالم کا مقابلہ کرتا مگر وہ زلچو کے حملے کے وقت کشتواڑ کی طرف بھاگ گیا''۔۱۷

کشمیر میں آٹھ ماہ کی لوٹ مار اور غارت گری کے بعد زلچو واپس جا رہا تھا کہ اپنے تمام لشکر سمیت برفانی تودوں تلے دب کر نیست و نابود ہو گیا۔ دلچہ کا حملہ اہل کشمیر کے لئے بڑی تباہی کا باعث رہا لیکن اس کا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اس غارت گری نے کشمیر میں اسلامی حکومت کے قیام کی راہ ہموار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز اور متعدد دیگر محققین کے مطابق ریاست جموں و کشمیر میں اسلامی حکومت کے قیام کے سلسلے میں بنیادی اور کلیدی کردار دو غیر ریاستی باشندوں رنچن اور شاہ میر نے ادا کیا۔ رنچن بودھ شہزادہ تھا جو لداخ کے راجہ وکتینہ (wictina) کا بیٹا تھا وہ ایک بغاوت میں اپنے باپ کے قتل کے بعد جان بچا کر کشمیر بھاگ آیا اس وقت کے راجہ سہادیو نے رنچن کو اپنے دربار میں پناہ دی اور کچھ جاگیر بھی عطا کی جبکہ شاہ میر سوات سے تعلق رکھنے والا باصلاحیت نوجوان تھا۔ وہ تلاش معاش میں کشمیر آ نکلا تھا۔ شاہ میر نے کشمیر آ کر راجہ سہادیو کے پاس وادی میں سکونت اختیار کرنے کی درخواست کی، راجہ اس کی شخصیت اور صلاحیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ سکونت اختیار کرنے کی اجازت کے ساتھ ساتھ رنچن کی طرح جاگیر سے بھی نوازا بدھ شہزادہ امور سلطنت چلانے کی سدھ بدھ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی قاہدانہ صلاحیتوں اور ملک میں افراتفری کی فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کشمیر کے امراء، وزرا اور تاجر طبقے میں خاصا رسوخ حاصل کر لیا تھا اس عوامی رسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے رنچن ایک منظّم اور باقاعدہ فوج کا قیام عمل میں لے آیا، دوسری طرف شاہ میر بھی ریاست میں اپنے ہمنواؤں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر چکا تھا۔ سہادیو کی پسپائی کے بعد اس کے سپہ سالار رام چندر نے حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن رنچن جواب تک مضبوط قوت بن چکا تھا۔ رام چندر کے راستے میں رکاوٹ بنا اور شاہ کی تائید و حمایت سے عنان ریاست سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ پریم ناتھ بزاز لکھتے ہیں:

> ''سہدیو کے وزیر اعظم اور سپہ سالار رام چندر نے اس کاروائی کی مخالفت کی مگر اس کو
> سیاسی افراد کی اعانت حاصل نہ ہو سکی اور اسے بھاگ کر لار پرگنہ کے قلعے میں جا کر

> پناہ لینی پڑی بہت جلد رنچن نے بڑی چال بازی سے رام چندر کو شکست دی اور ایک معرکہ میں قلعے کے باہر موت کے گھاٹ اتار دیا کشمیر کو ایک طاقتور اور قابل ترین حکمران کی ضرورت تھی جو اسے جلاوطن بدھ کی صرت میں مل گیا۔‘‘ ۱۸؎

رنچن ۱۳۲۰ء میں کشمیر کا حکمران بناء عنان حکومت سنبھالتے ہی ملک میں سیاسی استحکام اور معاشی خوشحالی کا دور لوٹ آیا۔ رنچن شروع ہی سے اپنے بدھ مت سے بیزار اور حق وصداقت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ حسنِ اتفاق سے رنچن کی ملاقات ترکستان سے تشریف لانے والی ایک روحانی شخصیت حضرت بُلبل شاہ سے ہوگئی۔ اس ملاقات نے رنچن کے دل کی دنیا بدل دی اور وہ مسلمان ہوگیا اور رنچن کے بجائے صدرالدین نام رکھا۔ رنچن کے قبول اسلام کا ذکر پریم ناتھ بزار نے یوں کیا ہے:

> ’’کسی نئے مذہب کی جستجو کا جذبہ شوق اس کو بُلبل شاہ کے پاس جو ترکستان سے نئے نئے وارد ہوئے تھے کشاں کشاں لے گیا۔ اس مرد درویش کی دل نشیں تعلیم و تدریس نے رنچن کے دل کو بے حبدب متاثرب کیا اورب وہ فوراً مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ صدرالدین نے تین سال تک کشمیر میں کامیاب حکومت کے بعد ۱۹۲۳ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ صدرالدین کی وفات کے فوراً بعد کشمیر میں پھر سے افراتفری اور انتشار نے سر اُٹھایا اور اقتدار ایک بار پھر ہندو سہادیو خاندان کے پاس چلا گیا۔ سہادیو کا ایک بھائی ادیان دیو جو دلچہ کے حملے کے دوران میں گندھار کی طرف بھاگ گیا تھا دوبارہ ریاست آپہنچا اور حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اس نے ب ۱۵ برس تک کشمیر پر حکومت کی یہ دور بھی ایک تاریک دور تھا۔ ادیان دیو ۳۹، ۱۳۳۸ء میں انتقال کر گیا۔‘‘ ۱۹؎

ادیان دیوی کی وفات کے بعد کشمیر کی بادشاہت کا ہما شاہ میر سواتی کے سر پر بیٹھا شاہ میر اب تک کشمیر کی ہر دلعزیز شخصیت کا روپ دھار گیا تھا۔ چنانچہ اسے حصول اقتدار میں زیادہ مشکل کا سامنا کرنا پڑا یوں ۱۳۳۹ء میں ۱۵ سال کے تعطل کے بعد کشمیر میں پھر سے اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی۔ شاہ میر سواتی سے کشمیر میں شہمیری خاندان کی حکومت کی بنیاد پڑی۔ اس خاندان کے اکیس بادشاہوں نے کم وبیش ۲۲۱ برس تک کشمیر میں حکمرانی کی۔

شاہ میری خاندان کے تین بادشاہون کا زمانہ کشمیر کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے ان میں سکندر بت شکن دوسرے شہاب الدین اور تیسرے زین العابدین (بڈ شاہ) ہیں۔ سکندر شاہ جیسا کہ ان کے نام ساتھ 'بت شکن' کے خطاب سے ظاہر ہے ایک بنیاد پرست مسلمان تھے۔ انھوں نے اسلام کی بالادستی کے لئے بڑی سعی کی اور بت شکنی کا شعار اختیار کیا اس کوشش میں البتہ بعض اوقات ان سے تشدد بھی ہوا۔ اس عہد کے متعلق ایک انگریز تاریخ نگار پیٹرس جیروس نے لکھا ہے کہ ملک میں شراب پینے، جوا کھیلنے بلکہ موسیقی تک کی ممانعت تھی۔ ہندو اس سے چھٹکار کی دعائیں مانگتے رہے لیکن اس نے پورے تیس سال تک حکومت کی۔

سلطان شہاب الدین نے داخلی استحکام کے ساتھ ساتھ کچھ فتوحات بھی کیہ ہیں اس نے کشمیر کی سرحدوں کو وسعت دیتے ہوئے افغانستان اور تبت کے علاقے فتح کیے۔ تاہم اس خاندان کے سب سے عظیم المرتبت بادشاہ سلطان زین العابدین ہیں جنھیں آج بھی اہل کشمیر عقیدت سے بڈ شاہ (بڑا بادشاہ) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ لقب از خود زین العابدین کی عظمت اور کارناموں پر دلالت کرتا ہے۔ یہ معتدل مزاج بادشاہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں میں بھی ہر دلعزیز تھے۔ زین العابدین کے دور تک ملک کی سرکاری زبان سنسکرت تھی۔ زین العابدین نے کشمیر میں فارسی رسم الخط کو رواج دیا۔ وہ فنون لطیفہ اور ادب کے مریض تھے۔ ان کے دربار میں ادیب شاعر موسیقار اور گویے موجود رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر دور دراز سے زین العابدین کی شہرت سن کر حاضر ہوتے تھے۔ اس دور میں نہ صرف علم وادب کو فروغ حاصل ہوا بلکہ زین العابدین نے کشمیر میں کاغذ سازی، ریشم سازی اور شالبانی کی

صنعت کو بھی خوب فروغ دیا۔

زین العابدین شاہ میری خاندان کے آخری قابل ذکر بادشاہ تھے ان کے بعد کشمیر میں طوائف الملو کی کا دور شروع ہو گیا اور حکومت پر اس خاندان کی گرفت روز بروز کمزور ہوتی گئی اور بالآ کر کشمیر کی عنان حکومت چک خاندان کے ہاتھ آ گئی۔ چک خاندان کے پس منظر کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہیں البتہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ غیر ریاستی تھے شہمیری خاندان سے کچھ مراسم رکھتے تھے اور شمال کی طرف سے کشمیر پر حملہ آور ہو کر آئے تھے ان کا دور حکومت ۵۵-۱۵۵۴ء سے ۱۵۷۶ء پر مشتمل ہے۔

چک حکمران دلیر، بے باک اور قومی ہیکل تھے لیکن ظلم وستم ان کا شعار تھا وہ رعایا پروری اور ملک کی تعمیر وترقی کی بجائے فرقہ پرستی کے دلدادہ تھے چنانچہ اس عہد میں سارا ملک فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ چک حکمرانوں میں یوسف شاہ چک علم وادب کا دلدادہ تھا اور خود بھی فارسی شعر کہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندی زبان میں بھی شعر کہتا تھا لیکن اس کا ہندی کلام دستیاب نہیں۔ چک حکمرانوں کے ناروا سلوک سے تنگ آ کر رعایا کی اکثریت احتجاج اور بغاوت پر اتر آئی۔ ستائے ہوئے مسلمانوں کا ایک وفد مغل حکمران اکبر کے دربار پہنچا اور اہل کشمیر پو ہونے والے جبر وتشدد کی داستان سنا کر وہاں مداخلت کرنے کی درخواست کی۔ اکبر اعظم پہلے ہی کشمیر کو فتح کرنے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا اس نے پوقع غنیمت جانا اور کشمیر پر لشکر کا حکم دیا۔ شدید موسم اور یعقوب شاہ کی مدافعت کے باعث لشکر تیموریہ کو ایک بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن بالآخر ۱۵۵۸ء میں مغلوں نے کشمیر فتح کر کے اسے ریاست کو سلطنت تیموریہ کا حصہ بنا دیا۔

دور حکومت ۱۵۷۶ء سے ۱۷۵۲ء تک ۱۶۶ برس سے زیادہ عرصہ تک کشمیر مغل صوبیداروں کے زیر انتظام رہا۔ اس عہد کا ایک خوش آئند پہلو یہ تھا کہ مغل بادشاہ چونکہ حسن فطرت کے دلدادہ اور رنگین مزاج تھے اور کشمیر میں ان کے ذوق کی تسکین کے لئے ہر طرح کا سامان موجود تھا اس لئے مغل حکمران خصوصاً اکبر، جہانگیر، اور شاہجہان وغیرہ

کثرت سے کشمیر آتے اور یہاں کی سیر وسیاحت سے اپنے ذوق کو تسکین بہم پہنچاتے۔انہوں نے کشمیر کے حسن کو نکھارنے اور سنوارنے کے لئے کئی ایک باغ بنوئے اور عالیشان عمارتیں تعمیر کروائیں جو آج بھی اس عہد کی یادیں اپنے سینے میں سمائے سرزمین کشمیر میں موجود ہیں۔

مغلوں کی علم پروری بھی مشہور ہے۔مغل بادشاہ جب کشمیر آتے اپنے ہمراہ شعرا، ادیبوں اور موسیقاروں کی فوج بھی لاتے۔دربار میں شعری مجلس ہوتیں اور شعرا انعام واکرام پاتے۔یوں کشمیر میں علم وادب اور شاعری کی جو روایت شہمیری خاندان کے دور اقتدار میں پری تھی فروغ پاتی اور پروان چڑھتی گئی۔مغل صوبیداروں کی کوتاہ اندیشیوں کے باعث کشمیر پر روز ان کی گرفت کمزور ہوتی گئی اور وہ باہمی خلفشار کا شکار ہوتے گئے۔مغلیہ صوبیداروں اور سرداروں کی داخلی نزاع اور کمزوری سے فاعدہ اٹھاتے ہوئے احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۲ء میں کشمیر فتح کرلیا اور یوں کشمیر سلطنتِ افغانیہ کے زیرِ نگیں ہوگیا۔افغان ناظم ظالم اور سفاک تھے انھوں نے اہل کشمیر اور بالخصوص غیر مسلموں اور شیعوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیئے ان کا بنیادی مقصد مال ومتاع جمع کرنا اور کشمیر کی دولت لوٹنا تھا۔اس دور کی جفا کاریوں کا تذکرہ پریم ناتھ بزار نے یوں کیا ہے:

> ''افغان صوبیدار اکثر کندہ ناتراش، اکھڑ اور متعصب ہوتے تھے۔۔۔۔سنسکرت پڑھنا اور پوجا پاٹ کے ندوطریقوں کو حکماً بند کردیا۔افغان عہد کے بیشتر حصہ میں نہ صرف ہندو عورتیں بلکہ تمام کشمیری عورتیں کہیں بلا کھٹکے آجا نہیں سکتی تھیں کیونکہ ایک افغان جب چاہتا کسی حسین دوشیزہ پر ہاتھ ڈال کر اسے حرم میں داخل کرسکتا تھا۔ان افغان حاکموں نے کئی ایک کشمیری مرد وزن پکڑ کر غلام بنائے اور پھر تحفتاً اپنے آقاؤں دوستوں اور عزیز واقارب کے پاس کابل بھیج دیا۔'' ۲۰

۶۷ برس تک افغان نے کشمیر پر حکومت کی اور پھر اپنے پیشرو چکوں اور مغلوں کی طرح داخلی انتشار کا شکار ہو

کر پردے سے اوجھل ہو گئے۔ افغانوں کے دور کے ساتھ ہی کشمیر سے اسلامی حکومت کا سورج غروب ہو گیا اور قہر و رویش بر جان درویش کے مصداق گردش آسمان نے کشمیر پر سکھوں کو مسلط کر دیا۔

رنجیت سنگھ پہلے ہی کشمیر فتح کرنے کے لئے کوشاں اور بے تاب تھا مغلوں کی طرح رنجیت سنگھ کو بھی اپنے پہلے حملے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا لیکن ۱۸۱۹ء میں دوسرے حملے کے دوران اس نے کشمیر فتح کر لیا۔ سکھوں کے عہد میں دس صوبیداروں نے کشمیر پر حکومت کی جن میں پانچ ہندو، تین سکھ اور دو مسلمان تھے۔

یہ تمام حکمران بلا استثناء ظالم اور سفاک تھے ان کا دور ظلم و ستم میں افغانوں سے بھی بدتر شمار کیا جاتا ہے۔ کشمیر میں سکھ راج اور ظلم اپنے عروج پر تھا کہ ہندوستان میں ایک انقلابی نوعیت کی تبدیلی آئی اور جموں و کشمیر بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جانشینوں کو انگریزیوں کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سکھوں کی شکست کے بعد کشمیر از خود انگریزوں کی عملداری میں شامل ہو گی۔ اس جنگ کے دوران میں جموں کے راجہ گلاب سنگھ جو ڈوگرہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا سکھوں کے ساتھ غداری کے ارتکاب کے باعث انگریزوں کا منظور نظر تھا۔ سکھ عہد کے اختتام پر انگریزوں نے ریاست جموں و کشمیر کو پوری کشمیری قوم (دہقان وکشت وخیاباں و جوئبار) سمیت ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو ۷۵ لاکھ نانک شاہی سکھوں، ایک گھوڑے، بارہ بکریوں اور شالوں کے چھ جوڑوں کے سالانہ خراج کے عوض معاہدہ امرتسر کی رو سے مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے نرینہ جانشینوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ معاہدہ امرتسر کے نتیجے میں ۱۸۴۶ء سے جموں و کشمیر میں ڈوگرہ عہد کا آغاز ہوا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کی بربریت کے قصے آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں۔ پونچھ کے باشندے خاص طور پر اس کے عتاب کا شکار ہوئے کیونکہ اس خطہ کے جرات مند لوگوں نے مہاراجہ کے ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور بغاوت کا آغاز کیا۔

۱۸۵۸ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رنبیر سنگھ تخت نشیں ہوا۔ رنبیر سنگھ کا رویہ ابتدا میں کچھ نرم رہا لیکن آہستہ آہستہ وہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ رنبیر سنگھ کی وفات کے بعد ۱۸۸۵ء میں اس کا بیٹا

پرتاب سنگھ مسند اقتدار پر بیٹھا۔ پرتاب سنگھ کے دور میں کشمیر میں خاصی بیداری شروع ہوگئی تھی۔اس وقت تک بہت سے کشمیری بالخصوص (پنڈت) ہندوستان کے مختلف حصوں میں تعلیم حاصل کر کے واپس کشمیر آ چکے تھے پھر ہندوستان بھر میں بھی سیاسی بیداری کی لہر چل پڑی تھی۔اس وقت تک بہت سے کشمیری بالخصوص (پنڈت) ہندوستان کے مختلف حصوں میں تعلیم حاصل کر کے واپس کشمیر آ چکے تھے پھر ہندوستان بھر میں بھی سیاسی بیداری کی لہر پڑی تھی۔ ہندوستان کی سیاسی بیداری کی لہروں نے کشمیر کو بھی متاثر کیا۔(یہ دور کشمیر میں اردو زبان کی آمد اور پرورش کا دور ثابت ہوا اس کا ذکر آگے آئے گا) ۱۹۲۵ء میں پرتاب سنگھ کا بھتیجا ہری سنگھ تخت نشین ہوا اس دور میں کشمیر کی جدوجہد آزادی نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔کشمیر میں یہی کشمکش جاری تھی کہ ۱۹۴۷ء میں کشمیر میں ڈوگرہ عہد کا خاتمہ ہو گیا۔

جموں وکشمیر کے ایک طائرانہ تاریخی پس منظر اور تاریخ ولسانیات پر لکھی گئی کتابوں سے یہ واضح شواہد ملتے ہیں کہ شہمیری خاندان کی حکومت کے قیام سے قبل اور کچھ بعد تک سنسکرت زبان کا چلن تھا۔قدیم کشمیر کا تمام تر علمی و ادبی اور مذہبی سرمایہ سنسکرت زبان ہی میں ملتا ہے۔سنسکرت لکھنے کے لئے شاردارسم الخط تھا۔پروفیسر عبدالقادر سروری کا بیان ہے:

''اس زمانے میں سنسکرت لکھنے کے لئے کھروشٹھی اور برہمی رسم الخط استعمال ہوتا تھا لیکن کشمیری علماء نے ایک نیا رسم الخط نشو ونما دیا تھا جو شاردا کہلاتا ہے اور کشمیر کی سنسکرت کتابیں اس رسم الخط میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔'' [۲۱]

اس سلسلے میں کوئی حتمی دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ کشمیر میں سنسکرت کا چلن کب اور کیسے ہوا لیکن محققین اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ کشمیر کا اس زبان کے ساتھ دیرینہ اور گہرا تعلق ہے اس ضمن میں ڈاکٹر شری ناتھ تیکو شاستری کی رائے ملاحظہ فرمائیں جو عبدالاحد آزاد نے اپنی کتاب کشمیری زبان اور شاعری میں نقل کی ہے:

''کشمیر میں بنی نوع انسان کی بودوباش آج سے چھ ہزار سال سے پہلے شروع ہوئی

جب سیلاب کے بعد کشپ رشی کی کوششوں سے یہاں انسان نے رہنا شروع کیا
اس زمانے میں یہاں کے لوگوں کی زبان سنسکرت تھی، مہابھارت کے زمانے میں
یہاں کے لوگوں کی زبان سنسکرت تھی۔مہابھارت کے زمانے میں ہندوستان میں
مختلف زبانیں پھیلی ہوئی تھیں۔کشمیر میں بھی مروج سنسکرت زبان تغیر پذیر ہونے لگی
تھی اور کشمیری زبان کی کسی بگڑی ہوئی صورت کو استعمال کرنے لگےاس کے باوجود
مہذب لوگوں میں زیادہ تر سنسکرت ہی کا رواج تھا۔'' ۲۲

کشمیر کا تمام تر سرکاری اور درباری نظام سنسکرت میں چلتا تھا عام خط وکتابت کی زبان بھی سنسکرت تھی حتیٰ کہ مسلمانوں کی قبروں کے کتبے بھی سنسکرت میں لکھے جاتے تھے۔سری نگر اور اس کے نواح میں بہت سی قبریں ملی ہیں جن کے کتبے شاردارسم الخط میں کنندہ ہیں۔

ریاست میں سنسکرت زنان کے گہرے رسوخ کا اندازہ اس امر سے بھی بخوبی ہوتا ہے کہ کشمیر میں ہندو اور بدھ دور کے علاوہ شاہمیری خاندان کے پہلے سلاطین کی حکومت میں بھی درباری زبان سنسکرت تھی۔لیکن اس قدر اہمیت کے باوجود بھی ریاست میں اسے عام بول چال کی زبان کا درجہ حاصل نہیں ہوسکا۔اس دور میں کشمیر میں عام بول چال کی زبان پراکرت تھی یہ مختلف بولیوں کے الفاظ کا مجموعہ تھی جو تغیر وتبدل کے کئی مراحل طے کرتے ہوئے کشمیری کی صورت اختیار کرگئی۔جہانگیر نے بھی کشمیر کے واقعات میں سنسکرت زبان کے چلن کا ذکر کیا ہے:

''برہمن لوگ بھی جو اس ملک کے قدیم باشندے ہیں یہاں موجود ہیں یہ عام
کشمیری زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور ظاہر وضع واطوار میں مسلمانوں سے مختلف
نہیں معلوم ہوتے لیکن ان کی کتابیں سنسکرت میں ہیں۔سنسکرت پڑھتے ہیں اور
بت پرستی کی تمام رسوم بجالاتے ہیں جیسا کہ ہند کے دانشور سنسکرت زبان میں اپنی

تصانیف لکھتے ہیں۔" ۲۳

یوسف بخاری لکھتے ہیں:

"سنسکرت کو چونکہ اعلیٰ طبقے کی سرپرستی حاصل تھی نیز برہمنوں نے اس کو تقدس کا درجہ دیا تھا اس لئے اس نے مذہبی، علمی اور ادبی زبان کا درجہ حاصل کرلیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے مختلف ادوار کے نمونے، مذہبی، علمی دلائل اور کلاسیکی ادب کی صورت میں میسر ہیں۔ ۲۴

یوں تو کشمیر میں بدھ مذہب کی تعلیمات علم عروض، قواعد، شعریات، شاعری اور ناٹک پر سیکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں لیکن ان تمام تصانیف میں جو اہمیت اور شہرت پنڈت کلہن کی 'راج ترنگنی' کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسری تصنیف کے حصہ میں نہیں آئی اس حوالے سے پروفیسر عبدالقادر سروری کی رائے پیش کرنا قرین قیاس ہے۔ آپ رقمطراز ہیں:

"سنسکرت میں لکھے ہوئے تاریخی کارناموں میں کشمیر کا کوئی کارنامہ پنڈت کلہن کی یادگار تصنیف کو نہیں پہنچ سکتا اس کی تعریف میں ساری علمی دنیا رطب اللسان ہے۔ کلہن نے اس یادگار کارنامے کی تکمیل ۴۹، ۱۱۴۸ء میں کی۔ بعض مصنفین نے قدیم عہد کے کارناموں میں اسے واحد تاریخی کتاب بتایا ہے۔" ۲۵

راج ترنگنی کشمیری تاریخ کا قدیم اور مستند ماخذ ہے جس میں کلہن نے ابتداء سے بارہویں صدی کے وسط تک کشمیر کے تمام حکمرانوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر سلطان زین العابدین کے حکم سے ملا احمد 'بحرالاسمار' کے نام سے فارسی ترجمہ کیا بعد میں اکبر کی خواہش پر ملا احمد بدایونی نے بھی راج ترنگنی کا فارسی ترجمہ کیا۔ سلطان زین العابدین نے اپنے دور میں دارالترجمہ قائم کیا جس میں نہ صرف سنسکرت کی کتابوں کا

فارسی ترجمہ کیا جاتا تھا بلکہ سنسکرت کی کتابیں تصنیف بھی ہوتی تھیں۔ جون راج بدشاہ کے دور میں سنسکرت کا مشہور شاعراور عالم گزارہے جس نے راج ترنگنی کے تاریخی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے جے سیما سے لے کر کوٹارانی کے عہد تک کے واقعات کا اضافہ کیا۔ جون راج کے شاگرد شری ور نے اس سلسلہ کو ۱۴۸۶ءتک جبکہ بعد میں پراجیہ بھٹ نے ۱۴۱۳۔۱۵۱۳ءتک کے واقعات قلمبند کیئے آخر میں پراچیہ بھٹ کے شاگرد وشک نے اس تاریخی تسلسل کو کشمیر میں مغلیہ اقتدار تک پہنچایا۔

شاہمیری خاندان کی اسلامی حکومت کے قائم ہوتے ہی کشمیر میں فارسی زبان اپنی جڑیں مضبوط کرنے لگی تھی۔لیکن ابتدائی دور کے سلاطین کی درباری زبان سنسکرت ہی تھی۔ شاہمیری خاندان کی حکومت کے استحکام کے ساتھ ساتھ ہی سنسکرت مائل بہ زوال ہونے لگی حتی کہ سکھوں کے عہد کے آغاز کے ساتھ ہی زوال آمادہ سنسکرت بے نشان ہونے لگی۔سنسکرت کے ریاست بدر ہونے کی دلیل پروفیسر عبدالقادر سروری نے کچھ یوں بیان کی ہے:

''سکھوں کے عہد میں کشمیر نمایاں اہمیت رکھنے والے سنسکرت علماء کا پتہ نہیں چلتا یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ پچھلے سیکڑوں برس سے سنسکرت علم وادب کا ذوق جو کشمیر میں پرورش پا رہا تھا وہ یک لخت ختم ہو گیا تاہم ان حکمرانوں کو تھوڑا سا عرصہ جو کشمیر میں تسلط کا ملا وہ رنجیت سنگھ کے زمانے سے قطع نظر زیادہ تر مسلم آبادی کو بے دست وپا کرنے اور اپنے قابو میں رکھنے میں صرف ہوا۔اس کے علاوہ سکھوں میں علم وادب کی روایات ابھی نشوونما نہیں پا سکی تھیں کہ ان کا دور ختم ہو گیا اور سنسکرت علماء ہمت افزائی اور سرپرستی کے نہ ہونے کی وجہ سے کسمپرسی میں پڑے رہے اس لئے اس دور میں کسی سنسکرت عالم کے منظر عام پر آنے کی شہادت نہیں ملتی۔''۲۶

اس تفصیل کی روشنی میں کشمیر میں سنسکرت کے زوال کے دو اہم سبب ہمارے سامنے آتے ہیں۔اول شہمیری

سلاطین کے عہد میں فارسی کی قدر دانی جس کے باعث عالم لوگوں اور سنسکرت کے علماء کی دلچسپی سنسکرت سے کم ہوتی گئی اور دوم سکھوں کی علم وادب میں کورذوقی وعلماء سنسکرت کی حوصلہ شکنی ،لیکن سنسکرت کے زوال کے سب سے اہم وجہ خود اس زبان سے متعلق وہ تصورات ہیں جو اس زبان کی نشو ونما اور پھلنے پھولنے میں بڑی رکاوٹ بنتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف بخاری کے بقول:

''سنسکرت کی دو قسمیں تھیں ایک ویدک سنسکرت اور دوسری ادبی سنسکرت۔ ویدک سنسکرت وہی ہے جس میں ویدوں کے منتر لکھے گئے ہیں اور قدیم زمانے کے آریاؤں کی عام بول چال کی زبان کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ دوسری ادبی سنسکرت ہے ۔آہستہ آہستہ ادبی سنسکرت نے اپنے آپ کو خاص حدود میں بند کر دیا اور اس کے تقدس کا خاص خیال رکھا جانے لگا۔ اسے دیوتاؤں کی زبان کہا گیا اس طرح اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا داخلہ سختی سے بند کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ عوام کی امنگوں کی زبان ہونے سے رہ گئی اور ایک اجنبی زبان بن گئی۔'' ۲۷

یہی فاضل مصنف ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''اگر یہ صرف برہمنوں تک محدود نہ رہتی اور اپنے دامن لغات پر جدید الفاظ کو بدنما داغ نہ سمجھتی تو آج اس کو اس طرح فنا نہ ہونا پڑتا اور آج جو زبانیں ہندوستان کے طول وعرض میں رائج ہیں، بہت ممکن ہے کہ ان زبانوں کا نام سنسکرت ہوتا۔'' ۲۸

بہر حال عروج کے بعد زوال کا آنا ایک فطری اور لازمی امر ہے سنسکرت جو مدتوں کشمیر کے علمی اور تہذیبی زندگی پر راج کرتی رہی ایک وقت میں اسی فطری قانون کے ہاتھوں روبہ زوال ہوگئی اور آج برصغیر میں طرح کشمیر میں بھی سنسکرت زبان وادب ایک قیصہ پارینہ ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ محسوس کئے جا سکتے ہیں لیکن محققین کا اندازہ ہے کہ اسلامی عہد سے قبل بھی ریاست کشمیر میں محدود حد تک فارسی کا عمل دخل ضرور تھا۔ ڈاکٹر صابر آفاقی اپنی کتاب 'عکس کشمیر' میں فارسی کے اثر ونفوذ کی کھوج لگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پنڈت کلہن نے راج ترنگنی (مولفہ ۱۱۴۹ء) میں دو یرا اور گنجور جیسے فارسی الفاظ برتے ہیں جو فارسی زبان کے نفوذ کا پتہ دیتے ہیں۔''۲۹

پریم ناتھ بزاز لکھتے ہیں:

''مسلم حکومت کے ظہور کیساتھ فارسی جو کہ عباسیہ عہد کے اسلامی تمدن کی زبان تھی۔ وادی میں بھی متعارف ہوئی اور جلد ہی سنسکرت سے آنکھیں ملانے کے قابل ہوگئی۔ حتیٰ کہ مغلوں نے جب اسے درباری زبان بنالیا تو اس کے سامنے سنسکرت کا چراغ گل ہوگیا، نہ صرف مسلمان بلکہ ہندوؤں نے بھی فارسی پڑھنا شروع کر دی اور وقت گزرنے پر اس ملک نے فارسی کے بڑے بڑے مقامی ارباب علم و دانش اور مصنف پیدا کیئے۔''۳۰

۱۳۷۲ء کے سال کو اسلامی عہد کے کشمیر میں خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس سال ایک ایسی روحانی اور علمی شخصیت کشمیر تشریف لائے جنھوں نے کشمیر کے مذہبی، سماجی، تہذیبی اور لسانی تاریخ پر انقلابی نشان چھوڑے آپ سید علی شاہ ہمدان تھے جو تبلیغ اسلام کی غرض سے کشمیر تشریف لائے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کا خیال ہے کہ:

''شاہمیری عہد میں ایران و ترکستان سے آنے والے سینکڑوں علماء وصوفیاء کی بدولت کشمیر میں مکمل فکری وتہذیبی انقلاب رونما ہوگیا۔ ان علماء میں سید علی ہمدانی قابل ذکر ہیں۔ مسلمان نیا تمدن اور نئی معاشرت ساتھ لائے۔ اخلاق، آداب،

ادب وفنون یہاں تک کہ نیا لباس، نیا سامان، آرائش، نئے کھانے اور نئی صنعتیں اپنا لی گئیں۔''۱۳؎

امیر کبیر حضرت شاہ ہمدان بلند پایہ عالم دین اور مصنف تھے۔ فارسی میں ان کے لکھے ہوئے رسالوں کی تعداد کم از کم بیس ہے جن میں معرفت زہد، چہل حدیث، کشف الحقائق اور رسالہ مکتوبات قابل ذکر ہیں۔ شاہ ہمدان کے ساتھ ساتھ ایران سے سات سو سادات اور علماء بھی کشمیر تشریف لائے آپ کی پراثر تبلیغ سے نہ صرف اہل کشمیر جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے بلکہ اس عمل میں وہ فارسی زبان کی شیرینی اور لمس کو بھی خوب محسوس کرتے رہے اس پر طرہ یہ کہ کشمیری سلاطین خود بھی فارسی کے قدردان اور علم وادب کے رسیا تھے شعر وسخن کا اچھا مذاق رکھتے تھے انہوں نے عربی اور فارسی کی ترویج کے لئے کئی ایک مکتب اور درسگاہیں قائم کیں۔ سلطان قطب الدین نے سری نگر میں ایک ایسی درسگاہ قائم کی جہاں اساتذہ اور طلبہ کو اقامتی سہولتیں میسر تھیں۔ اس درسگاہ میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی علام کی تدریس بھی کی جانے لگی پھر سلطان زین العابدین نے اپنے عہد میں نوشہرہ کے مقام پر ایک یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جس میں اسلامیات، دینیات، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ طب اور تعمیرات کے علوم کا درس دیا جاتا تھا۔ ملا کبیر نحوی اس دارالعلوم کے مہتمم تھے دارالعلوم کے ساتھ ایک دارالترجمہ قائم تھا جس میں سنسکرت اور عربی کتابوں کو فارسی میں ترجمہ کرایا جاتا تھا اس شعبہ کی نگرانی ملا احمد کشمیری اور پنڈت دانش کے سپرد تھی۔ ملا احمد کشمیری کی گوناگوں صلاحیتوں کا ذکر اکثر کتابون میں کیا گیا ہے۔ مشہور کشمیری مصنف محمد الدین فوق ملا احمد کی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بڈشاہی دربار کے ملک الشعراء ملا احمد کی قوت استدلال، لطافت، مطبع، قادرالکلامی اور بدیہہ گوئی کا تمام مورخین نے اعتراف کیا ہے۔ دربار شاہی کے علمی مباحثوں میں جو ادباء اور شعراء حصہ لیتے تھے ملا احمد ان سب کا سرتاج تھا۔ تاریخ

وقائع کشمیر اور مہا بھارت اس کی یادگار ہیں۔ ایک دن بزم آراستہ تھی سلطان زین العابدین بڈشاہ تخت پر جلوہ افروز تھا ملا احمد استاد کا شملہ پیشانی پر شاخ دار لٹکا کر جھومتے جھامتے بلکہ ہانپتے کانپتے دربار میں آئے۔ بادشاہ نے مسکرا کر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

؎ شاخ پیشانی ملا احمد کشمیر بہ بین
گر نہ دیدستی تو در آفاق انساں شاخوار

بادشاہ مذاق صحیح اور طبع سلیم رکھتا تھا اس کے درباری مصاحب اور شعراء بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ملا احمد تو ملک الشعراء ہی تھا فوراً بول اٹھا:

؎ شاخ پیشانی خدیوا گرگ واری داشتم
تانیایم درمیان مادہ گاواں درشماد۲۴''۳۳

جواب کی برجستگی ملک الشعرا کے ذہن رسا کا پتہ دے رہی ہے۔

بڈشاہ کے دارالترجمہ میں دیگر علماء میں سید امین منطقی، ملا احمد رومی، ملا نورالدین، ملا علی شیرازی، ملا نادری، مولانا حسین غزنوی وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔ جن کی کوشش کے باعث کشمیر میں فارسی کے فروغ کے اسباب روشن ہونے لگے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ کشمیر میں فارسی کو صرف مسلمانوں نے ہی گلے نہیں لگایا بلکہ ہندو پنڈت بھی اس زبان کو اپنانے اور اسے فروغ دینے میں پیش پیش رہے۔ ہندوؤں کو فارسی کی طرف راغب کرنے کا سہرا بھی زین العابدین بڈشاہ ہی کے سر جاتا ہے۔ جنھوں نے کشمیری پنڈتوں کو اس کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ محمد اللہ قریشی اپنے مضموں ''کشمیر میں فارسی شاعری'' میں بڈشاہ کے ان اقدامات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''بڈشاہ نے کشمیری پنڈتوں کو بھی ترغیب دی کہ وہ فارسی زبان سیکھ کر حکومت کے عہدے سنبھالیں۔اس گروہ میں جس نے سب سے پہلے فارسی زبان کی طرف توجہ کی وہ سپرو کہلایا۔سپرو کشمیر میں اس شخص کو کہتے ہیں جس نے سب کچھ پڑھ لیا ہو یا پڑھنے میں سبقت لی ہو۔علامہ اقبال کا خاندان سپرو پنڈتوں سے تعلق رکھتا ہے ۔۔۔کشمیری پنڈت کثیر تعداد میں شہمیری سلاطین، چک بادشاہوں، مغل اور افغان حاکموں، سکھ اور ڈوگرہ راج میں حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر ہمیشہ فائز رہے۔مجلسی زندگی میں بھی ان کا وقار بلند رہا اور وہ فارسی کو اپنی زبان سمجھ کر اس میں دلی جذبات وخیالات کا اظہار کرتے رہے۔''۳۴

کشمیر ہندوؤں کا فارسی کی طرف راغب ہونا اور اس میں مہارت حاصل کرنا ایک طرف تو ان کے لئے منفعت کا باعث ہوا تو دوسری طرف فارسی زبان کی طرف ان کی رغبت خود اس زبان کی نشو ونما اور پرورش کا باعث ہوئی۔اگر ریاست میں یہ زبان صرف مسلمانوں تک ہی محدود رہتی تو ممکن تھا کہ نشو ونما اور ارتقاء کے وہ مراحل طے نہ کر سکتی جن کے نتیجے میں کشمیر فارسی علم وادب کا گہوارہ بن گیا۔

سلطان زین العابدین کے بعد شہمیری سلاطین کا عہد خانہ جنگی اور خلفشار کا شکار ہوتا گیا جس کے باعث علم وادب کے فروغ کا سلسلہ محدود ہوتا گیا لیکن زبان کے ارتقاء کا جو عمل گذشتہ دور میں شروع ہوا تھا وہ مسلسل ارتقاء پذیر رہا یہاں تک کہ کشمیر کی ریاست سے شہمیری خاندان کی حکومت کی بساط اُٹھ گئی۔

کشمیر سے شہمیری خاندان کی حکومت کے خاتمے کے بعد چک برسر اقتدار آئے۔چک حکمران بنیادی طور پر شیعہ عقائد کے حامل تھے۔چنانچہ ایران کی زبان ہونے کے ناتے فارسی کے ساتھ ان کی دلچسپی فطری تھی۔ چک حکمرانوں میں حسین شاہ چک اور یوسف شاہ چک کے دور میں فارسی زبان کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی

اوراس عہد میں امین مستغنی، میر علی، ملا نامی اور مہری جیسے شاعر منظر عام پر آئے جن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا زمانہ معترف ہے۔ان میں سے چند ایک شعراء کا نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے تا کہ اس دور کے شاعرانہ مزاج اور شعرا کی افتادِ طبع کا اندازہ ہو سکے۔

گل بدستم چہ نہی ور کفِ من خار خوش است
ایں گلِ تازہ براں گوشۂ دستار خوش است

☆

سبو سبو دہ و خمُ خمُ دل لوند مرا
قدح چہ آب زند آتشِ بلند مرا
(میر علی)

☆

دستم بریدہ باد چہ کار آیدم بگو
در گردن بتاں چو حمائل نمی شود
(نامی)

☆

مرتضیٰ بادشہِ مسند عالی نبی است
آفتابیست کہ برج شرفش دوشِ نبی است
برہمن گرد تو گردم رہ کفرم بنما
کہ زایمان خودم شرم بسی می آید

(مستغنی)

یوسف شاہ چک اور حسین شاہ چک خود بھی اچھے شاعر تھے ۔ یوسف شاہ کے متعلق بعض محقق لکھتے ہیں کہ وہ کشمیری اور ہندی زبان میں بھی شاعری کرتا تھا لیکن اس کے ہندی اشعار دستیاب نہیں ہیں ۔ پرگنہ کشمیر کا ایک خوبصورت تفریحی مقام ہے وہاں ایک سبزہ زار میں قریب قریب دو چشمے نکلتے تھے جن کے نام تار سے اور مارسر تھے۔ ان چشموں سے موتیوں کی صورت نکلتے پانی کو دیکھ کر یوسف کی شاعرانہ حس پھڑکی اور یہ خوبصورت شعر کہا۔

بہ یاد دو زلفِ بت کشمیر نژادی

شد تارسر و مارسر از گریہ چشم

(بتِ کشمیر (حبہ خاتون) کی یاد میں میری آنکھیں اتنا روئیں کہ تارسر اور مارسر دو چشمے جاری ہو گئے)۔ حسین شاہ چک کے کئی شعر کشمیر میں زبان زد عام وخاص رہے ہیں۔ نمونے کے طور پر دو شعر درج ہیں:

حمائل کردہ تیغ و بستہ خنجر یار می آید

دلا برخیز! کاری کن کہ جان در کار می آید

☆

آن ترک آل پوش سوار سمند رشد

یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

(حسین شاہ) ۳۵

کشمیر میں چکوں کے بعد مغلوں کا دور آیا اس دور میں کشمیر بلند پایہ شعر وسخن کا مرکز بن گیا۔ اسی عہد میں فارسی کو سرکاری اور درباری زبان کا درجہ دیا گیا اور مغلوں کی علم نوازی اور ادب پروری نے کشمیر میں فارسی شاعری کا عہد زریں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی تصنیف ''کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ'' میں مغلیہ

عہد میں علمی فروغ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کشمیر میں مغلوں کے تسلط کے بعد علم و ادب اور شاعری کی ترقی کے لئے نئی راہیں کھلیں اس کے ساتھ ساتھ وہ سارا تہذیبی سرمایہ جو مغلوں کی حکومت ہند کے عروج کے دور میں نشو نما پایا اس کا حقدار کشمیر بھی بنتا گیا پیر غلام حسن مورخ کشمیری اس سلسلے میں رقمطراز ہیں: 'در حکومت شاہان مغل بازار شعر و سخن بسیار گرم بود۔'' ۳۶

مغلیہ حکومت کے دوران کشمیر میں فارسی کی روز افزوں حوصلہ افزائی اور سرکاری سرپرستی کے باعث اہل کشمیر کی اپنی مادری زبان بھی پس منظر میں چلی گئی۔ کشمیری ہندوؤں نے بھی کشمیری زبان سے کنارہ کشی اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری صلاحیتوں کے باوجود کشمیری زبان اپنے ہی ملک میں دب کر رہ گئی اور وہ مقام نہ حاصل کر سکی جو اپنی وسعت کے باعث اسے حاصل ہونا چاہیے تھا۔

اس عہد میں فارسی علوم اور شاعری کو فروغ حاصل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایران سے نامور فارسی شعراء مغل بادشاہ اکبر کی علم پروری اور ادب نوازی کا شہرہ سن کر ہندوستان کا رخ کرتے تھے۔ یہاں فیضی اپنی جماعت کے ساتھ موجود تھا علم و ادب کی محفلیں برپا ہوتیں، مشاعرے ہوتے اور مقابلے پر قصائد لکھے جاتے اور یوں مقابلے اور مسابقے کی فضا ہر وقت قائم رہتی تھی۔ موسم گرما میں شاہان ہند اپنے امرا کے ساتھ سیر و تفریح کی خاطر کشمیر آتے کشمیر کی آب و ہوا اہل ایران کے لئے ہر دور میں کشش کا باعث رہی ہے اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ایرانی ہندوستان آتا وہ کشمیر نہ آتا چنانچہ مغل بادشاہ جب بھی کشمیر آئے ایرانی شاعر اور علماء ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ ہوتے۔

اکبر فتح کشمیر کے بعد تین بار کشمیر کی سیاحت کرنے آیا۔ پہلا سفر ۱۵۸۷ء میں کیا اس سفر میں شہزادہ سلیم، شہزادہ مراد، خان خاناں، حکیم ابوالفتح گیلانی، ابوالفضل فیضی اور بہت سے دیگر امرا اور مصاحب ہمراہ تھے۔ اسی سفر میں نامور فارسی شاعر عرفی بھی آپ کے ہم رکاب تھا اس سفر میں اکبر نے کسی موقع پر ایک گھوڑا انعام کے طور پر عطا

کیا۔عرفی کو گھوڑا پسند نہ آیا اور گھوڑے کی ہجو کہی جو خاصی مشہور ہوئی۔ان مغل بادشاہوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً کشمیر آنے والے شعرا میں سے بعض کو حسن کشمیر اس قدر دامن گیر ہوا کہ انہوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی اور بعض نے تو موت بھی یہیں قبول کی۔کشمیر میں وفات پانے والے شعراء میں ملا طغرا مشہدی، حاجی جان محمد قدسی مشہدی، میر فتح اللہ شیرازی، حکیم ابو طالب، حکیم میرزا محمد قلی، سلیم طہرانی، عنایت خان آشنا، میرزا ابوالقاسم وغیرہ شامل ہیں۔جوسری نگر کے قریب مزار الشعراء میں آسودہ خاک ہیں۔کشمیر کے مقامی شعراء نے ان ایرانی شعرا کی تخلیقی صلاحیتوں سے خوب خوب استفادہ کیا جس سے ان کے فن کو پختگی اور جلا ملی۔اس دور کے کشمیری شعراء میں ملا ذہنی، ملا ندیمی اور ملا فصحی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اکبر کے بعد جہانگیر ہندوستاب کے تخت و تاج کا وارث بنا۔جہانگیر بھی اپنے باپ کی طرح حسن کشمیر کا دلدادہ اور شعر و ادب کا رسیا تھا۔خود بھی شعر کہتا اور شعرا کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔اس کی تزک اس کی علم دوستی کا ثبوت ہے۔۔۔جہانگیر متعدد بار کشمیر آیا۔ایک بار وہ مسلسل چھ ماہ تک یہاں قیام پذیر رہا اس کے ساتھ بھی شعرا اور علماء کی ایک جماعت ہوتی۔ان درباری شعرا میں فیضی، طالب آملی، عرفی جیسے نامور شعرا بھی ہوتے تھے۔ان شعرا کی کشمیر آمد اور نغمہ سنجی نے بھی کشمیری شعرا اور علما کے ذوق کو نکھارنے میں خاص کام کیا۔اس دور کے کشمیری شعراء میں حبیب اللہ حبی کو خاص مقام حاصل ہے۔پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ''، میں حبی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''حبی دو کتابوں 'راحت القلوب' اور 'تنبیہ القلوب' کے مصنف ہیں اور یہ دونوں کتابیں تصوف میں ہیں۔انھوں نے ۱۶۰۲ء میں اپنے استاد شیخ یعقوب صرفی کی سوانح حیات بھی لکھی جو 'مقامات حضرت ایشان' کے نام سے موسوم ہے۔حبی نے فارسی میں ایک دیوان بھی چھوڑا ہے جس میں غزلوں کے علاوہ قصیدے، رباعیاں

اور قطعات بھی شامل ہیں۔''۳۷

جبی کا نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں:

اے کے بہشت بریں بے عذابم عذاب
آتش دوزخ ہمہ باتو گلابم گلاب

☆

گرمی شوقت چہ کرد، نرمی ذوقت چہ کرد
سینہ کبابم کباب، دیدہ پرآبم پر آب

☆

جبّی بے چارہ بین اشک فشاں برزمین
کردہ زراہت چنی زدست شراب وکباب

کشمیر کے یہ سارے شاعر اپنے فنی کمال اور ندرت کے باعث کشمیر کا سرمایہ اور اثاثہ ہیں لیکن مغلیہ عہد سر زمین کشمیر میں ایک ایسا سخن سنج بھی پیدا ہوا۔ جس کی شہرت کشمیر کے کہساروں سے نکل کر ہندوستان اور ایران تک پھیل گئی۔ یہ صاحب کمال ملا محمد طاہر غنؔی ہیں۔ یہ درویش صفت شاعر عہد اورنگ زیب کا وہ درخشندہ ستارہ ہے جس کی منور کرنیں آج بھی اس فن کے لیے رہنمائی کا باعث ہیں۔ غنؔی اپنے وقت کے نامور عالم اور شاعر ملا محسن فانی کے شاگرد تھے۔ ملا فانؔی کے شاگردوں میں ملا محمد زماں قانع اور حاجی محمد اسلم سالم کا ذکر بھی آتا ہے لیکن بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

''فانؔی کے شاگردوں میں ملا محمد طاہر غنی کو جو مترتبہ حاصل ہوا وہ نہ صرف فانؔی کے دوسرے شاگردوں بلکہ کشمیر کے فارسی شعرا میں کسی کو کم حاصل ہو سکا۔ شاعری میں

غنیؔ کی شہرت نے فانیؔ کو بھی باوجود ان کے علم وفضل کے پس منظر میں ڈال دیا۔''یہ قبول خاطر ولطف سخن'' کی بات ہے تاہم یہ بھی درست ہے کہ غنیؔ کے مخصوص انداز فکر نے کشمیر میں فارسی شاعری کے معیار کو اتنا بلند کر دیا کہ کشمیر کا شمار بھی فارسی ادب اور شاعری کے اہم مرکزوں میں ہونے لگا۔''۳۸؎

ڈاکٹر صابر آفاقی نے بجا فرمایا ہے کہ:

''میرا نظریہ یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند نے فارسی کے پانچ ہی شاعر پیدا کیے ہیں۔ امیر خسرؔو، عبدالقادر، بیدلؔ، مرزا غالبؔ، اقبال اور پانچویں غنیؔ کاشمیری۔''۳۹؎

غنیؔ کی یہی شاعرانہ عظمت اور کمال ہے جس کے باعث علامہ اقبال جیسا سخن ور اور سخن شناس بھی غنیؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اقبال کشمیر کی جن شخصیات سے خاص طور پر متاثر تھے اور جن کا احترام کرتے تھے۔ ان میں سلطان شہاب الدین، سید علی ہمدانی، اور غنیؔ کاشمیری سرفہرست ہیں۔ اقبال نے ۱۸۹۶ء میں 'انجمن کشمیری مسلمانان لاہور' کے اجلاس میں جو قطعات پڑھے تھے ان میں وہ قطعہ بھی شامل ہے جو غنی کے اس شعر پر گرہ لگا کر کہا گیا ہے:

ہر کہ پابند وطن شد میکشد آزرہا
پای گل اندر چمن دایم پر است از خارہا

اقبال کا قطعہ یہ ہے:

ظلم سہتے ہیں وطن اپنا نہ جن سے چھٹ سکا
شکوہ حکام پھر اے دل نہیں تیرا بجا
کیا عجب کشمیر میں رہ کر جو ہے ان پر جفا

پای گل اندر چمن دائم پراست از خا رہا۴۰

اسی طرح بانگ درا کی ایک معروف نظم 'خطاب بہ جوانان اسلام' غنیؔ کے اس شعر پر تضمین ہے:

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن

کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

کشمیر کے دیگر فارسی گو شعرا کے برعکس غنیؔ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ درباری پن اور بادشاہوں کی جبہ سائی اور دنیاوی جاہ وجلال سے بے نیاز تھا۔ غنیؔ کے متعلق یہ روایت اکثر محققین نے نقل کی ہے جب وہ گھر کے اندر ہوتا تو دروازہ بند رکھتا اور گھر سے باہر جاتا تو دروازہ کھلا چھوڑ جاتا۔ کسی نے سبب دریافت کیا تو فرمایا:

''مکان کی متاع بے بہا تو میں ہوں میں نہ ہوں گا تو مکان کے دروازے بند کرنا بے سود ہے''۔۴۱

غنی کے اس جواب کو حضرت اقبال نے یوں منظوم کیا ہے۔

غنیؔ آں سخنگوے بلبل صغیر   نواسنجِ کشمیر مینو نظیر

چو اندر سرا بود، در بستہ داشت   چو رفت از سرا تختہ را وا گذاشت

یکے گفتش اے شاعر دل رسے   عجب دارد از کار تو ہر کسے

بپاسخ چہ خوش گفت مرد فقیر   فقیر و با اقلیم معنی امیر

زمن آنچہ دیدند یاراں رواست   دریں خانہ جز من متاعے کجا است

غنیؔ تا نشیند بہ کاشانہ اش   متاعے گرانے ست در خانہ اش

چو آں محفل افروز در خانہ نیست   تہی ترازیں، ہیچ کاشانہ نیست۴۲

سید حسام الدین راشدی نے 'تذکرہ شعری کشمیر' میں غنیؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

''محمد طاہر غنی صاحب طبع عالی بود، پایہ سخنور رابدرجہ کمال رساند۔ از خطہ کشمیر بلکہ از

اقلیم ہند ہیچواوخوش خیال، نازک بند، معنی یاب، برنخاستہ۔''۴۳

اسی فقر داستغناء کے باعث علامہ اقبال 'جاوید نامہ' میں انھیں 'شاعر رنگین نوا' باطن غنی ظاہر غنی اور مست مدام کا خطاب دیتے ہیں:

شاعر رنگین نوا طاہر غنی

فقر او باطن غنی ظاہر غنی

غنی کی ذہانت اور فن کاری کی ایک مثال محمد عبداللہ قریشی نے اپنے مضمون 'کشمیر کی فارسی شاعری' میں یوں پیش کی:

''ایک روز مرزا صائب کہیں سیر کو گیا ہوا تھا اس کی بیاض غنی کے پاس پڑی تھی۔ ایک

عقیدت مند غنی کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیاض اٹھا کر دیکھنے لگا ایک جگہ شعر کا پہلا

مصرع تلف تھا اور دوسرا مصرع اس طرح تھا۔

ع کہ از لباس تو بوی کباب می آید۴۴

اس نے غنی سے پوچھا کہ اس کا پہلا مصرع کیا ہونا چاہیے۔ غنی نے بلا تامل فرمایا:

ع کدام سوختہ جان دست زد بدامانت

کہ از لباس تو بوی کباب می آید۴۵

اس شخص نے مصرح بیاض میں لکھ دیا۔ جب مرزا صائب واپس آیا اور مصرع دیکھ کر اصل حال سے واقف ہوا تو اس نے کہا' کاش! دیوان یک مصرع نگاشتی و تضمینیش ملا غنی کردی۔

کشمیر میں مغلوں کے تسلط کے خاتمے کے بعد افغان برسر اقتدار آئے۔ افغان بھی فارسی شعر وادب کی

روایات کے امین بنے۔اس عہد میں راج سکھ جیون کی خدمات کا تذکرہ ملتا ہے جو باقاعدہ مشاعروں کا اہتمام کرتا تھا پھر پنڈت دیارام کاچر خوشدل بھی شعروسخن کا بہترین ذوق رکھتا تھا۔افغان عہد کے آخری سالوں میں میر احسن اللہ خان راضی نے بھی خاص شہرت پائی۔جنھوں نے ایک شہرآشوب نظم یادگار چھوڑی ہے۔

کشمیر میں افغان دور کے خاتمے کے ساتھ ہی فارسی راج کی تمازت ماند پڑنے لگی۔سکھ حکمران ادبی ذوق سے تہی اور کورمغز تھے۔ چنانچہ اہل علم وفن کی قدر دانی مفقود ہوگئی۔ دوگرہ عہد میں دیوان کرم پا نامی درباری نے 'گلاب نامہ' کے عنوان سے گلاب سنگھ کی سوانح لکھی لیکن مجموعی طور پچ علم وادب کے سوتے خشک ہوتے رہے اور بلآخر نوبت بایں جارسید کہ کشمیر میں فارسی شاعر کا وہ چراغ گل ہوگیا جس کی لو سے اہل ایران بھی حرارت اور رہنمائی حاصل کی تھی۔

۱۹۴۷ء سے قبل ریاست جموں وکشمیرانتظامی،جغرافیائی اورلسانی اعتبار سے تین بڑے حصوں میں تقسیم تھی۔ ا۔جموں ۲۔کشمیر ۳۔گلگت وبلتستان۔ان تمام خطوں کا المیہ یہ رہا ہے کہ یہاں کبھی بھی کوئی مشترکہ زبان پروان نہیں چڑھ سکی،سنسکرت اور فارسی یہاں کی علمی،ادبی،تہذیبی ودرباری زندگی پرراج کرتی رہی ہیں۔لیکن ان زبانوں کو عام بول چال کا مقام حاصل نہیں ہوسکا تھا۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی مشترکہ زبان کی عدم موجودگی میں لسانی اعتبار سے کشمیر کئی حصوں میں منقسم نظر آتا ہے۔

جموں میں زمانہ قدیم سے عام بول چال کی بری زبان دوگری ہے۔کشمیر میں کشمیری زبان بولی جاتی ہے جبکہ گلگت وبلتستان میں شینا وبلتی وغیرہ زبانیں رائج ہیں۔ریاست جموں وکشمیر میں بسنے والوں کا مذہبی اور علاقائی بندھنوں کے باعث آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے،لیکن لسانی اختلافات ان کے معاملات اور اختلاط میں رکاوٹ کا باعث تھا اس رکاوٹ کا لازمی نتیجہ ذہنی ہم آہنگی کے فقدان پر منتج ہوتا تھا۔جموں وکشمیر میں کسی مشترکہ زبان کی عدم موجودگی سے ایک مشترکہ زبان کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی،جو سب صوبوں میں رابطے اور ہم

آہنگی کا ذریعہ بن سکے۔اس ضرورت نے جموں وکشمیر میں اردو زبان کی ترویج اور نشو ونما کے امکانات پیدا کیے اور آج اردو وہ واحد زبان ہے جو جموں وکشمیر کے چاروں حصوں میں نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ ادب کی مختلف اصناف کی صورت میں اہل کشمیر کے احساسات وجذبات کی ترجمان اور سفیر بھی ہے اور وہاں کے عوام کی بیداری اور ترقی کی نقیب بھی۔آج جموں کشمیر میں اردو کی حثیت اس مضبوط پل کی ہے جو ان چاروں خطوں میں بسنے والوں کو آپس میں ملانے ان میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے اور ایک منزل متعین کرنے میں ان کی معاون ہے۔

جموں وکشمیر میں اردو کی آمد کے سلسلے میں پہلی اور سب سے اہم بات جو بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں فارسی کے شانوں پر سوار ہو کر داخل ہوئی،اسی کی نگرانی میں آنکھیں کھولنا اور پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھا اور جب قدرے سیانی ہوگئی اور کشمیر کے کوہساروں اور وادیوں سے مانوس ہوگئی تو فارسی سے نہ صرف آنکھیں ملانے لگی بلکہ اس کے سارے اثاثوں پر قبضہ جما کر اسے بے دست و پا کر گئی۔گویا کشمیر مین فارسی کی حیثیت جنگل کے اس Mother plant کی ہے جو اپنے زیر سایہ کئی ناتواں اور کمزور پودوں کو پالتا ہے،انھیں گرمی سردی سے بچاتا اور چڑھاتا ہے اور جب یہ ناتواں پودے تناور ہو جاتے ہیں تو Mother plant بڑھاپے کی منازل طے کر کے کٹ جاتا ہے یا بردگی کا شکار ہو جاتا ہے۔

طویل عرصے تک جاہ وجلال دیکھنے کے بعد ایک وقت آیا کہ برصغیر کی طرح جموں وکشمیر میں بھی فارسی کا چراغ ٹمٹمانے لگا فارسی کا زوال یہاں اردو کے حق میں 'خدا ساز' ثابت ہوا۔چنانچہ جب اردو زبان نے ریاست کی وادیوں میں باقاعدہ دستک دینا شروع کی تو اسے خوش آمدید کہنے کے لئے فارسی کے دوش پر سوار ہو کر آنے والے نمائندے۔الفاظ،کہاوتوں اور محاوروں کی صورت میں پہلے ہی موجود تھے فارسی اور کشمیری کے ساتھ تال میل اور مماثلت کے باعث یہ زبان اہل کشمیر کے لئے اجنبی تھی نہ بعید از فہیم،اہل کشمیر نے اسے فارسی کے متبادل کے طور پر اپنانے میں کوئی پس وپیش نہ کی چنانچہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو فارسی کی تہذیبی پرورش کا لازمی نتیجہ

ہے۔لیکن ظاہر زبانوں کی آمد ورفت بیرونی حملہ آوروں کی طرح اعلانیہ یا طے شدہ منصوبے کے تحت نہیں ہوتی بلکہ زبانیں انتہائی غیر محسوساتی انداز میں کسی علاقے میں اپنی جڑیں پکڑتی اور مضبوط کرتی ہیں۔اردو نے اسی غیر محسوساتی انداز میں قدم رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے فارسی کے متبادل کے طور پر ریاست کی تہذیبی علمی اور سیاسی زندگی پر راج کرنے لگی۔

☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو(حصہ اول)،تمہید،ص۱، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،دہلی

۲۔ ٹھاکرا چھر چند شاہ پوریہ(مترجم): راج ترنگنی(حصہ اول)،کلہن ،پنڈت،ص۳۷،گلشن بکس ریذیڈنسی روڈ سرینگر۲۰۱۱ء

۳۔ فوق،محمد دین: مکمل تاریخ کشمیر،ص۱۱،ویری ناگ پبلی کیشنز،طبع دوم،۱۹۹۱ء

۴۔ ٹھاکرا چھر چند شاہ پوریہ(مترجم): راج ترنگنی(حصہ اول)،کلہن ،پنڈت،ص۴۷، گلشن بکس ریذیڈنسی روڈ سرینگر۲۰۱۱ء

۵۔ میر۔جی۔ایم: جموں وکشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں،ص۷، جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ۱۹۹۱ء

۶۔ ایضاً--- ---------------ص۷،۸

۷۔ ایضاً--- ---------------ص۸

۸۔ فوق،محمد دین: مکمل تاریخ کشمیر،ص۱۳،۱۴ ویری ناگ پبلی کیشنز،طبع دوم،۱۹۹۱ء

۹۔ عنصر صابری: تاریخ کشمیر، ص۱۲،پروگسیو بکس۱۹۹۱ء

۱۰۔ ٹھاکرا چھر چند شاہ پوریہ(مترجم): راج ترنگنی(حصہ اول)،کلہن ،پنڈت،ص۳۷گلشن بکس ریذیڈنسی روڈ سرینگر۲۰۱۱ء

۱۱۔ سلیم خان گمی: اقبال اور کشمیر، ص۱۴،یونیورسل بکس اردو بازار لاہور،طبع دوم۱۹۸۵ء

۱۲۔ فوق،محمد دین: مکمل تاریخ کشمیر(حصہ اول)،ص۱۴،یری ناگ پبلی کیشنز،طبع دوم،۱۹۹۱ء

۱۳۔ محمد سعید اسعد: جموں وکشمیر بک آف نالج،ص۱۴

۱۴۔ عباس احمد آزاد: عالمی سامراج اور کشمیر،ص۴۴،۴۷کشمیر لٹریری اینڈ کلچر سوسائٹی،بار اول۱۹۸۹ء

۱۵۔ پریم ناتھ بزاز: تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر،ص۲۹، ویری ناگ پبلیشرز، ۱۹۹۴ء

16. A Gazetter of Kashmir: charles Elision Bates, Sang-e-meal publication, Lahore.

۱۷۔ محمد یوسف ٹینگ: دیپاچہ، کشمیر میں اردو (حصہ اول)، از عبدالقادر سروری، جے کے آفس پرنٹرس دہلی ۱۹۸۲ء۔

۱۸۔ پریم ناتھ بزار، پنڈت: تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر، مترجم عبدالحمید نظامی، ص ۶۵، ویری ناگ پبلیشرز ۱۹۹۲ء

۱۹۔ سلیم خان گمی: کشمیر میں اشاعت اسلام، ص ۸۲، یونیورسل بکس اردو بازار لاہور ۱۹۸۶ء

۲۰۔ پریم ناتھ بزار، پنڈت: تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر، مترجم عبدالحمید نظامی، ص ۶۷، ویری ناگ پبلیشرز ۱۹۹۲ء

۲۱۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۶۷۔

۲۲۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۹۲۔

۲۳۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر: تاریخ کشمیر (اسلام عہد میں)، ص ۶۲، سنگ میل پبلیشرز ۱۹۸۴ء

۳۴۔ پریم ناتھ بزار، پنڈت: تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر، مترجم عبدالحمید نظامی، ص ۱۳۰، ویری ناگ پبلیشرز ۱۹۹۲ء

۴۵۔ عبدالقادر سروری، پروفیسر: کشمیر میں اردو (حصہ اول)، ص ۱۰۲، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز، سرینگر، ۱۹۸۴ء

۲۶۔ عبدالاحد آزاد: کشمیری زبان اور شاعری (جلد اول)، طبع اول، ص ۱۱، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز، سرینگر، ۱۹۵۱ء

۲۷۔ سلیم واحد، سلیم (مترجم): کشمیر کے واقعات، از خواجہ محمد اعظم، ص ۳۷، شمارہ (۱۲، ۱۳، ۱۴)، جموں و کشمیر اسلامیک ریسرچ سنٹر، سرینگر ۱۹۹۸ء

۲۸۔ یوسف بخاری، ڈاکٹر: کشمیری زبان اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ، ص ۱۱۳، مرکزی اردو بازار لاہور ۱۹۸۲ء

۲۹۔ عبدالقادر سروری، پروفیسر: کشمیر میں اردو (حصہ اول)، ص ۱۱۳، جے کے آفسٹ پرنٹرس دہلی، ۱۹۸۲ء،

۳۰۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۱۱۳۔

۳۱۔ یوسف بخاری، ڈاکٹر: کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ، ص۴۰، ۴۱، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۸۲ء

۳۲۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۶۸۔

۳۳۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر: عکس کشمیر، ص۹، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۰ء

۳۴۔ پریم ناتھ بزار، پنڈت: تاریخ جدو جہد آزادی کشمیر، مترجم عبدالحمید نظامی، ص۱۰۲، ویری ناگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء

۳۵۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر: عکس کشمیر، ص۱۰، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۰ء

۳۶۔ فوق محمد، دین: تاریخ بڈ شاہی، ص۳۹۳، ظفر برادرس لاہور،

۳۷۔ محمد عبداللہ قریشی: مضمون بعنوان، کشمیر میں فارسی شاعری، ص۶۶، مطبوعہ ایران کبیر و ایران صغیر مرتبہ یعقوب ہاشمی

۳۸۔ فوق محمد، دین: تاریخ بڈ شاہی، ص۳۷۱، ظفر برادرس لاہور

۳۹۔ عبدالقادر سروری، پرفیسر: کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، ص۱۰۰، کلچرل اکیڈمی سری نگر ۱۹۷۹ء

۴۰۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۱۰۵

۴۱۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۳۸، ۱۳۹

۴۲۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر: عکس کشمیر، ص۱۱۲، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۰ء

۴۳۔ محمد اقبال علامہ، ڈاکٹر: بانگ درا، ص۱۸۰، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۵ء

۴۴۔ محمد اقبال علامہ، ڈاکٹر: پیام مشرق، ۱۳۷، غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۵ء

۴۵۔ حسام الدین راشدی: تذکرہ شعراء کشمیر، ص۱۶۹، اقبال اکادمی پاکستان، فروری ۱۹۸۲ء

باب دوم

1950 کے بعد جموں و کشمیر میں اُردو زبان و ادب کا آغاز و ارتقاء

1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کا آغاز وارتقاء

اُردو برصغیر ہندو پاک کی جدید ہند آریائی زبانوں میں سب سے مقبول زبان ہے۔ گرچہ کسی بھی مخصوص علاقے کو ابھی تک اُردو کی جائے پیدائش قرار نہیں دیا جاسکا ہے لیکن اُردو کی پیدائش کے حوالے سے مختلف اور متضاد نظریات ضرور پیش کئے گئے ہیں مثلاً پنجاب میں اُردو، (حافظ محمود شیرانی) دکن میں اُردو (نصیر الدین ہاشمی) سندھ میں اُردو (سید سلیمان ندوی) اور دہلی اور نواح دہلی میں اُردو (پروفیسر مسعود خاں) وغیرہ۔ محمد حسین آزاد اور کئی دیگر ماہرین لسانیات، ادیبوں اور دانشوروں نے عام طور پر اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ اُردو زبان کی پیدائش دہلی اور نواح دہلی میں پیدا ہوئی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کے اس نظریے کے مطابق اُردو نے دہلی اور دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں پہلے کھڑی بولی کا ڈھانچہ اختیار کیا پھر ہریانوی، پنجابی وغیرہ کے اثرات قبول کرنے کے بعد دکن پہنچی اور پھر دکنی کے بھی اثرات قبول کر کے جنوبی ہند (دکن) سے رفتہ رفتہ شمالی ہند بلکہ جموں وکشمیر سمیت پورے برصغیر میں پھیل گئی۔ لیکن جموں وکشمیر میں اُردو کا آغاز وارتقا کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے متحدہ ہندوستان میں اُردو زبان کی پیدائش اور ارتقا کی داستان کا جائزہ اختصار کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہے۔

تاریخی اعتبار سے اتنی بات سبھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کے تعلقات عرب وایران کے ساتھ محمد بن قاسم کی ہندوستان آمد ۷۱۲ء سے بہت پہلے سے رہے ہیں۔ قدیم ہندوستان میں کئی بولیاں بولی جاتی تھیں۔ کسی ایک بولی کی منجھی ہوئی معیاری شکل کا نام ''سنسکرت'' تھا جو (۳۳۰۔ق۔م) کے زمانے میں بھی گرچہ عام بول چال کی زبان کی نہیں تھی لیکن علمی کام اسی زبان ''سنسکرت'' میں ہوتے تھے۔ ''رگ وید'' سنسکرت زبان کی مشہور تصنیف ہے۔ لیکن

چونکہ سنسکرت ایک بند زبان تھی جو ''خواص'' (Elite Class) تک محدود تھی اس لیے عوامی سطح پر کئی بولیاں ترقی کر کے زبان کی حیثیت اختیار کرتی گئیں۔ جنھیں ''پراکرت'' کا نام دیا گیا۔ پروفیسر ویبر کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں بیس سے زیادہ پراکرت زبانیں بولی جاتی تھیں ان میں سے پانچ زیادہ مقبول تھیں جو اس طرح ہیں۔

۱۔ پالی

۲۔ جینی

۳۔ مہاراشٹری

۴۔ سوراسنی (شورسینی)

۵۔ ماگدھی وغیرہ

ان میں بھی سوراسنی (شورشینی) کو نمایاں مقام حاصل تھا کیونکہ یہ زبان سندھ سے بہار اور لاہور سے مالوہ تک اس ملک کے وسیع و عریض علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اسی سوراسنی زبان کا دوسرا نام ''برج بھاشا'' ہے ایک زمانہ تک یہ مانا جاتا تھا کہ اُردو اسی برج بھاشا سے نکلی ہے۔ مثلاً محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اُردو کا مخرج برج بھاشا کو ہی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات دُرست نہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ زبانیں بھی انسانی تہذیب و تمدن کے عروج و زوال کے ساتھ ساتھ بدلتی ہیں، کمزور یا طاقتور ہوتی ہیں لہٰذا معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں کے سبب سنسکرت کی طرح پراکرتوں کا بھی زوال ہوا، اور ایک نئی زبان سامنے آئی جسے ''اپ بھرنش'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ''اپ بھرنش'' میں سنسکرت اور پراکرت زبانوں کے علاوہ دوسری دیسی زبانوں اور بولیوں کے عام فہم الفاظ بھی شامل تھے۔ اس لیے یہ زبان وقت کے ساتھ ترقی کرتی ہوئی ایک عوامی زبان کے طور پر پورے ہندوستان میں پھیلتی چلی گئی۔ لیکن قدیم ہندوستان چونکہ ایک وسیع و عریض ملک تھا جہاں الگ الگ علاقوں میں الگ الگ زبانیں اور بولیاں بولی جاتی تھیں جن کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ زبان اور بولی کے حوالے سے آج بھی یہ محاورہ

عام طور پر بولا جاتا ہے کہ

تین کوس پر بولی بدلے پانچ کوس پر بھاشا

اس لیے اس نئی عوامی زبان ''اپ بھرنش'' میں جب مقامی علاقائی بولیوں اور زبانوں کے الفاظ کثرت سے شامل ہونے لگے تو الگ الگ علاقوں میں ''اپ بھرنش'' کی بھی الگ الگ شکلیں سامنے آئیں۔ جنھیں ان کی مقامی، لسانی خصوصیات کی وجہ سے الگ الگ نام دئے گئے۔ اس طرح اپ بھرنش کی درج ذیل قسمیں سامنے آئیں۔

۱۔ شورسینی اپ بھرنش

۲۔ پشاچی اپ بھرنش

۳۔ ماگدھی اپ بھرنش

۴۔ اردھ ماگدھی اپ بھرنش

۵۔ مہاراشٹری اپ بھرنش

اپ بھرنشوں میں ''شورسینی اپ بھرنش''۔ ہندوستان کے زیادہ بڑے علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ جمیل جالبی اور دیگر کئی مورخین نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم کی ہندوستان آمد ۷۱۲ء سے پہلے ہی شورسینی اپ بھرنش ایک ملک گیر زبان بن چکی تھی۔ جالبی کے مطابق:

''اس (شورسینی) اپ بھرنش کا اثر مسلمانوں کے آنے سے بہت پہلے
بنگال سے پنجاب، سندھ، کشمیر، گجرات و راجپوتانہ تک اور شمال ہندو
نیپال سے مہاراشٹر تک جاری و ساری تھا۔ دیسی بولیوں کے ساتھ مل کر
اس نے ہر علاقے میں نئی آریائی زبانوں کی پیدائش میں مدد دی تھی۔
برج بھاشا اودھی پنجابی، ہندی وغیرہ شورسینی اپ بھرنش ہی کی شاخیں ہیں''۔(۱)

جمیل جالبی نے The history and culture of the Indian people کے حوالے سے لکھا ہے کہ قدیم زمانے سے ہی عرب ممالک اور وسط ایشیا کے دیگر کئی ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات تھے۔ جب محمد بن قاسمؒ نے ۷۱۲ء میں سندھ اور ملتان کو فتح کیا تو سندھ ملتان کے علاوہ پنجاب راجپوتانہ اور گجرات وغیرہ کے قریبی علاقوں میں ایسی ملی جلی بولیاں بولی اور سمجھی جاتی تھیں جن میں شورسینی اپ بھرنش اور پشاچی اپ بھرنش کے الفاظ شامل تھے۔ مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ جس علاقہ کو بھی فتح کرتے سرکاری نظم ونسق چلانے کے لیے اس علاقہ کی سب سے اہم زبان کو اپنا لیتے تھے (انگریزوں نے بھی ہندوستان میں اپنے سیاسی اور سرکاری مقاصد کی تکمیل کے لئے ہی فورٹ ولیم کالج قائم کر کے اپنے افسران کو اس زمانے کی عوامی زبان اُردو سیکھنے کا انتظام کیا تھا۔ چونکہ اختیاری اور اکتسابی زبان میں مادری زبان کے الفاظ بھی فطری طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے الفاظ اور شورسینی زبان (جس میں پہلے سے ہی کئی بولیوں کے الفاظ تھے) کے الفاظ ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگے اور اسی طرح اُردو زبان کی تشکیل کا عمل شروع ہوا۔ تقریباً تین سو سال تک زبان کی تشکیل کا یہ عمل سندھ ملتان پنجاب، راجپوتانہ اور گجرات میں چلتا رہا۔ ۱۰۰۱ء میں جب محمود غزنوی ہندوستان آیا اور اس نے سندھ ملتان اور پنجاب سے لے کر دہلی، میرٹھ اور نواح دہلی کے علاقوں کو بھی فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ تو اس پورے عرصے میں شورسینی اپ بھرنش کے زیر اثر سامنے آنے والی تمام زبانیں جن میں اُردو (ہندوی) بھی شامل ہے تیزی سے اپنی لسانی ساخت (بناوٹ) کو واضح، منفرد اور مضبوط بناتی رہیں۔ محمود غزنوی نے ہندوستان کو فتح کر کے دہلی کو اپنا پایہ تخت بنالیا تھا۔ تاریخ میں مسلمانوں کی اس سلطنت کو پٹھانوں کی حکومت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ حکومت ۵۲۶ ءتک قائم رہی ہے۔

۱۵۲۶ء میں بابرؔ نے پانی پت کے میدان میں دہلی کے سلطان کو شکست دے کر سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی جو اورنگ زیب کے انتقال ۱۷۰۷ء تک بڑی شان سے قائم رہی۔

اس طرح محمد بن قاسم ۷۱۲ء سے لے کر محمود غزنوی ۱۰۰۱ء تک کا زمانہ اُردو زبان کی تشکیل کا زمانہ رہا ہے محمود غزنوی سے ظہیرالدین بابر کی فتح ہند تک کے ۵۰۰ سال تک کا زمانہ اُردو کی تعمیر کا زمانہ تھا۔ یعنی ۱۵۲۶ء سے ۱۷۰۷ء تک کا مغلیہ دور۔ اُردو زبان اور اُردو شعر و ادب کے ارتقا کا دور ہے۔

اٹھارہویں صدی تک آ کر چونکہ اول تو شمال و جنوب ایک ہو جاتے ہیں دوئم وَلی دکنی (گجراتی) کے دیوان کے دِلی آنے کے بعد۔ دکنی اُردو۔ فارسی (سبک ہندی) سے قربت کے بعد ایک نئی زرخیز اور معیاری شکل میں سامنے آتی ہے۔ پھر اُردو زبان اور شعر و ادب کا فروغ پورے ہندوستان میں اتنی تیزی سے ہوا ہے کہ ۱۸۳۲ء تک آتے آتے اسے ہندوستان کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ابھی ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان کے خط و خال نمایاں تو ہو چکے تھے اور کشمیر میں اُردو میں علمی، مذہبی اور ادبی تخلیقات بھی منظر عام پر آنے لگی تھیں لیکن ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان کی عمارت کی تعمیر و ترقی میں دین اسلام کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے فارسی و عربی زبانوں، کشمیر کی قدیم علمی زبان سنسکرت، کشمیری اور دیگر چھوٹی زبانوں اور بولیوں کا جو کردار رہا ہے اسے بھی سمجھنا ضروری ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان کا ارتقا، کشمیری، ڈوگری، گوجری اور پہاڑی وغیر کے ساتھ ساتھ ہوا۔

دراصل ریاست جموں و کشمیر (جسے اکثر صرف کشمیر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) صرف ایک حسین و جمیل ریاست کا ہی نہیں بلکہ زبان و ادب اور علم و فضل کے ایک نادر روزگار مرکز کا بھی نام ہے۔ کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں یہ ریاست سیاسی ہی نہیں تہذیبی اور لسانی اعتبار سے بھی کئی مد و جزر سے گذری۔ کشمیری عوام کو مختلف طرح کی تبدیلیوں اور ان کے نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ مذہبی اعتبار سے ہندو دھرم، بودھ دھرم، شیومت اور سلام نے کشمیری عوام کو عقائد کے حوالے سے بھی متاثر کیا اور لسانی و ادبی سطح پر بھی کشمیری فکر و شعور کو بالیدہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جموں و کشمیر اور لداخ میں اُردو زبان کے آغاز و ارتقا میں فارسی، عربی، سنسکرت، کشمیری اور

کشمیر کی دوسری مقامی زبانوں اور بولیوں کے سرمایہ الفاظ کی آمیزش وآویزش کا تاریخی کردار رہا ہے۔لیکن اس کا جائزہ تفصیل سے لینا ہوگا۔

صوبہ کشمیر میں اردو زبان کا آغاز و ارتقاء

اس میں شک نہیں کہ کشمیر کے عوام کی مادری زبان ہزاروں سال سے کشمیری رہی ہے لیکن کشمیری کا کوئی مستقل رسم الخط (Script) اور گرامر نہ ہونے کی وجہ سے کشمیری زبان کی قدیم ترین ساخت اور اس کے سرمایہ الفاظ کی نوعیت کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں، کشمیر کی سرزمین بیرونی زبانوں،تہذیبوں، مذاہب اور رسوم و رواج کو جذب وقبول کرنے کے حوالے سے ہمیشہ سے بہت موافق رہی ہے۔اس کا اندازہ خود ریاست کی قدیم زبان کشمیری کی لسانی ساخت اور سرمایہ الفاظ سے بھی ہوتا ہے۔

لیکن عبدالاحد آزاد نے اپنی کتاب ''کشمیری زبان اور شاعری'' میں کشمیری زبان کے بارے میں پنڈت رام چندکول کے ایک مضمون (مطبوعی ہمدرد۔۳۱جولائی ۱۹۳۸ء) کے حوالے سے تصدیق کی ہے کہ:

> ''کشمیری زبان دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے ....دوسری قوموں کی زبانوں کی طرح کشمیری زبان بھی بہت سے مرحلوں سے گذرکر موجودہ حالت کو پہنچی ہے اس میں چینی، ترکی، تبّتی، روسی، عربی فارسی، پنجابی اور انگریزی کے بہت سے الفاظ شامل ہوگئے ہیں''(۲)

لیکن عبدالاحد آزاد نے موجودہ کشمیری زبان کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''عہد حاضر میں جو کشمیری زبان استعمال کی جاتی ہے اگر اس کا مقابلہ دیس کے رہنے والے تھے، نیز بھامہہ اور دنڈن بھی بودھ تھے یا جین تھے اس سے یہ دِلچسپ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ سنسکرت شعریات پر اگرچہ زیادہ

کام شیو برہمنوں نے کیا۔لیکن سنسکرت شعریات تمام وکمال برہمنوں کی

مرہون منت نہیں‘‘۔(۴)

تاریخی اعتبار سے تیرہویں صدی میں کشمیر میں سیاسی اُتھل پتھل نے ہر طبقہ کے لوگوں کو پریشان کر دیا تھا اور اہل کشمیر ایک نتیجہ خیز انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے۔کشمیر کے جو لوگ ہمسایہ ممالک میں جاتے تھے وہ وہاں کے روحانی بزرگوں سے کشمیر کے حالات پر توجہ دینے کی درخواست کرتے چنانچہ چند کشمیری باشندوں نے ترکستان کے مشہور صوفی سید شرف الدین عبدالرحمٰن بلبل شاہ سے ملاقات کر کے انھیں کشمیر آنے اور کشمیر کے لوگوں کی رہنمائی کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ سید بلبل شاہ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ ۱۳۳۶ء میں کشمیر تشریف لائے ان دنوں کشمیر کے راجاوں کے آپسی جھگڑوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے ہندو راجاؤں کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا۔اور لداخ کا ایک شہزادہ جس کا نام رینچن شاہ تھا کشمیر کا حکمراں بن گیا تھا۔رینچن شاہ اپنی ہندو بیوی کوٹہ رانی اور وزیروں کے ساتھ بلبل شاہ کے ہاتھوں پر بیعت کر کے مسلمان ہو گیا۔بلبل شاہ نے اس کا نام سلطان صدرالدین رنچن شاہ رکھا۔رینچن شاہ کے ساتھ ساتھ سینکڑوں لوگ مسلمان ہو گئے۔رینچن شاہ کا ایک وزیر جو خود بھی مسلمان ہو گیا تھا فارسی زبان سے واقف تھا اس نے بلبل شاہ سے دین اسلام کی باتیں سن کر اور سیکھ کر مقامی لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کی شروعات کی چنانچہ بہت کم عرصے میں ہزاروں کشمیریوں نے انسانی مساوات کی وجہ سے امن عالم اور دین و دنیا دونوں کو سنوارنے والے دین اسلام کو قبول کر لیا۔اسلامی تعلیمات کی وجہ سے عام کشمیری فارسی اور عربی زبانوں سے بھی واقف ہونے لگے۔حضرت بلبل شاہ کے بعد ۱۳۷۲ء میں ایران کے مشہور صوفی بزرگ امیر کبیر حضرت میر سید علی ہمدانی تقریباً سات سو عالموں، مبلغوں اور عبادت گذار مریدوں کے ساتھ کشمیر تشریف لائے۔امیر کبیرؒ کو اہل کشمیر عقیدت اور محبت کی بنا پر ’’شاہ ہمدان‘‘ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔شاہ ہمدان فارسی کے کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔لہٰذا کشمیر کے مسلمان امیر کبیرؒ کے فارسی اشعار تبرک سمجھ کر پڑھتے تھے اور یاد رکھتے تھے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ فارسی زبان

کشمیریوں کے لئے اجنبی نہیں رہی۔اور چونکہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اسلامی باتیں سننے اور پڑھنے کا رواج بھی عام ہو رہا تھا۔اس لئے کشمیر کے تعلیم یافتہ لوگ فارسی لکھنے پڑھنے اور بولنے میں بھی ماہر ہونے لگے یہاں تک کہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہد (۱۴۲۰ءتا ۱۴۷۰ء) میں فارسی کشمیر میں علمی وادبی زبان کی حیثیت اختیار کرنے لگی تھی بڈشاہ نے سینکڑوں سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں کروائے۔بڈشاہ کے عہد حکومت کے زوال تک آ کر فارسی کشمیر کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان ہوگئی۔ عبدالقادر سروری نے بھی اپنی کتاب ''کشمیر میں اُردو'' میں لکھا ہے:

''چودہویں صدی میں ایران اور وسط ایشیا سے آنے والے علما کے ساتھ اسلام اور ایرانی تہذیب کشمیر پہنچی اور فارسی زبان کو فروغ ہوا۔ایک زمانے میں کشمیر پر ایرانی تہذیب کے اثرات اتنے گہرے ہو گئے تھے اور فارسی زبان میں لکھنے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ اہل ایران ''کشمیر'' کو ''ایران صغیر'' کہنے لگے تھے''۔(۵)

ظاہر ہے کہ فارسی کے اس عام چلن کے اثرات کشمیری، اور دیگر مقامی بولیوں پر بھی پڑنے لگے تھے۔لہٰذا فارسی زبان جہاں عوام اور خواص میں اپنی جگہ بناتی رہی یہاں تک کے ہشمیری دور حکومت تک آتے آتے فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوگیا۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ فارسی زبان وادب کے فروغ میں امیر کبیر علی سید ہمدان المعروف شاہ ہمدانی اور ان کے مریدوں اور مواریوں کی کوششوں کا بے حد اہم کردار رہا ہے۔امیر کبیر سید علی ہمدانی اور ان کے ساتھی علما اسلام کی تبلیغ کے لئے عام طور پر فارسی زبان کا ہی استعمال کرتے تھے، جسے اس دور کے تعلیم یافتہ افراد اور عام لوگ بھی سمجھنے لگے تھے۔امیر کبیر فارسی اور عربی کے عالم تھے۔فارسی میں انھوں نے بیس سے زائد رسالے لکھے ہیں۔ان میں سے خاص طور پر درج ذیل رسالے آج بھی مقبول ہیں۔

۱۔ رسالہ معرفت زُہد

۲۔ رسالہ اورادیہ

۳۔ رسالہ چہل حدیث

۴۔ رسالہ ذِکریہ

۵۔ رسالہ کشف الحقائق

۶۔ رسالہ مکتوبات

اس کے علاوہ امیر کبیر کی مناجات، غزلیں، مثنویاں اور دیگر شعری تخلیقات بھی شائع کی جا چکی ہیں۔ شعبہ فارسی کشمیر یونیورسٹی کے پروفیسر مسعودی نے امیر کبیر شاہ ہمدان کا فارسی شاعری کا مجموعہ شائع کروادیا ہے۔ اس کے علاوہ کشمیری حکمرانوں میں زین العابدین ''بڈشاہ'' اور قطب الدین گرچہ کشمیری الاصل تھے۔ لیکن فارسی کے معروف شاعر بھی ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ سلطان نے جگہ جگہ مدرسے قائم کئے تھے۔ جہاں دینیات کے علاوہ فارسی اور عربی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ان باشادہوں کے درباروں میں عربی فارسی کے ماہر علما بھی ہوتے تھے۔ مثلاً سلطان زین العابدین کے دربار میں ملا احمد کشمیری، ملک الشعرا تھے اور انھوں نے سلطان کے قائم کئے ہوئے دارالترجمہ کے لیے کلہن کی ''راج ترنگنی'' کا فارسی میں ترجمہ ''بحر الاسمار'' کے نام سے کیا تھا۔ ان کے علاوہ بھی ریاست جموں و کشمیر کے مختلف علاقوں میں سینکڑوں بزرگ صوفیا، اُدبا اور شعرا ہوئے ہیں جنھوں نے فارسی کو اپنے دینی، علمی و ادبی اور شعری افکار و خیالات کے اظہار کے لیے فارسی کو وسیلہ بنایا۔ ان میں میرزا حیدر دوغلوت، ملا نامی، بابا طالب اصفہانی، میر علی اور مولانا مہدی اور مولانا احمد وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان حضرات کی فارسی تحریروں نے کشمیری زبان میں فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل کئے۔ اور کشمیر کے اکثر و بیشتر لوگ ایسی کشمیری بولنے لگے جسے ریختہ کہنا دُرست ہوگا۔ دِلچسپ اور اہم بات یہ ہے کہ سلطان زین العابدین کے عہد میں مرد ہی نہیں عورتیں بھی فارسی عربی کا شوق رکھتی تھیں۔ عبدالقادر سروری نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''سلطان زین العابدین کے بعد حسن شاہ کے عہد میں.....فارسی علم وادب کا ذوق مردوں سے گذر کر خواتین تک بھی پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ حسن شاہ کی ملکہ شاہ بیگم کو بھی علم وادب سے لگاؤ تھا اور اسی نے ایک مدرسہ اشاعت علم کی غرض سے تعمیر کروایا تھا۔اس کی والدہ گل خاتون کو بھی علم کی اشاعت اور ترقی کا شوق تھا۔ زاہدہ خاتون ایک عارفہ تھیں جن کی اخلاقی کہاوتیں فارسی میں ملتی ہیں''۔(۶)

اس صورت حال سے کشمیر میں اُردو زبان کے آغاز وارتقا کی راہیں ہموار ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں ایسے کئی کشمیر الاصل شعرا کے یہاں فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو کے اشعار بھی ملتے ہیں جو شعرا اپنے علم وفضل کی بنا پر کشمیر سے باہر دہلی، اِلٰہ آباد وغیرہ مختلف شہروں میں اعلٰی منصبوں پر فائز تھے۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آغاز تک آتے آتے کشمیر میں کشمیری اور اُردو کے مشہور محقق اور نقاد محمد یوسف ٹینگ نے جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ کے بارے میں لکھا ہے:

''اُردو کشمیر میں تلوار اور تاج کے سائے میں نہیں آئی۔ نہ اس نے کبھی جبر واستبداد کے سہاروں کی طرف نظریں اُٹھائیں ۔فارسی کے طویل غلبے کے تحت کشمیری زبان کا ایک ایسا مزاج تیار ہو گیا تھا۔ جو اسے اُردو کے ساتھ مصافحہ کرنے کے لئے مکمل طور تیار کر گیا تھا ہندوستان کے مراکز اقتدار سے تال میل اور خود کشمیر میں فارسی کے زوال اور اس کے مٹتے ہوئے رواج نے کشمیریوں کو اب اُردو سے روشناس کردیا۔ان کا ہند آنا جانا رہتا تھا۔اور جن مقامات (لاہور، دہلی، لکھنؤ، اِلٰہ آباد وغیرہ) پر ان کا زیادہ آنا جانا رہتا

تھا۔ وہاں جوزبان پنپ رہی تھی وہ یہی اُردو تھی جسے کسی
دربار نے پالا نہ پوسا بلکہ جوعوام کی ضرورت کے نتیجے میں عجمی اور
ہندوستانی تہذیب کے وصال کے نتیجے میں منصۂ مشہور پر آ گئی....
ہمارے نئے حکمران (سکھ اور ڈوگرے) گرچہ درباروں میں
فارسی کا سوانگ رچاتے رہے۔لیکن انھیں عوام سے میل جول کے
لئے اس نئی زبان اُردو کا استعمال کرنا پڑا۔‘‘(۷)

اس اقتباس میں محمد یوسف ٹینگ نے اُنیسویں صدی میں جموں وکشمیر کی لسانی وادبی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے ارتقا کے اسباب بیان کئے ہیں۔لیکن یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں ریاست کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے متعدد فارسی شعرا شاہجہاںؔ سے لے کر اورنگ زیب اور اس کے فرزند محمد اکبر شاہ کے ساتھ وابستہ رہے۔انھوں نے فارسی میں جو کارنامے انجام دئے وہ ایک الگ موضوع ہے لیکن اب ان میں سے کئی شعرا کے ریختہ کے نمونے بھی تلاش کر لئے گئے ہیں۔اس سلسلے میں سب سے پہلا نام ملا محسن فانیؔ کا آتا ہے......ملا محسن فانیؔ کے سنہ پیدائش کا ذکر کہیں نہیں ملتا لیکن کشمیر کے ایک دانشور پروفیسر ابراہیم نے اپنے ایک مضمون ’’کشمیر کے ریختہ گو شعرا‘‘ میں لکھا ہے کہ ملا محسن فانیؔ کی وفات ۱۰۸۱ھ یا ۱۰۸۲ھ بالترتیب مطابق ۱۶۷۰ء یا ۱۶۷۱ء کو سرینگر کشمیر میں واقع ہوئی۔

فانیؔ بنیادی طور پر فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن ہندوستان میں آمدورفت اور الہٰ آباد میں قیام کی وجہ سے اُردو یا ہندوی کے بھی بہت سارے الفاظ زبان پر چڑھ گئے تھے۔یوں بھی یہ زمانہ اُردو زبان کی لسانی تشکیل کا زمانہ تھا۔ چنانچہ ملا محسن فانیؔ نے جب شاہ جہاں کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تو اس کے ہر بیت میں ایک یا دو دو الفاظ ہندی کے بھی استعمال کئے۔لیکن ان الفاظ کے استعمال میں جو بے ساختگی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فانیؔ ہندوی (

اُردو)زبان پر دسترس رکھتے تھے اس کا اندازہ مذکورہ قصیدہ کے درج ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

نو بہار آمد بسیر گلشن ہندوستان

زیبد ار طوطی بجائے برادب برگ نہاں

در چمن ہر صبح مینا می کند راگ بسنت

نیست طوطی را بجز کلیاں چو بلبل بر زباں

گل ز شبنم ہار چنبیلی بگردن افگند

نا تواند شد حریف شاہد ہندوستان

سیم و زر را ورم می گیرد زِ چنبیلی و بیل

نرگس از بہر نثار ثانی صاحب قراں

ملا محسن فانؔی نے ہندوستان کی تعریف میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔اس میں بھی مذکورہ بالا قصیدے کی طرح فارسی اشعار میں مقامی ہندوستانی بولیوں کے الفاظ بھی بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ فانی کے اشعار گرچہ فارسی کے ہیں لیکن ہندوی الفاظ کی موجودگی نے انھیں ''ریختہ'' سے قریب کردیا ہے۔اگر اُردو کے لسانی ارتقا کی تاریخ کے حوالے سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ محسن فانؔی سے پہلے امیر خسرو (۱۲۵۳ھ تا ۱۳۲۵) نے عوامی بول چال کی زبان اُردو (ہندی، ہندوی) کو شاعری کی بھی زبان بنانے کے مقصد سے ''ریختہ'' یا ملی جلی زبان کے تین نمونے پیش کئے۔ایک وہ جس میں ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا اُردو یا ہندوی میں ہوتا ہے۔اس ضمن میں خسرؔو کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

شبان ہجراں، دراز چوں زُلف و روز وصلت چوں عمر کوتاہ

سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

دلچسپ بات یہ ہے کہ کشمیر میں بھی اُردو شاعری کے ابتدائی آثار ''ریختہ'' کی ہی شکل میں ملتے ہیں۔اب تک کی تحقیق کے مطابق کشمیر کے جس قدیم ترین شاعر کے یہاں ''ریختہ'' کے نمونے باضابطہ طور پر ملتے ہیں وہ میر کمال الدین حسین اندابی رُسواؔ ہیں۔خواجہ اعظم دیدہ مری کشمیری نے اپنی تصنیف ''واقعات کشمیر'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔

میر کمال الدین حسین رُسواؔ مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر (وفات ۱۷۰۷ء) کے فرزند شہزادہ محمد اکبر کے حلقہ مقربین میں شامل تھے۔لیکن جب بعض مفاد پرست درباریوں کے بہکاوے میں آکر شہزادہ محمد اکبر نے اپنے والد اورنگ زیب کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو میر رُسواؔ کشمیر لوٹ آئے۔میر رُسوا کے خطوط کا مجموعہ ان کے ایک شاگرد لچھی رام ولد ہرداس ملتانی نے ''رُقعات خاتم الکمال'' کے نام سے رُسواؔ کی وفات کے ۴۹ برس بعد ۲۶ جمادی الاول ۱۱۸۱ھ کو تدوین کیا۔(پروفیسر ابراہیم کے مطابق اس مجموعہ خطوط میں فارسی کے کئی فصول کے ساتھ ایک فصل ''ریختہ ہندی'' کے عنوان سے بھی ہے اوراس میں ریختہ کی ایک مناجات اور پانچ غزلیں شامل ہیں۔میر رُسواؔ کے ''ریختہ'' کی لسانی ساخت محسن فانیؔ کے ''ریختہ'' کے مقابلے میں جدید اُردو کی جانب اگلا قدم ہے۔رُسواؔ کے کلام کو کشمیر میں اُردو شاعری اور اُردو غزل کی ابتدائی شکلیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

میر کمال الدین حسن اندرابی رُسواؔ کی مناجات اور غزلوں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اٹھارہویں صدی کے اس کشمیری شاعر کی غزلوں پر امیر خسروؔ کے ''ریختہ'' سے لے کر سترہویں اٹھارہویں صدی کے دکنی شعرا تک کے اثرات ہیں زبان میں ''سیں'' اور ''کوں'' جیسے متروک الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔جو ہمیں قلی قطبؔ شاہ، اور ولیؔ دکنی کی اُردو شاعری میں ملتے ہیں۔

ملا محسن فانیؔ اور میر رُسواؔ کے ساتھ کشمیر کے ایک اور شاعر مرزا عبدالغنی قبولؔ کے یہاں بھی اُردو کے بعض اشعار ملتے ہیں۔میر غلام علی آزادؔ نے اپنی کتاب ''سروآزاد'' میں واضح طور پر لکھا ہے۔

''مرزا عبدالغنی نام قبولؔ تخلص اور کشمیر وطن تھا، شاہ جہاں آباد میں سکونت

تھی۔مرزا جویاؔ کے شاگرد تھے ۱۱۳۹ھ میں انتقال کیا۔''(۸)

قبولؔ کے اُستاد مرزا داراب جویاؔ غنی کاشمیری کے بعد کشمیر کے سب سے بڑے فارسی شاعر مانے جاتے ہیں خود قبولؔ کا شمار اپنے زمانے کے مستند فارسی شعرا میں ہوتا تھا۔

کشمیر میں اُردو شاعری کے ان ابتدائی نمونوں کے حوالے سے اب تک جن شاعروں کا ذکر آیا ہے وہ سب کے سب کشمیرالاصل تھے اور کسی نہ کسی سبب سے ترک وطن کر کے ریاست سے باہر دوسرے شہروں میں آباد ہو گئے تھے۔کشمیر میں اُردو شاعری کے ابتدائی آثار کے حوالے سے روپہ بھوانی کا نام بھی لیا جاتا ہے لیکن ان کے یہاں دوسرے تیسرے درجہ کے ''ریختہ'' کی چند ایک مثالیں تو ملتی ہیں لیکن قابل ذکر اور معیاری ریختہ یا فصیح اُردو اشعار کی نشاندہی ابھی تک نہیں کی گئی ہے۔عبدالاحد آزاد نے اپنی تصنیف ''کشمیری زبان اور شاعری'' کے حصہ دوئم میں روپہ بھوانی کا تعارف کشمیری شاعرہ کے طور پر کروایا ہے۔انہوں نے روپہ بھوانی کے کشمیری کلام کا نمونہ تو دیا ہے لیکن ریختہ کی کوئی مثال پیش نہیں کی ہے۔البتہ محمد الدین فوق نے ''بہار گلشن کشمیر'' کے حوالے سے اپنی کتاب ''خواتین کشمیر'' میں روپہ بھوانی کا ایک فارسی منظوم خط نقل کیا ہے جس کا مطلع ہے۔

بے خوداں ہستند ولادست گاہ

شاہ وقت وصاحب تاج وکلاہ

کشمیر میں اُردو شعر وادب کا باضابطہ آغاز کب ہوا اور اُردو کا پہلا شاعر کسے قرار دیا جائے اس کے بارے میں علما کے درمیان اختلاف ہے عبدالقادر سروری کے مطابق:

''قدیم ترین تحریری اثار جو ہم کو کشمیر میں دستیاب ہوئے ہیں وہ
سترہویں صدی کے اواخر سے تعلق رکھتے ہیں اور عموماً ریختہ
کا انداز رکھتے ہیں۔اس زمانے تک مغل فوجوں کا ربط کشمیر سے قائم

ہو چکا تھا۔سلطان یوسف شاہ چک فارسی کا خوش گوشاعر تھا۔لیکن

اس کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ہندی (اُردو) میں

بھی شعر کہتا تھا''۔(۹)

لیکن یوسف شاہ چک کا مذکورہ اُردو ہندوی کلام دستیاب نہیں ہے۔تازہ ترین تحقیق کے مطابق کشمیر میں اُردو کی قدیم ترین تحریر مشہور کشمیری شاعر محمود گامی کی ایک اُردو غزل ہے۔محمود گامی (پیدائش ۱۷۵۵ء وفات ۱۸۵۵ء) کی یہ غزل کشمیر کے مشہور دانشور غلام نبی خیال کے تحقیقی مقالے''محمود گامی''میں شامل ہے۔پانچ اشعار پر مشتمل یہ غزل ریختہ کے انداز میں ہے اس کا مطلع یہ ہے۔

الحمدالِلہ کہ مرا یار یار اچھا ہے

وز ماہ رُخاں، ماہ من بسیار اچھا ہے

لیکن فارسی، ہندی آمیز اس اُردو غزل کے علاوہ محمود گامی کی کوئی اور اُردو کی تحریر دستیاب نہیں ہے اس کے علاوہ اب نئی تحقیق کے مطابق محمود گامی سے بھی پہلے متحدہ ریاست جموں وکشمیر کے ضلع میر پور کے ایک شاعر غلام محی الدین میر پوری کی مثنوی''گلزار فقیر''کشمیر کی پہلی ادبی تخلیق ہے۔اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۷۱۷ء ہے۔پروفیسر محمد عالم چودھری کے مطابق یہ مثنوی زمیندارہ کالج گجرات (پاکستان) کے پروفیسر احمد حسین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔یہ مثنوی چالیس صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر تیرہ اشعار ہیں۔اس مثنوی کا ذکر حافظ محمود شیرانی (مصنف'' پنجاب میں اُردو'') نے بھی کیا ہے:

''گجرات اور دکن میں اگر چہ اُردو تالیفات دسویں صدی ہجری

سے شروع ہو جاتی ہیں لیکن شمالی ہندوستان میں دو صدی بعد تک

ان کا پتا نہیں چلتا دہلی میں ابھی اُردو دبستان قائم بھی نہیں ہوسکا

تھا کہ پنجاب میں لوگ اُردو زبان میں مثنویاں لکھنا شروع کر دیتے

ہیں۔میر پور(کشمیر)کے شیخ غلام محی الدین، مثنوی ''گلزار فقیر''

۱۱۳۱ھ(مطابق ۱۷۱۷ء)میں ختم کرتے ہیں''۔(۱۰)

حافظ محمود شیرانی نے مثنوی ''گلزار فقیر'' کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ مثنوی نہ صرف یہ کہ متحدہ جموں وکشمیر اور پورے پنجاب بلکہ پورے شمالی ہندوستان کا اولین شعری شاہکار ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ شیخ غلام محی الدین کا تعلق متحدہ کشمیر کے علاقہ میر پور سے تھا جو اب آزاد کشمیر (پاکستانی مقبوضہ کشمیر) کا حصہ ہے۔اس لیے ممکن ہے کہ اس بنا پر شیخ غلام محی الدین کو ریاست جموں وکشمیر کا پہلا شاعر تسلیم نہ کیا جائے اسی طرح محسن فانی،کمال الدین حسینی رُسواؔ،عبدالغنی قبول اور محمد علی حشمتؔ وغیرہ نے بھی کشمیر سے باہر رہ کر شوقیہ طور پر ریختہ میں اشعار کہے تھے اس لیے ممکن ہے کہ ان شعرا کی اُردو شاعری کو بھی کشمیر کی اُردو شاعری کا حصہ تسلیم نہ کیا جائے کیونکہ محمد یوسف ٹینگ جیسے مستند محقق اور نقاد نے ''گلدستہ کشمیر'' کو کشمیر کی پہلی اُردو نثری تصنیف ماننے سے محض اس وجہ سے انکار کیا ہے کہ ہرگوپال خستہ نے ''گلدستہ کشمیر'' کی تصنیف کشمیر سے باہر لاہور میں قیام کے دوران کی تھی ۔ بہر حال اٹھارہویں صدی میں کشمیر میں اُردو کے قدیم شعرا میں افغان دور کے شاعر پنڈت دیا رام خوشؔ دِل کا نام بھی ادبی حوالے سے اہم ہے۔خوشؔ دِل جن کا ذکر بعض لوگوں نے خوش دِل کا چرو کے نام سے بھی کیا ہے اعلیٰ پائے کے شاعر تو تھے ہی اچھے انشا پرداز بھی تھے۔خوش دِل نے اُردو میں قصیدہ مثنوی اور غزل وغیرہ کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔''بہارِ سخن'' اور ''گلزارِ سخن'' ان کے یادگار رسالے ہیں۔

مرزا محمد جان بیگ ساقیؔ بھی افغان دور کے ایک صاحب طرز شاعر تھے۔ان کی شاعری کا انداز بھی زبان و بیان کے اعتبار سے کلاسیکی دور کے غزل گو شعرا سے ملتا جلتا ہے۔ان کے دو شعر تذکروں میں اس طرح ملتے ہیں۔

افسوس کہ اغیار ہوئے یار تمھارے

غماز ہے یہ محرم اسرار تمھارے

مرغان قفس دن کو تڑپتے ہیں لیکن

دن رات تڑپتے ہیں گرفتار تمھارے

اُنیسویں صدی کے آخیر تک رائے مہتا رام، غلام ناصر جراحؔ، شیخ نصیر الدین غریبؔ وغیرہ ریاست جموں وکشمیر کے کئی اُردو شعرا کا کلام ملتا ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخیر میں ایک شاعرہ زینب بی بی مجحوب کا نام آتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صاحب دیوان شاعرہ تھیں اور بیج بہاڑہ کشمیر کی رہنے والی تھیں۔ عبد القادر سروری کے مطابق:

> ''سید محمد انور شاہ........فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے........ان کی صاحب زادی زنیب بی بی مجحوبؔ بھی شعروسخن سے وابستگی رکھتی تھیں لیکن نعت اور منقبت کہتی تھیں۔ انھوں نے اپنے افکار کا ایک مجموعہ ''گلبن نعت'' کے نام سے ۱۲۹۷ء مطابق ۷۸۔۱۸۷۷ء میں مرتب کیا تھا۔ وہ نثر بھی لکھ لیتی تھیں۔ مجحوبؔ نے گلبن نعت کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''اگر چہ طبیعت پہلے سے غزلیات واشعار کی مبدع تھی، لاکن ان کی تشہیر کرنے سے بباعث امتناع والد ماجد کے مجبور اور روکی رہی''۔ (۱۱)

شہمیری اور چک حکومتوں کے زوال کے بعد جب کشمیر پر مغلوں کا تسلط ہوا تو اکبر اور جہانگیر کے عہد کے سر برآوردہ فارسی شعرا، عرفیؔ، فیضیؔ اور انشا پرداز ابو الفضل کا بھی کشمیر سے تعلق رہا۔ اس طرح کشمیر میں فارسی کے حوالے سے اُردو کے نشو ونما کے لئے زمین ہموار ہوتی رہی۔ لیکن صرف فارسی ہی نہیں عربی نے بھی کشمیر میں اُردو زبان کے

فروغ میں بالواسطہ طور پر اہم کردار ادا کیا۔عربی زبان گرچہ راجہ ہرش (۱۰۳۸ءتا ۱۰۸۹ء) کے زمانے سے ہی ریاست میں داخل ہونے لگی تھی پھر چودھویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک کشمیر کی کم وبیش پوری آبادی اسلام کے دائرے میں آ گئی۔کشمیر میں جن صوفیا و بزرگان دین نے فارسی کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کی ترویج و اشاعت کے ضمن میں نمایاں کارنامے انجام دیئے، ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ان کی عربی وفارسی تصنیفات، ان کے ترجمے اور شاعری کے حوالے سے کشمیر کے عوام فارسی کے ساتھ ساتھ عربی الفاظ وتراکیب، ضرب الامثال اورمحاورات سے بھی متعارف ہوئے۔اس لئے اٹھارہویں صدی تک آتے آتے کشمیر کے لوگوں کی بیرون ریاست آمدورفت کافی بڑھ گئی تھی۔اس لئے کہ اس دور تک آکر جموں وکشمیر پنجاب کے سکھ حکمراں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت میں شامل ہو گیا تھا۔سکھ دورحکومت میں کشمیر کے لوگوں کے ساتھ بہت زیادتیاں ہوئیں، ہر طرح کے مظالم ڈھائے گئے انھیں ''بیگار'' پر مجبور کیا گیا۔ان وجوہات کی بنا پر کشمیر میں سکھ حکومت کے خلاف آئے دن احتجاج اور بغاوت کے واقعات ہوتے رہتے تھے لیکن بہت سارے کشمیر چھوڑ کر بھی چلے گئے۔کشمیر کے لوگوں کا پنجاب کے مختلف شہروں لاہور، جالندھر، امرت سروغیرہ میں آنا جانا ایک عام سی بات ہو گئی تھی۔یہ سارے شہر اُردو کے بڑے ادبی مراکز تھے اوران علاقوں کے اکثر ادیب اور شعرا بھی کشمیر آتے جاتے رہتے تھے۔فارسی اور عربی کی طرح کشمیری بھی دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے اور کشمیری کے اکثر حروف بھی عربی اور فارسی سے ہی مستعار تھے اس لیے کشمیر کے لوگوں کو اُردو کو اپنانے میں دُشواری نہیں ہوتی تھی۔اس لئے اٹھارہویں صدی کے آخر تک آتے آتے اُردو صرف کشمیر کی نہیں ہی جموں، لداخ اور دوسرے علاقوں میں مثلاً پونچھ، راجوری، بھدرواہ، کشتواڑ بھی رابطے کی زبان کے طور پر مضبوط و مستحکم ہوتی چلی گئی۔اُنیسویں صدی کے وسط میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ریاست جموں وکشمیر میں نظم ونسق چلانے میں پیش آنے والی دُشواریوں اور آئے دن ہونے والی بغاوتوں کے سبب، اپنی فوج کے ایک ڈوگرہ افسر گلاب سنگھ کو حالات پر قابو پانے کی ذمہ داری سونپی۔گلاب سنگھ کو کامیابی بھی ملی۔اس وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی

برطانوی حکومت کے زیر اثر آ چکے تھے۔ چنانچہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو ’’معاہدہ امرت سر‘‘ کے مطابق گلاب سنگھ نے ۷۵ لاکھ روپئے کے عوض کشمیر کو خرید لیا اور ڈوگرہ راج کی بنیاد قائم کی۔ شیخ محمد عبداللہ نے ’’آتش چنار‘‘ میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بڑے دُکھ کے ساتھ لکھا ہے:

> ’’ایک سو سال قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں کے ہاتھوں کشمیر کا سودا ہوا صرف پچھتر لاکھ نانک شاہی روپئے کے عوض، جو آج برطانوی سکے کے مطابق پانچ لاکھ پونڈ اسٹرلنگ سے بھی کم رقم بنتی ہے۔ کشمیر، اس کے عوام، اس کے سبزہ زار، اور مرغزار اور اس قسم کے تمام وسائل سکھ سلطنت کے ایک باجگزار راجا گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کردئے گئے اس وقت کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین نے اس معاہدے کے سلسلے میں کشمیر کا سودا کرنے کی مزاحمت کی لیکن اسے برطانوی فوج کی مدد سے مطیع بنادیا گیا‘‘۔(۱۲)

راجہ گلاب سنگھ کے عہد میں بھی ریاست کی سرکاری، دفتری اور درباری زبان فارسی ہی تھی۔ لیکن ایک طرف جہاں صوبہ کشمیر میں کشمیری پہاڑی، گریزی بلتی، وغیرہ زبانیں اور بولیاں تھیں وہیں لداخ میں لداخی اور صوبہ جموں میں ڈوگری، گوجری، پہاڑی وغیرہ زبانوں اور بولیوں کا چلن تھا۔ ان سبھی زبانوں کے سرمایہ الفاظ میں فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ شامل ہوگئے تھے۔ دوئم ان زبانوں کا پنجابی اور اُردو سے قریبی تعلق قائم ہو چکا تھا اس لئے جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے سیاسی مصلحتوں اور کاروباری ضرورتوں کے تحت دہلی، لاہور، کی حکومتوں کے ساتھ تعلقات قائم کئے تو پھر سیاسی، انتظامی، تعلیمی اور تجارتی ضرورتوں کے تحت ریاست جموں و کشمیر کے لوگوں کا بھی دہلی، لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، جالندھر، امرت سر وغیرہ شہروں میں آنا جانا شروع ہوا۔ جو ان دنوں (اُنیسویں صدی کے وسط میں) اُردو کے اہم مراکز ہوا کرتے تھے۔ فارسی، عربی اور پنجابی کی شد بد رکھنے والوں کے لئے اُردو سمجھنا اور بولنا مشکل

نہیں ثابت ہوا اور فارسی رسم الخط کی اچھی واقفیت کی وجہ سے اُردو لکھنے اور پڑھنے میں بھی انھیں کوئی دُشواری نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے ریاست سے باہر دہلی، لاہور وغیرہ شہروں میں آتے جاتے رہنے والے ریاستی سیلانی اپنے ساتھ اُردو زبان کے الفاظ، جملے، محاورات اور ضرب الامثال بھی ساتھ لاتے رہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے دربار سے مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھنے والے غیر ریاستی ماہرین اور افسران بھی وابستہ تھے جو اُردو داں تھے۔ اس بات کی تصدیق ڈاکٹر برج پریمی کے اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے۔

''ڈوگرہ عہد میں کچھ عرصہ تک ''نقیبوں'' کو ہندوستان کے مختلف شہروں سے بلا کر اپنے دربار میں اس غرض کے لئے تعینات کیا گیا تھا کہ وہ ڈوگرہ دربار میں مغلئ جاہ وجلال کا سا انداز پیدا کریں۔ چنانچہ جب مہاراجہ دربار میں آتا تھا تو اس کی آمد کا اعلان مغلئ (مغل بادشاہوں کے) انداز سے کیا جاتا تھا۔ ان نقیبوں کے ساتھ ان کے پورے پورے خاندان بھی ہوتے تھے جن کی بول چال اُردو تھی۔ اس طرح سے بھی اُردو زبان کا عمل دخل شروع ہوا''۔ (۱۳)

مہاراجہ گلاب سنگھ مغل بادشاہوں کے نقش قدم پر چلنا باعث فخر سمجھتا تھا۔ اِسی کی بنا پر اس نے نہ صرف فارسی کو درباری زبان بنایا بلکہ مغلوں کے رسوم ورواج اور تہواروں کو بھی اسی طرح منانا شروع کیا جس طرح مغل مناتے تھے جو میلے مغل بادشاہ سجاتے تھے وہ جموں وکشمیر میں بھی منائے جانے لگے۔ مثلاً ''نوروز'' کا تہوار اور ''پھول والوں کی سیر'' کا رواج گلاب سنگھ نے ہی جموں وکشمیر میں شروع کیا۔ ان تہواروں اور میلوں میں بیرون ریاست کے فنکار، گانے بجانے والے، رقاص بازے گر شریک ہوتے جن کی زبان اُردو ہوتی تھی۔ یہ لوگ جموں وکشمیر کے لوگوں

سے اُردو میں ہی باتیں کرتے تھے۔ جموں وکشمیر کے لوگوں کو ان سے تبادلہ خیال میں زیادہ دُشواری بھی نہیں ہوتی تھی۔ گلاب سنگھ کے عہد میں بھی ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی۔ لیکن جموں کشمیر اور لداخ میں ڈوگری، پنجابی کے حوالے سے اُردو قریب تھی۔ ڈوگری کے علاوہ گوجری اور پہاڑی زبانوں میں بھی فارسی، عربی اور پنجابی کے الفاظ کثرت سے ملتے تھے۔ ان زبانوں کی لسانی ساخت اور املا ذرا سے فرق کے ساتھ اُردو کی لسانی ساخت اور املا اُردو سے ملتی جلتی تھی۔ چنانچہ گلاب سنگھ کے عہد میں ہندوستان کی مغلیہ حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم ہونے کے بعد ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے جموں وکشمیر کے ثقافتی رشتے قائم ہوئے۔ جموں وکشمیر سے لاہور، جالندھر، امرت سر، دِہلی، لکھنؤ اور اِلہ آباد جانے اور ان علاقوں سے جموں کشمیر آنے والوں کے تعداد میں بھی لگاتار اضافہ ہوا چونکہ گلاب سنگھ کے اقتدار میں آنے سے پہلے ہی ۱۸۳۲ء میں ہندوستان میں فارسی کی جگہ اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جاچکا تھا اس لئے گلاب سنگھ کی حکومت کے زیادہ تر افسران، اُردو سے نہ صرف واقف تھے بلکہ بہت سارا دفتری کام فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی کرتے تھے۔ جموں آرکائوز میں ایسے بے شمار اشتہارات اور دوسرے کاغذات موجود ہیں جو گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ کے زمانے میں عوام کی معلومات کے لئے جاری کئے جاتے تھے اور جن کی زبان یہی اُردو ہے۔ اس کے علاوہ سکھ دور حکومت میں چونکہ صدر مقام لاہور تھا جو شروع سے ہی اُردو کا ایک بڑا مرکز رہا ہے اس لئے گلاب سنگھ کے عہد میں لاہور اور دوسرے علاقوں کے اخبارات ورسائل جموں وکشمیر میں پہنچتے تھے۔ جموں وکشمیر کے بعض شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات بھی ان میں شائع ہوتی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے بہت پہلے ہی سے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی (حکومت برطانیہ) کے خلاف باغیانہ سرگرمیاں شروع ہوچکی تھیں۔ انگریزوں کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کو دبانے کے لئے دوسرے صوبوں کی طرح ریاست جموں وکشمیر سے بھی فوجی دستوں کو دہلی اور دوسرے علاقوں میں بھیجا جاتا تھا۔ جہاں وہ کافی عرصہ تک قیام کرتے اور چونکہ ان دنوں ہندوستان کے ہر علاقہ میں اُردو رابطے کی زبان

تھی ، اخبارات ، اور رسائل بھی اُردو میں ہی شائع ہوتے تھے اس لیے کشمیری فوجی اُردو سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔اس کے علاوہ گلاب سنگھ کے عہد میں ہی تھیٹر یکل کمپنیاں بھی جموں کشمیر آتی تھیں اور اُردو میں ڈرامے پیش کرتی تھیں۔جموں وکشمیر کے گانے بجانے والے اور بھانڈ وغیرہ گاؤں گاؤں گھوم کر مقامی زبانوں کے علاوہ اُردو میں بھی گیت اور غزلیں گاتے تھے۔لوگ ان گیتوں اور غزلوں کے اشعار سمجھتے بھی تھے اور ذوق وشوق سے گنگناتے بھی تھے۔اُردو قوالی گانے اور سننے کا رواج بھی عام ہونے لگا تھا۔دوسری جانب فورٹ ولیم کالج (قیام ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء) اور دلی کالج (قیام ۱۸۲۷ء) میں جو کتابیں اُردو میں لکھی گئیں یا ترجمہ کی گئیں وہ بھی جموں کشمیر پہنچنے لگی تھیں۔ بلکہ گلاب سنگھ کے اقتدار سنبھالنے سے قبل کے ۴۴۔۱۹۴۳ء کے بعض اُردو مخطوطے بھی دستیاب ہوئے ہیں جو زمین جائزاد (ریوینو) سے متعلق ہیں اس طرح گلاب سنگھ کے عہد حکومت کے خاتمہ ۱۸۵۶ء تک آتے آتے اُردو، ریاست جموں وکشمیر کا تعلیم یافتہ طبقہ میر وغالب کی شاعری، میر امن اور رجب علی بیگ سرور کی نثر سے واقف ہو چکا تھا۔

گلاب سنگھ ۱۸۵۶ء میں خرابی صحت کے سبب حکومت سے دست بردار ہو گئے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۵۷ء میں عنان حکومت سنبھالی۔رنبیر سنگھ کا دور (۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۵ء) نسبتاً پرسکون دور تھا۔اس دور میں بھی گرچہ سرکاری زبان فارسی ہی تھی لیکن اس دور میں اُردو زبان کا فروغ بڑی تیز رفتاری سے ہوا۔

ریاست میں اُردو کا عہد زریں مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۵ء) شمار کیا جا سکتا ہے۔اس عہد اور اس کے بعد یعنی انیسویں صدی کے اواخر تک کشمیر کے اُردو شعرو ادبا کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔ان میں پنڈت ہرگوپال خستہؔ، صادق علی خان۔مرزا مبارک بیگ، مرزا اسعد الدین سعدؔ، راجہ شیر علی خان، تاراچند ترسل۔کاشی ناتھ ترسل خوشتر، منشی سراج الدین، خوشی محمد ناظرؔ، قمر قمرازیؔ، ڈاکٹر عماد الدین سوزؔ، حبیب کیفویؔ، قیس شیروانیؔ، اللہ رکھا ساغر، حمید اللہ نظامی، غلام حیدر چستی وغیرہ ہیں۔مہاراجہ رنبیر سنگھ مغل دربار کے طرز پر اپنے دربار کی شان وشوکت کا

خواہاں تھا۔خاص طور پر اکبر کے طرز پر انہوں نے نورتن مقرر کئے تھے اور مولانا محمد حسین آزاد سے ’’آئین اکبری‘‘ کے طرز پر ’’دربار رنبیری‘‘ لکھنے کی فرمائش بھی کی تھی۔اس طرح ان کے دربار میں مغلیہ انداز پر نقیب اُن کی آمد کا اعلان کرتا تھا۔ان چیزوں سے اُردو کا ذوق پیدا ہونے لگا تھا۔ہر چند کہ گلاب سنگھ کے عہد میں ہمیں اُردو درسگاہوں کی موجودگی کا سراغ ملتا ہے۔لیکن رنبیر سنگھ کے عہد میں اُردو مکتب اور پاٹھ شالے باضابطہ طور پر قائم ہو گئے تھے کیونکہ باہر سے آئے ہوئے علمی گھرانوں کی موجودگی کی وجہ سے ایک رابطے کی زبان کا ہونا از حد ضروری تھا جو کہ صرف اور صرف اُردو ہی ہو سکتی تھی۔حبیب کیفوؔی لکھتے ہیں:

> ’’رنبیر سنگھ کے عہد میں بہت سے علمی گھرانے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے آکر ریاست میں آباد ہوئے اور دربار سے وابستہ ہوگئے۔وہ ریاست میں ظاہر ہے اپنا مافی الضمیر ڈوگری یا کشمیری زبان میں بیان نہیں کر سکتے تھے۔بلکہ اپنی مادری زبان اُردو یا پنجابی میں گفتگو کرتے ہوں گے ایمن آباد کے دیوان خاندان بھی ریاست پر چھا چکے تھے جس کے افراد حکومت کے اعلی مناسب پر فائز تھے اور بڑے علم دوست تھے۔ان کے حاشیہ نشین بڑے علم و فضل کے مالک تھے۔چنانچہ جلد ہی شہر میں مکتب اور پاٹھ شالے کھولے گئے۔جہاں پنجاب کے مکتبوں کے طرز پر فارسی اور اُردو کا نصاب جاری ہوا۔جہاں سرکاری حکم سے بچوں کو تعلیم دلوانے کا سلسلہ شروع ہو‘‘۔(۱۴)

رنبیر سنگھ علم دوست حکمراں تھا اور چاہتا تھا کہ ریاست جموں و کشمیر میں بھی تعلیم عام ہو۔چنانچہ عنان حکومت سنبھالتے ہی اس نے ایک سنسکرت کالج،ایک لائبریری (رنبیر لائبریری) اور جموں میں ایک دارالترجمہ قائم کیا۔اس کے علاوہ رنبیر سنگھ نے انتظامی صورت حال کے بارے میں معلوماتی رپورٹیں بھی تیار کروائیں جو اُردو میں ہی ہیں۔

ان رپورٹوں کو ریاست میں اُردو کے ابتدائی نثری ادبی نمونے قرار دیا جاتا ہے۔ یہ رپورٹیں چودھری شیر سنگھ مہتہ نے تیار کی تھیں۔ رنبیر سنگھ نے شیر سنگھ مہتہ کو کابل، لداخ بخارا کے سفر پر بھی بھیجا تاکہ راستوں کے بارے میں تفصیلات مہیا ہوسکیں۔ شیر سنگھ مہتہ نے اپنا سفرنامہ اُردو میں لکھا۔ ڈاکٹر برج پریمی کے مطابق:

> ''چودھری مہتہ شیر سنگھ نے ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۶ء کے دوران بخارا کا سفر کیا۔ واپسی پر اس نے اُردو میں اپنا سفرنامہ قلم بند کیا۔ یہ ریاست میں سرکاری طور پر پہلی اُردو تحریر تسلیم کی گئی ہے۔ ۱۵۰ صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ بڑا دلچسپ ہے''۔(۱۵)

لیکن شیر سنگھ مہتہ نے سفرنامہ کے علاوہ بھی اور کئی کتابیں اُردو میں لکھیں جو اس طرح ہیں۔

۱۔ حوال ملک لداخ: یہ کتاب ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوئی جس میں لداخ کے لوگوں کے سماجی وتہذیبی حالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ ترجمہ بھگوت گیتا

۳۔ ترجمہ۔تاریخ انگلستان

اس زمانے میں جو دوسری رپورٹیں اور معلومات وغیرہ بھی اُردو میں ہی لکھی اور شائع کی جاتی تھیں کیونکہ جموں وکشمیر کے عام اور خاص لوگ فارسی رسم خط سے ہی واقف تھے، سرکاری دفاتر میں بھی انگریزی اور فارسی کی بجائے اُردو کا ہی چلن زیادہ ہوگیا تھا۔ رنبیر سنگھ کے زمانے میں اُردو عوامی رابطے کی زبان Lingua Franka بن چکی تھی لہٰذا اُردو کی علمی، ادبی اور انتظامی افادیت کے پیش نظر ریاست میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنادیا گیا ساتھ ہی دفتروں اور عدالتوں کی زبان بھی اُردو ہوگئی۔ کشمیر کے ایک مشہور شاعر قیصر قلندر نے ''کشمیر میں اُردو'' کے عنوان سے اپنے مضمون ایک (مطبوعہ شاعر بمبئی ۱۹۶۱ء) میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت سے آج تک اُردو زبان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم رہی ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان کو فروغ دینے میں مہاراجہ

رنبیر سنگھ کے قائم کیئے ہوئے ''دارالترجمہ'' کا بڑااہم کردار رہا ہے۔ عبدالقادر سروری کے بقول:

''اس دارالترجہ کے ناظم پنڈت گنیش کول مقرر ہوئے تھے۔
دارالترجمہ کے انتظام کے بارے میں اب تک کوئی تفصیلات
دستیاب نہیں ہوئیں۔ اتفاق سے حکومت کی نظم ونسق کی ایک
رپورٹ میں جو ۱۸۸۳ء۔۱۸۸۲ء سے متعلق اُردو میں لکھی
گئی ہے ایک اندراج ملتا ہے جس سے اس کے ایک سال
کے اخراجات ترجمہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۴۵۰۲ روپیہ اجرت
ترجمہ پر اس سال صرف ہوا، اور سال حال میں کوئی کتاب
جو انگریزی سے شاستر اور شاستری سیبھا شا اور عربی سے اُردو
میں ترجمہ ہوئی ہیں ختم نہیں ہوئی ہیں لہٰذا ان کی تفصیلی رپورٹ
سال آئندہ میں درج ہوگی''۔(۱۶)

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے جانشین مہاراجہ شری پرتاپ سنگھ کو ان امور سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے یہ ادارہ بند ہو گیا۔ اور اس کا سارا ذخیرہ ریسرچ لائبریری سرینگر میں منتقل کر دیا گیا۔ لیکن اس منتقلی کے سلسلے میں احتیاط ملحوظ نہ رکھنے سے اور منتقل کرنے والوں کو اس عظیم کام کی اہمیت کا اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے کئی مخطوطات ضائع ہو گئے۔ جو بچ گئے وہ اب ریسرچ لائبریری میں رنبیر کلکشن کے زیر عنوان محفوظ ہیں۔ ان مخطوطات کی ترتیب میں لائبریری کے سابق ناظم صاحبزادہ حسن شاہ کی دلچسپی شامل رہی۔ (یہ سارے مخطوطات اب کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ تحقیقات میں منتقل کر دئے گئے ہیں)

رنبیر کلکشن میں مخطوطات کی بڑی تعداد علم طب سے متعلق ہے، اور یہ زیادہ تر انگریزی کے ترجمے ہیں، کچھ

عربی اور فارسی کے ترجمے بھی اُردو اور مقامی زبانوں میں کئے گئے ہیں۔ طب میں میٹریا میڈیکا، علم تشریح، امراض اطفال، علم قابلہ پر کئی ترجمے ہوئے تھے۔ طب کے علاوہ ایک دو مخطوطات انجینئری اور فن حرب سے متعلق ہیں ایک رسالہ منطق پر کارآمد فنون کا غذ سازی اور طباخی پر بھی ایک ایک رسالہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ اور مشاہیر مذہب کے بارے میں بھی مخطوطات ہیں۔

مخطوطہ نمبر ۱۹۰، ۱۹۱ اور ۴۱۲، ''میٹریا میڈیکا'' کے موضوع پر انگریزی کی کتابوں کے اُردو ترجمے ہیں۔ ان ترجموں میں انگریزی کی اصطلاحیں جوں کی توں رکھی گئی ہیں البتہ انھیں اُردو (فارسی) رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ ایک مخطوطہ نمبر ۴۵۸ اناٹومی (Anatomy) کے موضوع پر ہے اس کی دو جلدیں ہیں ایک اُردو میں اور دوسری دیوناگری میں ہے۔ تعریف علم تشریح اور تعریف فزیالوجی (Physiology) کے نام سے بھی دو مخطوطات ہیں لیکن ان میں مترجم کے نام اور تاریخ ترجمہ وغیرہ نہیں ہیں۔ ایک مسودہ امراض کے بارے میں دو جلدوں میں ہے۔ اس کے مترجم حکیم فدا محمد خاں ہیں۔ ایک جلد اُردو میں ہے اور دوسرا دیوناگری میں ان پر مخطوطہ کے طور پر ۱۹۰۔ اور ۱۹۱ نمبر درج ہے۔ ایک مخطوطہ (نمبر ۳۹۸) ''اسباب امراض والعلاجات'' کے نام سے اُردو اور دیوناگری دونوں خطوں میں ہے۔ اس کے مرتب وسنت رائے ہیں ''علاج الامراض'' (مخطوطہ نمبر ۱۹۴) کے نام سے ایک مخطوطہ بسنت رائے اور فضل الدین نے مشترکہ طور پر ترجمہ کر کے ترتیب دیا ہے۔ لیکن دیباچے میں ترجمہ کے لئے ایک ڈاکٹر مرزا میر بیگ سے ملنے والی مدد کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ امراض کے علاج کے لئے حکیم فضل الدین کی تجویزوں کا بھی بیان ہے۔ ''تشریح البدن'' (مخطوطہ نمبر ۱۹۸) بھی بسنت رائے کا کیا ہوا ترجمہ شدہ مخطوطہ ہے۔ ایک اُردو رسالہ ''ہدایت الاطبا'' کے نام سے بھی موجود ہے۔ اس مخطوطے کا نمبر ۱۹۲ ہے یہ ایک خطبہ ہے جو غالباً ''مدرسہ طبیہ'' سے فارغ ہونے والے طلبا کے لئے دیا گیا تھا۔

رنبیر کلکشن میں طب (Medical scince) کے علاوہ انجینئر نگ اور فن حرب وغیرہ موضوعات پر بھی

کئی مخطوطے موجود ہیں ۔ایک مخطوط (نمبر ۴۳۸)''مورچہ بندی کے نام سے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہوا ہے۔اس کے مترجم پنڈت بخشی رام ہیں ۔اس کتاب میں فوجوں کی مورچہ بندی کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔اسی سلسلے کی ایک کڑی رسالہ''علم تیراندازی''(مخطوطہ نمبر(۴۳۵) بھی ہے۔یہ رسالہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی فرمائش پر غلام غوث خاں نے لکھا تھا۔اس کے علاوہ''فن کاغذ سازی''(مخطوطہ نمبر۴۴۴) تذکرہ حالات انبیا(مخطوطہ نمبر۴۳۷)، ذکراولیائے ہنود''(مخطوطہ نمبر ۴۵۶)،آخراند کر مخطوطہ نابھ داس کی کتاب''بھگت مال'' کا ترجمہ ہے۔لیکن مترجم کا نام درج نہیں ہے۔ایک مخطوطہ''کتاب کبریٰ اور علم منطق کے نام سے ملتا ہے اور غالباً عربی یا فارسی سے بیک وقت سنسکرت اور اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے (مخطوطہ نمبر ۴۲۶) ۔ انگریزی رسالہ A,Hand book of Kashmir کا اُردو ترجمہ بابونصر اللہ عیسائی نے''تاریخ رہنمائے کشمیر''(مخطوطہ نمبر۴۴۳) کے نام سے ۱۸۷۴ء میں کیا تھا جس میں وادی کشمیر کی تفصیل بیان کی گئی ہے ۔اسی طرح دوردراز علاقہ لداخ کے حوالے سے وہاں کے چرندو پرند اور پھل پھول وغیرہ کے بارے میں''پیداوار و جانوران لداخ''کے نام سے بھی ایک رسالہ ۱۸۸۵ء کا مرتب کیا ہو بھی دستیاب ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سرکاری رپورٹوں اور دارالترجمہ میں تیار ہونے والی کتابوں کی اشاعت کے لئے ۱۸۸۲ء میں''بدیابلاس پریس''کے نام سے ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا، دارالترجمہ میں سنسکرت اور عربی فارسی سے اُردو اور ہندی میں ترجمہ شدہ کئی کتابیں اسی بدیا بلاس پریس سے شائع کی گئیں ۔اس طرح اُردو میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہونے سے بھی ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کے فروغ میں بہت مدد ملی ۔اس دور کی کئی مطبوعہ اُردو کتابیں اور مسودے رنبیر لائبریری جموں میں موجود ہیں۔اس دور میں کتابوں کے ترجمے اور مسودوں کی تیاری میں غلام غوث خاں ، پنڈت بخشی رام ،مولوی فضل الدین اور لالہ بسنت رائے وغیرہ کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔ان حضرات نے طب (میڈیکل سائنس) انجینئرنگ ،علم منطق ،تاریخ ، مذہبیات ، کاغذسازی ،فزیالوجی ،علم

الامراض، اور علم الاجسام (Anotomy) وغیرہ موضوعات سے متعلق مسودات ترجمہ کئے۔ڈاکٹر پریمی کے مطابق ان کتابوں کی زبان صاف اور سلیس ہے اور ان میں کہیں ادبی چاشنی بھی ہے۔مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ریاست میں اردو کی مقبولیت، عوامی ضرورت اور مزاج کو دیکھتے ہوئے ''بدیا بلاس'' کے نام سے سے ایک اخبار بھی جاری کیا جو بیک وقت اُردو اور دیوناگری دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔اس اخبار کی وجہ سے بھی ریاست میں اُردو زبان کے فروغ میں مدد ملی۔لیکن اُردو زبان کی اس مقبولیت کے باوجود مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں فارسی ہی سرکاری زبانئز کے منصب پر فارہی البتہ دفتری کام کاج زیادہ تر اُردو اور انگریزی میں ہی ہوتا تھا۔لیکن ۱۸۸۵ء میں جب رنبیر سنگھ فوت ہو گئے اور مہاراجہ پرتاب سنگھ تخت نشین ہوئے تو اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔لیکن جموں وکشمیر میں اُردو کو کب سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اس کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔محمد یوسف ٹینگ کے مطابق ۱۸۸۵ء میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنایا گیا۔ برج پریمی نے ۱۸۸۹ء لکھا ہے جبکہ بلدیو پرشاد شرما نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ شیرازہ ۱۹۸۸ء) میں لکھا ہے کہ ریاست میں ۱۸۸۶ء میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔لیکن زیادہ معتبر پریم ناتھ بزاز اور اقبال ناتھ بٹ ونپو کی تحقیق ہے۔ان کے مطابق جب پرتاپ سنگھ کو وائسرائے ہند نے ایک سازش کے تحت گدی سے ہٹا دیا اور حکومت کا کام ایک انگریز ریذیڈینٹ اور اسٹیٹ کونسل کو سونپا تو انگریزی نے فارسی کی جگہ لے لی۔جب کچھ عرصے کے بعد پرتاپ سنگھ کو حکومت واپس ملی تو اس نے انتقامی جذبے کے تحت انگریزی کو ہٹا کر اُردو کو سرکاری زبان بنایا۔اس کی تائید ڈاکٹر جی، ایم۔ڈی صوفی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ اُردو کو سرکاری زبان بنانے سے ریاستی ملازمتوں میں بیرونی ہندوؤں کی بھرمار ہوئی۔جس پر احتجاج کے نتیجے میں ''سٹیٹ سبجکٹ'' ملازمتوں کے حصول کے لئے ضروری قرار دیا گیا۔

گویا انتقامی جذبے کے تحت اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اس کے ردعمل کے طور پر سٹیٹ سبجکٹ قانون یہاں لاگو کیا گیا۔یہ بات اس سے بھی عیاں ہے کہ پرتاپ سنگھ اُردو کا غمخوار نہ تھا کیونکہ اس کے

زمانے میں سرکاری سطح پر اُردو کی ترویج کا کوئی خاص کام نہ ہوا۔ یہاں تک کے رنبیر سنگھ کا ''دارالترجمہ'' بھی اس عہد میں بند ہو گیا۔ جو شخص اُردو کے تئیں اتنا بے مروت ہو اس سے کس طرح یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ تخت نشینی کے فوراً بعد اس کو سرکاری زبان بنائے۔

بہر حال ریاست جموں و کشمیر اور لداخ کے تمام علاقوں میں اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ کرنے میں تھوڑا وقت لگا۔ ڈاکٹر نذیر آزاد کے مطابق ۱۹۰۰ء تک اُردو صرف صوبہ جموں تک بحیثیت سرکاری زبان رائج تھی۔ ۱۹۰۰ء کے بعد اُردو پوری ریاست کی سرکاری زبان بن گئی۔ موتی لال ساقی کے مطابق ۱۹۰۰ء کے بعد سرکاری دربار میں اُردو کا چلن ہوا ۱۹۰۰ء کے بعد ہی اُردو، پٹوار خانے (ریوینو) عدالتوں، سرکاری اداروں اور خط و کتابت کی عام زبان بن گئی۔ محمد یوسف ٹینگ نے بھی لکھا ہے کہ:

> ''بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں عدالت عالیہ کے جج، پنڈت بھاگ راج نے دربار کی منظوری سے حکم صادر کیا کہ ''جموں و کشمیر کی عدالتوں میں فارسی کی جگہ اُردو میں کام کاج ہو''۔ (۱۸)

راجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں اُردو زبان و ادب کا تیز رفتاری سے فروغ ہوا۔ جموں و کشمیر کے تمام مذاہب کے لوگوں کی رابطے کی اور ادبی و علمی اظہار کی زبان بھی اُردو ہی تھی۔ چنانچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے جموں میں جب سرکاری سرپرستی میں ''سناتن دھرم سبھا'' قائم کی تو اس کے تحت، عیسائیت کے تبلیغ کا جواب دینے کے لئے کئی کتابچے اُردو میں ہی لکھے گئے۔ یہ کتابچے سالگ رام سالک نے لکھے تھے ان کی کئی اُردو کتابوں کا ذکر مورخین نے کیا ہے۔ مثلاً

۱۔ مورتی منڈن

۲۔ دھرم اُپدیش

۳۔ ارتھ شاشتر

۴۔ لغت اُردو

۵۔ محاورات اُردو وغیرہ۔

سالک کی ایک کتاب ''داستان جگت روپ'' بھی ہے جسے ابتدائی ناول بھی کہا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ بھی سالک کی اور کئی کتابیں جن کا ذکر تفصیل سے اگلے باب میں آئے گا۔لیکن یہاں مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد کی ایک مشہور کتاب ''گلدستہ کشمیر'' کا ذکر ضروری ہے۔سالک رام کے بڑے بھائی پنڈت ہرگوپال کول خستہ، کشمیر کے حالات سے تنگ آ کر لاہور چلے گئے تھے جہاں انھوں نے ریاست جموں وکشمیر کے جغرافیائی محل وقوع ، تاریخی حالات،عوام اور رسوم ورواج وغیرہ کے بارے میں ایک کتاب ''گلدستہ کشمیر'' کے نام سے لکھی جو پہلی بار ۱۸۷۷ء میں لاہور سے ہی شائع ہوئی ۔ یہ نسخہ اب نایاب ہے ۔ دوسری بار ۱۹۸۶ء میں اسے شیخ غلام اینڈ سنز مائسمہ بازار سرینگر نے شائع کیا۔لیکن اب اس کتاب کا یہ ایڈیشن بھی نایاب ہے پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے ایک حالیہ مضمون (مطبوعہ،اُردو دنیا دہلی جنوری ۱۹۱۳ء) میں گلدستہ کشمیر کو کشمیر کی پہلی باضابطہ نثری تصنیف قرار دیا ہے۔گلدستہ کشمیر میں ابتدا سے لے کر پرتاپ سنگھ کے عہد تک کی تاریخ پیش کی گئی ہے ہرگوپال خستہ نے ''گلزار فوائد'' کے نام سے ایک قصہ لکھا ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے پہلے ناول ''مراۃ العروس'' کا تتبع کیا گیا ہے۔اس کی زبان گلدستہ کشمیر سے زیادہ صاف، سلیس اور رواں ہے۔اُنیسویں صدی کے آخیر تک آ کر اُردو متحدہ جموں وکشمیر (بشمول لداخ و گلگت) کے ہر علاقے کے لوگوں کے رابطے کی زبان، تعلیم کی زبان اور تصنیف وتالیف کی زبان بن چکی تھی ۔ چونکہ ڈوگرہ حکومت میں پریس قائم کرنے اور اخبار ورسالہ جاری کرنے پر پابندی تھی اس لئے کشمیر کے ادیب اور صحافی لاہور، جالندھر، امرت سر اور دوسرے شہروں سے اخبار اور رسائل شائع کئے۔کشمیر کے اخبارات میں سے چند ایک کے نام اس طرح ہیں۔اخبار عام، خیر خواہ کشمیر، ہمدرد ہند، کشمیری گزٹ، کشمیری میگزین، کشمیری مخزن، صبح کشمیر، بہار

کشمیر، ہنجہ فولاد، وغیرہ ۱۹۰۳ء میں لداخ سے بودھی زبان میں ایک پرچہ ’’لداخ چھوگیاں‘‘ کے نام سے پادری جے۔اے۔پیٹر نے جاری کیا تھا،لیکن بیسویں صدی میں جموں وکشمیر سے پہلا باضابطہ اخبار ’’رنبیر‘‘ ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا جب ڈوگرہ حکومت نے بڑی مشکلوں سے اخبار جاری کرنے کی اجازت دی۔رنبیر کے اڈیٹر ملک راج صراف تھے۔رنبیر کا پہلا شمارہ ۲۴ جون ۱۹۲۴ء کو شائع ہوا اس کے بعد ۱۹۳۲ء کے آس پاس کشمیر سے وتستا صداقت، مارتنڈ، وکیل، حقیقت، خالد، خدمت، ہمدرد وغیرہ متعدد اخبارات جاری ہوئے۔ان اخبارات میں ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔اس سے کشمیر، جموں، لداخ اور دوسرے سبھی علاقوں میں اُردو زبان وادب کے فروغ میں کافی مدد ملی۔آزادی کے بعد متعدد اخبارات اور رسائل جاری ہوئے۔ان میں سے کئی آج بھی شائع ہورہے ہیں۔آج کی تاریخ میں، کشمیر (جموں وکشمیر) سے شیرازہ، حکم الامت، تعمیر، بزم ادب، تفہیم وغیرہ ادبی رسالے شائع ہورہے ہیں۔آفتاب، کشمیر عظمیٰ، اطلاعات، اُڑان، سرینگر ٹائمز، تسکین، ہندوستان چٹان وغیرہ سینکڑوں روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات شائع ہورہے ہیں۔ان اخباروں میں ادبی تخلیقات، تحقیقی وتنقیدی مضامین، کالم وغیرہ بھی شائع ہوتے ہیں۔حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ پروفیسر ظہوالدین، عرش صہبائی، سلطان الحق شہیدی، مظفر ایرج، شبیب رضوی کے علاوہ سینکڑوں شاعر وادیب اپنی نگارشات کے ذریعے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان اور شعروادب کو پروان چڑھانے میں مصروف ہیں۔چونکہ اُردو ریاست کی سرکاری، درباری، دفتری اور کاروباری زبان بھی ہے اور ذریعہ تعلیم بھی ہے۔پوری ریاست میں ہزاروں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹوں میں اُردو تعلیم کا انتظام ہے۔کشمیر اور جموں میں لیہہ لداخ میں ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ٹیلی ویزن سینٹر ہیں۔جہاں سے اُردو کے پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں۔دیکھا جائے تو اُردو زبان نے ڈیڑھ دوسو برسوں میں جموں وکشمیر ولداخ میں اتنی ہی ترقی کر لی ہے جتنی کہ برصغیر ہند کے دوسرے ادبی مراکز لاہور، حیدرآباد، دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کو بعض مسائل کا سامنا ضرور ہے لیکن اِس ریاست میں اُردو کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ جموں وکشمیر میں

اُردو کا مستقبل شاندار اور محفوظ ہی نظر آتا ہے۔

(ب): صوبہ جموں میں اُردو زبان کا آغاز و ارتقاء

اُردو زبان نے ریاست میں سب سے پہلے صوبہ جموں میں اپنے بال و پر نکالے۔ جموں میں ڈوگرہ راج کے بانی گلاب سنگھ کے جانشین رنبیر سنگھ (۸۵۔۱۸۵۷ء) کا عہد حکومت اُردو زبان و ادب کے فروغ ارتقا کے حوالے سے دورِ زریں کہلاتا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے وزیر اعظم دیوان کرپارام نے جو کئی فارسی کتابوں کے مصنف تھے۔ انھوں نے ریاست کی انتظامی صورت حال کے بارے میں اُردو میں رپورٹیں لکھوا کر شائع کروائیں جنھیں ریاست میں اُردو کے ابتدائی نمونے قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد حکومت کے خاتمے سے پہلے بوٹا مل نامی ایک شخص نے ''چائے کی کاشت'' کے بارے میں ایک رسالہ ۱۸۵۷ء میں لکھا تھا جسے اب جموں (جموں و کشمیر) کی پہلی اُردو تحریر قرار دیا جا رہا ہے۔ رنبیر سنگھ نے ۱۸۸۲ء میں ''بدیا بلاس'' کے نام سے ایک پریس قائم کیا۔ اور اسی سال ''بدیا بلاس'' کے نام سے ہی جموں و کشمیر کا پہلا اخبار یا خبر نامہ جاری کیا۔ رنبیر سنگھ نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا جس کے تحت غلام غوث خاں، پنڈت بخشی رام، مولوی فضل الدین، لالہ بسنت رائے وغیرہ نے مختلف موضوعات پر کتابوں کے ترجمے اُردو اور ہندی میں کئے اور کئی مسودے بھی تیار کئے جو فی الوقت کشمیر یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری (اقبال لائبریری) میں دستیاب ہیں۔ رنبیر سنگھ کے ایک عہدہ دار چودھری شیر سنگھ مہتہ نے ۶۵۔۱۸۶۴ء میں بلخ، بخارا اور سمرقند وغیرہ علاقوں کا سفر کیا اور واپسی پر اپنا سفر نامہ اُردو میں لکھا۔ رنبیر سنگھ کی ۱۸۸۵ء میں وفات ہوگئی اور پرتاپ سنگھ برسر اقتدار آیا جس نے اقتدار سنبھالتے ہی اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ پرتاپ سنگھ کے زمانے کے اُردو ادیبوں اور شاعروں میں پنڈت ہرگوپال خستہؔ، پنڈت سالگرام سالکؔ کے نام اہم ہیں۔ پنڈت ہرگوپال خستہؔ کی تصنیف ''گلدستہ کشمیر'' مشہور ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۷۷ء میں لاہور سے اور دوسری بار ۱۹۸۶ء میں سرینگر سے شائع ہوئی۔ خستہ نے گلدستہ کشمیر کے علاوہ بھی چند اور کتابیں لکھی ہیں مثلاً

''گوپال نامہ''، ''چہارگلزار''، ''شگفتہ بہار''،مخزن خستہ''اور''سوانح عمری خستہ''وغیرہ۔

اسی طرح پنڈت ہرگوپال خستہ کے بھائی سالگرام سالک نے بھی اُردو میں کئی کتابیں لکھیں مثلاً ''داستان جگت روپ''، ''دھرم اُپدیش''، ''تغریرات جموں وکشمیر''، ''ارتھ شاشتر''۔ ''مورتی منڈن''اور''تحفہ سلک''وغیرہ ان دونوں بھائیوں کا ذکر جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے آغاز وارتقا کے حوالے سے گذشتہ صفحات پر کیا جا چکا ہے۔ان دونوں بھائیوں نے اُنیسویں صدی کے اخیر میں لاہور سے کئی اخبارات اور رسالے بھی جاری کئے۔مثلاً ''ریفارمر''، ''خیرخواہ کشمیر''اور''دیش کی پکار''وغیرہ۔

اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں کشمیری نژاد ادیب،محقق اور نقاد محمد الدین فوق کے اُردو کارنامے سامنے آتے ہیں۔کئی بار کی گذارش کے باوجود فوق کو کشمیر سے اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں ملی تو انھوں نے لاہور سے ہی وقتاً فوقتاً کئی اخبارات جاری کئے مثلاً ''کشمیری''، ''پنجہ فولاد''وغیرہ۔لاہور کے اخبارات جموں تک براہ راست دستیاب ہوتے تھے۔فوق نے ۱۹۰۰ء میں اُردو میں ''انارکلی'' کا قصہ لکھا۔ اس کے علاوہ ''غریب الدیار''اور''نیم حکیم'' کے نام سے دو قصے بھی لکھے جنھیں ابتدائی ناول کہا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ تاریخ اقوام کشمیر،خواتین کشمیر، وغیرہ بھی فوق کی یادگار تصنیفات ہیں۔ان میں جموں سمیت پوری ریاست کی اقوام اور خوتین کا ذکر ہے اس لئے جموں میں اُردو زبان وادب کے ارتقا کے حوالے سے بھی ان تصنیفات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

رنبیر سنگھ کے زمانے میں ایک ادبی اور ثقافتی انجمن ''بدیابلاس سبھا'' کے نام سے قائم ہوئی تھی جس میں اُردو، ہندی، فارسی،عربی اور ڈوگری زبانوں کے ادیب،شاعر اور دانشور شریک ہوتے تھے۔اس سبھا کی نشست ہر ہفتہ ہوتی تھی۔اور اس میں اکثر خود مہاراجہ بھی شریک ہوتے تھے۔اس کے علاوہ دیوان کرپا رام کے علاوہ جو دانشور شریک ہوتے تھے۔ان میں ڈوگرہ دربار سے وابستہ بیرون ریاست کے دانشوروں میں جئے پور کے برج لال،

بنگال کے رام بھون بھٹا چاریہ، بنارس کے پنڈت بنکٹ رام شاشتری، لالہ گلاب رائے، غلام غوث ہوشیار پوری اور کیف الدین وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ ''بدیابلاس سبھا'' کے ترجمان کے طور پر ہی ایک اخبار (اُردو اور دیوناگری میں) بدیابلاس کے نام سے ہی شائع ہوتا تھا۔ بدیابلاس سبھا اور بدیابلاس اخبار نے صوبہ جموں میں اُردو زبان وادب کے فروغ میں اہم ترین کردار ادا کیا۔

مہاراجہ کے دربار اور بدیابلاس سبھا سے باہر بھی کئی دانشوروں نے اُردو میں ترجمہ، تالیف اور تصنیف کے کام انجام دئے۔ ان میں سے چند ایک اس طرح ہیں۔

۱۔ رسالہ مور چہ نما ـــــ یہ کتاب انجنیئر نگ کے موضوع پر ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ بخشی رام پنڈت نے یہ ترجمہ ۱۸۶۸ء میں کیا۔

۲۔ تحریک انگلستان ـــــ انگلینڈ کی تاریخ کی انگریزی کتاب کا اُردو ترجمہ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے مسودے میں مصنف، مترجم اور تاریخ طباعت وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔

۳۔ الف لیلہٰ ـــــ مشہور عربی داستان الف لیلہٰ کا ترجمہ لکھنؤ کے مفتی عبدالکریم نے ۱۸۴۲ء میں الف لیلہٰ سے نام سے جموں میں ترجمہ کیا۔

ان کے علاوہ بھی انیسویں صدی کے آخیر میں صوبہ جموں کے مختلف علاقوں مثلاً کشتواڑ، راجوری، پونچھ، اُودھم پور، میر پور وغیرہ میں متعدد شعرا اور نثر نگار ہوئے ہیں جن کی نگارشات لاہور، امرت سر وغیرہ سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ اُنیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل تک ریاست جموں وکشمیر سے کسی بھی زبان میں نہ تو کوئی اخبار جاری ہوا نہ ادبی رسالہ۔ پھر بھی جموں میں اُردو شعر وادب کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔ بدیابلاس کے بعد ۱۹۱۱ء میں ''ڈوگرہ گزٹ'' اور ۱۹۱۲ء میں ''مہاجن نیتی پتر'' کے نام سے دو نیم ادبی نیم سیاسی اخبارات جاری ہوئے۔ لیکن ان کا حلقہ محدود تھا۔ لیکن جموں کے ایک معتبر اُردو دانشور ادیب اور صحافی

ملک راج صراف نے جموں کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے ایک انجمن ''بزم سخن'' کے نام سے ۱۹۱۲ء میں قائم کی۔ اس انجمن نے جموں میں اُردو و ادب کے فروغ میں نمایاں کارنامے انجام دئے۔ ابتدا میں اس انجمن کی نشستیں مہینے میں دوبار غلام حیدر چشتی کے گھر پر ہوا کرتی تھیں۔ ان نشستوں میں جموں کے شعرا اپنی شعری تخلیقات پیش کیا کرتے تھے۔ عام طور پر بزم سخن کی محفلوں میں مصرعہ طرح پر غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ اس بزم سخن کا نام بعد میں بدل کر ''بزم اُردو'' کر دیا گیا۔ اس کی نشستوں میں شعری تخلیقات کے علاوہ افسانے، انشائیے، مضامین وغیرہ بھی پڑھے جانے لگے۔ بزم سخن کی جانب سے اکثر مشاعرے بھی کروائے جاتے تھے۔ ایک کل ہند مشاعرہ ۱۹۲۷ء میں جموں میں منعقد ہوا جس کی صدارت رچھپال سنگھ شیدؔا نے کی اس مشاعرے میں حفیظ جالندھری، ہری چند اختر، موہن لال ساحرؔ، اثرؔ صہبائی جیسے شاعروں کے علاوہ مقامی شاعروں نے بھی اپنے کلام پیش کئے بزم اُردو کے دوسرے مشاعرے میں چودھری خوشی محمد ناظر، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، یاس یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، جگر مرادآبادی، احساس دانش ڈاکٹر محمد دین تاثیر، نواب جعفر علی خاں اثر، اور فیض احمد فیض وغیرہ بیرونی شاعروں نے شرکت کی۔ جموں کے اکثر و بیشتر شاعروں نے جوش ملیح آبادی اور سیماب اکبرآبادی کی شاگردی اختیار کی اور ان سے اصلاح لیتے رہے۔ اس دوران جموں سے کئی اُردو اخبارات اور رسائل کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ریاست جموں و کشمیر سے پہلا اُردو اخبار ۲۰ جون ۱۹۲۴ء کو ''رنبیر'' کے نام سے جاری ہوا جس کے مدیر ملک راج صراف تھے اخبار ''رنبیر'' ڈوگرہ راج کی مداحی کرتا تھا لیکن اس میں ادبی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس اخبار کے سرنامے میں دو اشعار درج ہوتے تھے۔

مل جل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں

بلبل ہیں جس چمن کے، گیت اس چمن کے گائیں

اظہار حال ملکی خاص اس کا مدعا ہے

رنبیر نام کا یہ ’’ جام جہاں نما‘‘ ہے

یہ دور جنگ آزادی میں شدت اورفرقہ وارانہ اتحاد کی ضرورت کا دور تھا چنانچہ اس دور میں یعنی بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے کم وبیش تقسیم ملک تک جموں میں جو ادب تخلیق ہوا، وہ قومی ، اصلاحی اور انقلابی نوعیت کا ادب ہے ۔جن شاعروں اور ادیبوں نے خاص طور پر جموں میں اُردو شعر و ادب میں رنگا رنگ اضافے کئے ۔ان کی فہرست بہت طویل ہے لیکن چند نام ایسے ہیں جنھیں کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ان میں خاص طور پر کشن سمیل پوری، کشن العل حبیب ،سید ذوالفقار علی نسیم ، پنڈت امرناتھ، بشارت فارانی، لالہ روپ چند شوق، غلام حیدر چشتی ،قیس شیروانی ، ہدایت اللہ فوقؔ ،عبدالمجید نظامی ، پنڈت شام لعل کول بصرؔ ، امام الدین سوزؔ ،موہن لعل متیال ، رسا جاودانی ، لاغر جموی ، غلام رسول کامگار ، ،ہنس راج بالی ،محمد عمر ،نور الٰہی ،کیفی اسرائیلی ،نرسنگھ داس نرگس ، اللہ رکھا ساغرؔ ،قدر اللہ شہاب ،حنیف ہاشمی ،جگدیش کنول اور رام کشن غافلؔ جموی ، وغیرہ کے نام بے حد اہم ہیں ۔اس دور میں جموں میں اُردو شاعری کا کیا مزاج اور معیار تھا اس کا اندازہ چند مثالوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

تنگ آ گیا ہوں گردش لیل و نہار سے
جی چاہتا ہے پھونک دوں امن واماں کو میں

دیا شنکر سیماب

نہ ملت بت پرستوں سے، نہ ربط اللہ والوں سے
پڑا پالا ہے یاران وطن کو کن خیالوں سے

کہاں خرانٹ یورپ کے کہاں یہ ہند کے بچے
عزیزو تم ابھی واقف نہیں ہو ان کی چالوں سے

بدری ناتھ وکیل

تن من سے اپنی قوم کی سیوا جو کرے گا
نظروں میں عاقلوں کی وہی نور جہاں ہے

ہنس راج بالی

جب دردِ محبت بڑھتا ہے دِن آتے ہیں جل اُٹھنے کے
جب داغ یہ بن کے اُبھرتا ہے شعلوں میں نظام آجاتا ہے
ہم کس کو حقارت سے دیکھیں ہے کون حقیر اس دنیا میں
تنکے کا سہارا بھی تو کبھی انسان کے کام آجاتا ہے

لالہ منوہر لال دِلؔ

انجام کی کیا کہیئے، آغاز نہیں معلوم
ہستی کے معمے کا کچھ راز نہیں معلوم
پی اور پلا ساقی، پی اور پلا ساقی
کب ٹوٹ کے رہ جائے یہ ساز نہیں معلوم

آثر صہبائی

مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ جن شاعروں اور نثر نگاروں نے جموں میں اُردو شعر و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ان میں میکش کاشمیری، نشاط کشتواڑی، دینا ناتھ رفیق، دیا نند کپور وغیرہ اہم ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک آتے آتے جموں سے، ''رنبیر'' کے علاوہ بھی اور کئی اخبارات اور رسائل جاری ہوئے مثلاً ''رتن'' (مدیر۔ملک راج صراف ۱۹۳۹ء) ''چاند'' پریم (۱۹۴۳ء) مدیر نرسنگھ داس نرگس وغیرہ۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کا اثر جموں کے ادبی ماحول پر بھی پڑا۔ اکثر لوگ جموں سے پاکستان ہجرت کر گئے کئی لوگ جموں چھوڑ کر دوسرے شہروں میں جا بسے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے صوبہ جموں میں جن شاعروں کی دھوم رہی، ان میں رسا جاودانی، میکش کاشمیری، ودیا رتن عاصی، دینا ناتھ رفیق، نرسنگھ دیو جموال، عابد مناوری، اندر جیت لطفؔ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ۱۹۶۰۔۶۵ء کے بعد خاص طور پر جدیدیت کے رجحان کے تحت جن شاعروں کو شہرت حاصل ہوئی ان میں عرش صہبائی، ودیا رتن عاصی، رہبر جدید، پرتپال سنگھ بیتاب، شہباز راجوروی، فدا کشتواڑی، فاروق مضطرؔ، احمد شناس، خورشید بسمل، کے۔ڈی مینی، وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح تحقیق وتنقید میں پروفیسر ظہور الدین، اسد اللہ وانی، اسیر کشتواڑی اور بشیر بھدرواہی وغیرہ نے اہم کارامے انجام دئے اور ابھی بھی اُردو تحقیق و تنقید میں اضافے کر رہے ہیں۔

صوبہ جموں کو اُردو ادب کے حوالے سے سب سے زیادہ شہرت ڈرامہ نگاری کے میدان میں ملی۔ خاص طور پر محمد عمر نور الہیٰ کی تصنیف ''ناٹک ساگر'' صرف اُردو کی نہیں بلکہ سبھی جدید ہندوستانی زبانوں میں ڈرامہ سے متعلق لکھی گئی تمام تصنیفات پر فوقیت رکھتی ہے۔ ناٹک ساگر پہلی بار ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ محمد عمر نورِ الہیٰ نے خود ڈرامے بھی لکھے۔ ان کے علاوہ جگدیش کنول، اظہر عسکری، نرسنگھ داس نرگس اور ایم۔ اے عزیز وغیرہ نے بھی اس صنف میں اپنی مہارت کا سکہ جمایا۔ محمد عمر نور الہیٰ کے ڈرامے ''بگڑے دِل''، ''قزاق''، ''ظفر کی موت'' وغیرہ بہترین ڈرامے قرار دئے جاتے ہیں۔ جگدیش کنول کے ڈرامے ''پردے کے پیچھے'' اظہر عسکری کے ''چار سو بیس'' اور ایم۔ اے عزیز کے ڈرامے ''نوشتہ تقدیر'' وغیرہ کا شمار اُردو کے بہترین ڈراموں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۶۰۔۶۵ء کے آس پاس سے ریڈیو جموں سے رام کمار ابرول، انسان جیت گیا، دھرتی اور ہم، نرہری رائے زادہ، پرانے دیپ نئے اُجالے، نریندر کھجوریہ، راستہ کانٹے اور ہاتھ وجے سمن ینگ مین وغیرہ ڈرامے نشر ہوئے۔

صوبہ جموں میں افسانہ نگاری کی روایت تیسری دہائی میں ہی قائم ہو چکی تھی۔ پہلا افسانہ کسی کرشن نامی شخص کا

لکھا ہوا تھا جو جموں کے اخبار رنبیر میں قسط وار شائع ہوا۔ خود رنبیر کے مدیر ملک راج صراف نے ''ماں''، ''شہید وطن''، ''دلاور چور'' وغیرہ کئی افسانے لکھے اس کے علاوہ کے ایل۔ ورما (قربانی)، اقبال چند اقبال (کرنی کا پھل)، نشاط (قمار باز)، انت رام (انتقام)، روشن لال گپتا (وطن پرست) وغیرہ جموں میں اُردو کے ابتدائی افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ کے ساتھ ہی جموں میں کئی ناول بھی لکھے گئے، مثلاً موہن لال مرواہ کا ''داستان محبت ۱۹۲۴ء قابلِ ذکر ہے۔ داستان محبت کو جان محمد آزاد نے جموں وکشمیر کا پہلا باضابطہ ناول قرار دیا ہے۔ پنڈت شمبھو ناتھ ناظر کا ''بیوہ کی فریاد'' اور پنڈت وشوناتھ کا ''تلاش حقیقت'' وغیرہ ۱۹۴۷ء سے قبل پریم ناتھ پردیسی نے ''پوتی'' کے نام سے ایک ناول لکھا جو تقسیم ملک کے نتیجے میں تلف ہوگیا۔ رامانند ساگر نے ریاست سے باہر رہ کر اپنا مشہور ناول ''اور انسان مرگیا'' لکھا۔ نرسنگھ داس نرگس نے تین ناول لکھے۔ پاربتی، جانکی، نرملا، کشمیری لال ذاکر نے ''سمندر صلیب اور وہ''' انگوٹھے کا نشان، ''دھرتی''، ''سہاگن'' اور ''کرماں والی'' جیسے کئی ناول لکھے ان کے افسانوں کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اب وہ کافی عرصہ سے جموں چھوڑ کر چنڈی گڑھ میں سکونت پذیر ہیں۔

جموں صوبہ کے فکشن نگار ٹھاکر پونچھی نے متعدد ناول اور سینکڑوں افسانے لکھے۔ ان کے ناولوں میں ''وادیاں اور ویرانے''، ''یادوں کے کھنڈر''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے''، ''زلف کے سر ہونے تک''، ''اُداس تنہائیاں''، ''پیاسے بادل''، ''سورج سمندر میں ڈوبتا ہے'' وغیرہ اہم ہیں۔

جموں میں اُردو کی ایک ہمہ جہت شخصیت دیوان نرسنگھ داس نرگس کی ہے۔ نرگس نے شاعری کی، نرگس نے '' تاریخ ڈوگرہ دیس'' ۱۹۴۷ء میں لکھی، ''چاند'' کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالا جس میں نرگس کے ناول ''پاربتی''، ''جانکی'' اور ''نرملا'' قسط وار شائع ہوئے۔ نرسنگھ داس نے اپنے مضامین کے ذریعے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

جموں میں اُردو کے فروغ میں جموں کے اخبارات خصوصاً ''رنبیر'' (۱۹۲۴ء) اڈیٹر ملک راج صراف ''رتن''

(۱۹۳۶ء اڈیٹر کندن لال) اور ''پریم'' (اڈیٹر۔ دیوان نرسنگھ نرگس) وغیرہ نے اہم ترین کردار ادا کیا۔ ان اخبارات میں جموں کے جن شاعروں اور نثر نگاروں کی تخلیقیات پابندی سے شائع ہوتی تھیں ان میں شانتی سروپ نشاط، (ایس، ایس، نشاط) صاحبزادہ محمد عمر، وشوناتھ کیرنی، ذوالفقار علی نسیم، بدری ناتھ وکیل، گردھاری لال آنند، سروناتھ آفتاب، غلام حیدر چشتی، محی الدین احمد گمن، تاراچند، پشپا سندرداس، اللہ رکھا ساغر، رسا جاودانی، عزیز کاش، کنول نین پرواؔز، دیا شنکر گردش، قیس شیروانی، عشرت کاشمیری، ملک عمر الدین اور لطیف وغیرہ اہم ہیں۔

جموں کے سرحدی علاقہ پونچھ سے بھی ضیاء الحسن ضیاؔ کی ادارت میں ''دیہات کی دنیا'' کے نام سے ایک رسالہ جاری ہوا جس میں آس پاس کے علاقوں سورن کوٹ، راجوری وغیرہ کی ادبی سرگرمیوں کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ پونچھ میں ہی کرشن چندر اور ان کے بھائی مہندر ناتھ کا بچپن گذرا تھا۔ پونچھ کے حوالے سے کرشن چندر کو بھی صوبہ جموں کے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کرشن چندر کے اکثر افسانے مثلاً بلاقی رام، بے پنکھ فرشتے، گرجن کی ایک شام، ''زندگی کے موڑ پر'' اور ناول، شکست، طوفان کی کلیاں جموں وکشمیر کے پس منظر میں ہی لکھے گئے ہیں۔

چراغ حسن حسرؔت نے اپنی تخلیقات کے ذریعے نہ صرف اس سرحدی علاقہ ''پونچھ'' میں اُردو شعروادب کی تخلیق کی رفتار کو تیز کیا بلکہ معیار اور وقار کو بھی بلند کیا چراغ حسن حسرت یوں تو بارہمولہ میں پیدا ہوئے لیکن ان کا خاندان ترک وطن کر کے پونچھ میں آباد ہو گیا۔ کرشن چندر نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت چراغ حسن حسرت کا نام ادبی دنیا میں ایک معتبر نام بن چکا تھا۔ کرشن چندر پونچھ کی ادبی محفلوں میں حسرت کی تخلیقات غور سے سنا کرتے تھے۔ کرشن چندر نے حسرت پر ایک خاکہ بھی لکھا تھا جو ماہنامہ آج کل دہلی کے ستمبر ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ چراغ حسن حسرؔت، صحافت، افسانہ، شاعری اور تحقیق وتنقید وغیرہ مختلف میدانوں کے شہ سوار تھے۔ حسرؔت نوجوانی میں ہی مولانا ظفر علی خاں کے اخبار ''زمیندار'' سے وابستہ ہو گئے تھے اور پابندی سے سنجیدہ اور طنزیہ ہر طرح کے کالم اور مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ روزنامہ ''احسان'' میں ''سندباد جہازی'' کے نام سے چراغ حسن

حسرتؔ جوطنزیہ مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ان کی مقبولیت کی وجہ سے ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح جموں وکشمیر میں بھی طنزیہ ومزاحیہ ادب کوفروغ حاصل ہوا۔ چراغ حسن حسرت جموں میں فن افسانہ نگاری کے بانی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ’’کیلے کا چھلکا‘‘ ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ جواب تک کی تحقیق کے مطابق جموں کے کسی افسانہ نگار کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔اس کے علاوہ ’’جدید جغرافیہ پنجاب‘‘ ’’ہردم دیدہ‘‘ ’’پربت کی بیٹی‘‘، ’’بغاوت‘‘، ’’عرب اور کرنل لارنس‘‘ بھی حسرت کی مشہور تصنیفات ہیں۔حسرت نے جموں میں ترجمہ کی روایت کو بھی مضبوط کیا اور اپنی تمام تصنیفات اور تراجم میں معیاری اُردو کے نمونے پیش کرکے جموں وکشمیر میں اُردو نثر کو معیار کے ساتھ ساتھ وقار بھی بخشا۔ اگر دیکھا جائے تو کرشن چندر، مہندر ناتھ، نرسنگھ داس نرگس، ملک راج صراف، صاحب زادہ عمر وغیرہ جموں کے اُردو ادیبوں اور صحافیوں نے چراغ حسن حسرت کے اسلوب بیان کا تتبع کیا۔

جموں میں اُردو زبان وادب کو فروغ دینے والوں میں ایک اہم نام حبیب کیفوی کا بھی ہے۔حبیب کیفوی جموں میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔منشی سراج الدین، خوشی محمد ناظر اور صاحبزادہ محمد عمر وغیرہ نے ان کی تربیت کی۔ کیفوی نے ابتدا میں شاعری کی ان کا شعری مجموعہ ’’آتش چنار‘‘ کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ ان کے تنقیدی وتحقیقی مضامین اُردو کے ممتاز رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتے تھے انھوں نے ڈرامے و رفیچر بھی لکھے لیکن ان کو شہرت ملی ان کی تصنیف ’’کشمیر میں اُردو‘‘ کی وجہ سے ملی۔ یہ تحقیقی وتنقیدی تصنیف پہلی بار ۱۹۷۹ء میں مرکزی اُردو بورڈ لاہور سے شائع ہوئی اور اب تک اس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔کیفوی نے اپنی کتاب میں جموں وکشمیر میں اُردو زبان اور شعر وادب کے حوالے سے بے حد قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔اس کتاب میں کیفوی نے ۱۱ جوالائی ۱۹۳۹ء کو جھیل ڈل میں منعقد ہونے والے مشاعرے کی تصویر کشی نہایت خوبصورت پُر تاثیر اسلوب میں کی ہے۔اس مشاعرے میں حصہ لینے والوں میں میاں بشیر احمد، منشی سراج الدین، محمود علی خاں، اثر صہبائی، وشوا ناتھ درؔماہ، ملک مقبول احمد اور قیس شیروانی وغیرہ اہم ہیں۔ یہ مشاعرہ ڈل جھیل میں سجے سجائے

شکاروں میں ہوا، شکاروں کو ہانجیوں نے اس طرح ترتیب دیا تھا کہ ایک حلقہ سا بن گیا تھا۔شعرا شکارے پر کھڑے ہوکر ترنم سے شعر سناتے تھے۔ یہ تاریخی مشاعرہ سات بجے شام کو شروع ہوا اور رات بھر چلتا رہا۔صبح کے وقت ڈل جھیل کے مرکز میں واقع ''چار چناری'' کے ساحل پر اختتام پذیر ہوا۔حبیب کیفوی کی تصنیف، کئی اعتبار سے عبدالقادر سروری کی اسی نام کی تصنیف (کشمیر میں اُردو) سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہے۔حبیب کیفوی کا انتقال ۱۹۹۱ء میں پاکستان میں ہی ہوا۔

جموں کے ہی ایک اور ادیب قدرت اللہ شہاب ہیں جنھوں نے عالمی شہرت حاصل کی۔ان کے افسانہ ''یا خدا'' کا شمار فسادات کے موضوع پر لکھے گئے شاہکار افسانوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے جو پہلی بار ''نیا دور'' کے فسادات نمبر میں شائع ہوا اور بعد میں یہ جون ۱۹۴۸ء میں اِسی نام سے ناولٹ کی شکل میں شائع کیا گیا۔قدرت اللہ شہاب کے بعض دیگر افسانے مثلاً سردار جسونت سنگھ، ایک رات کی بات، جلبترنگ، اور ''ماں جی'' وغیرہ بھی یادگار ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ نفسانے پاکستان سے شائع ہوا۔آخری عمر میں قدرت اللہ شہاب نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''شہاب نامہ'' کے نام سے شائع کی جس میں خاص طور پر تقسیم ملک، جموں اور جموں کے سماجی، سیاسی، علمی اور ادبی حالات کے مرقعے بے حد خوبصورت اور پرتاثیر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔قدرت اللہ شہاب تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے تھے جہاں انھوں نے اپنی ایمانداری، ذہانت اور دوراندیشی کی وجہ سے خوب ترقی کی۔ یہاں تک کہ پاکستان کے فوجی سربراہ ایوب خان کے پرائیوٹ سکریٹری کے عہد تک پہنچے۔ ریاست جموں وکشمیر کے پہلے آئی سی ایس افسر قدرت اللہ شہاب جنرل ایوب خان کے عہد حکومت میں اتنی اہم حیثیت کے مالک ہوگئے تھے کہ ان کے بارے میں یہ شعر مشہور ہوگیا تھا۔

جب کہیں انقلاب ہوتا ہے
قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے

قدرت اللہ شہاب نے جموں وکشمیر میں ہی نہیں پورے برصغیر میں اُردو ادیبوں کو اپنی تحریروں سے متاثر کیا۔

جموں کے افسانہ نگاروں میں ٹھاکر پونچھی (خانہ بدوش، یہ پتھر میرے ہیں، بے خواب کواڑ) کلدیپ رعنا (ایک خط ایک گیت، ڈاکٹر ظہور الدین (نجات، دُرشہوار) گھنشیام سیٹھی (ایک شام) آنند لہر (بٹوارہ) خالد حسین (اشتہاروں والی حویلی، ستی سر کا سورج) او۔پی۔شرما سارتھی (اپنا ایک سفر) راجہ نذر بونیاری (کئی تنکے کئی سورج) ڈی کے کنول (شکست) روشن لال روشن وغیرہ آج بھی پابندی کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔صنف ڈرامہ میں محمد عمر نورِ الٰہی کی خدمات کا ذکر ہو چکا ہے۔جموں وکشمیر میں ڈرامہ نگاری اور ڈرامہ کی تنقید کا آغاز بھی جموں کے ہی محمد عمر اور نور الٰہی کی تصنیف ''ناٹک ساگر'' سے ہوتا ہے۔

محمد عمر اور نور الٰہی دو اشخاص کے نام ہیں۔انھوں نے جتنی بھی کتابیں لکھیں اُن پر مصنف کے طور پر دونوں کے نام درج ہیں۔بیسویں صدی کے اوائل میں محمد عمر نور الٰہی جموں کے ادبی حلقوں کے روحِ رواں تھے۔ان کا سب سے پہلا نمایاں کام حکیم احمد شجاع کے ڈرامے ''باپ کا گناہ'' پر تنقید تھی جس میں واقعات کی کئی غلطیاں بتائی گئی تھیں۔اس تبصرے کے بدولت وہ ادبی دُنیا میں ایک سنجیدہ نقاد کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔اس کامیابی نے انھیں آغا حشر کاشمیری، احسن مارہروی، محشر اور رحمت علی کے ڈراموں کا تنقیدی جائزہ لینے پر مائل کیا اور یہ تنقیدیں بھی اہمیت کی نظر سے دیکھی جاتی رہی ہیں۔

یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے کہ محمد عُمر نور الٰہی صاحبان خصوصاً محمد عمر مزاجاً ڈرامے سے دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ تنقید کے میدان میں ان ابتدائی کامیابیوں نے ایک قوی محرک کا کام کرتے ہوئے انھیں ایک طرف عالمی ڈرامے کی مبسوط تاریخی مرتب کرنے پر مجبور کیا تو دوسری طرف ڈرامے کے تخلیقی میدان میں قدم رکھ کر اُس میں اضافے کے لیے تحریک بھی دی۔انھوں نے نہ صرف ڈرامے تخلیق کیے بلکہ بہت سے یورپی ڈراموں کو اُردو میں ترجمہ کر کے انھیں اسٹیج پر پیش بھی کیا۔ان کی انھیں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اُردو کے نامور شاعر، ادیب دتاتریہ کیفی نے جوان

دنوں ریاست جموں وکشمیر کے اسسٹنٹ فارن سیکرٹری تھے۔ ناٹک ساگر کا مقدمہ لکھا جس میں انھوں نے ان دونوں حضرات کی کوششوں کو خوب سراہا ہے۔

محمد عُمر اور نور الٰہی نے مشترکہ طور پر بھی اور الگ الگ بھی ڈرامے تخلیق کر کے پیش کیے۔ ریاست کے اولین تھیٹر ''رام لیلا ناٹک کلب'' جس کا نام بدل کر بعد میں امیچور ڈرامیٹک کلب رکھا گیا تھا۔ جس کی قیادت خود صاحب زادہ محمد عمر کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے ڈرامے سری نگر میں بسنت باغ میں اور جموں میں مندر دیوان جوالا سہائے میں جہاں دو سٹیج قائم کیے گئے تھے پیش کیے جاتے رہے۔ محمد عمر نور الٰہی نے جو ڈرامے پیش کیے ان میں سے چند اس طرح ہیں۔

۱۔ ''**تین ٹوپیاں**'' مزاحیہ ڈرامہ جو فرانسیسی زبان سے ماخوذ ایک فارسی قصے کا ترجمہ ہے۔

۲۔ ''**بگڑے دِل**'' ایک فرانسیسی طربیے یعنی مولیئر کے ڈرامے مس انتھروپ کا ترجمہ ہے۔

۳۔ ''**ظفر کی موت**'' اس کا موضوع موت کے خلاف انسان کی کش مکش ہے اور بیلجیم کے ڈراما نگار مٹر لفاس کے ڈرامے A Sister Love کا ترجمہ ہے۔

۴۔ ''**اسکندر**''

۵۔ ''**قزاق**'' شلر کے ڈرامے کا ہندوستانی روپ۔

۶۔ ''**موجودہ لندن کے اسرار**'' لندن میں ہونے والے خفیہ جرائم سے متعلق ڈرامہ ہے۔

۷۔ ''**روحِ سیاست**'' ابراہیم لنکن کی زندگی سے متعلق ڈرامہ۔

۸۔ ''**پھلی پیشی**'' مختصر ڈراما ''ہمایوں'' لاہور میں مارچ ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔

۹۔ ''**جانِ ظرافت**'' مولیر، لیسنگ اور مرزا جعفر ایرانی کے ڈراموں کا ملا جلا روپ۔

۱۰۔ ''**خواب پریشان**'' سویڈن کے ڈراما نگار سوسیو سٹارین برگ کے ایک فلسفیانہ ڈرامے کا ترجمہ

۱۱۔ ''**ڈرامے چند**'' جوحسب ذیل سات ڈراموں کا مجموعہ ہے،اومائی،جنونِ ادب،چپ کی داد، لاگ ڈانٹ،ہمہ خاندان آفتاب،مہابلی۔

۱۲۔ ''**بور کے لڈو**'' مزاحیہ ڈرامے۔

۱۳۔ ''**مدرا داکھشس**'' سنسکرت ڈرامے کا ترجمہ۔

۱۴۔ ''**مرچہ کٹیکا**'' سنسکرت ڈرامے کا ترجمہ۔

۱۵۔ ''**ناٹک کتھا**'' جس میں قدیم ہندوستانی ڈراموں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۶۔ ''**ھمہ خاندان آفتاب**'' ریڈیو ڈراما۔

۱۷۔ ''**آبیل مجھے مار**'' ریڈیو ڈراما۔

محمد عمر نور الہٰی نے بھی ''مدھم پنچم'' کے نام سے اُردو ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ اس میں شامل سبھی ڈرامے مزاحیہ ہیں۔نور الہٰی کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا جبکہ صاحب زادہ محمد عمر نے ۱۹۴۶ء میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔

جموں میں اُردو شعر و ادب کے فروغ میں جموں ریڈیو اسٹیشن کا اہم کردار رہا ہے۔جموں میں ریڈیو اسٹیشن ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔شروع میں جموں اور آس پاس کے شہروں،راجوری،پونچھ،سورن کورٹ اودھم پور،م بھدرواہ اور ڈوڈہ وغیرہ کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقع ملا۔ریڈیو جمو نے کئی کل ہند مشاعرے کروائے۔مختلف موضوعات پر تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھوائے گئے۔محفل افسانہ بھی منعقد کی جانے لگی۔ریڈیو جموں سے یوں تو کئی نامور ادیب وابستہ رہے مثلاً ٹھاکر پونچھی،جتیندر اودھم پوری،سوم ناتھ سادھو،اور میکش کاشمیری وغیرہ لیکن ان میں خاص طور پر پنڈت کیلاش ناتھ کول میکش کاشمیری کا نام بے حد اہم ہے ۔میکش کاشمیری خود شاعر تھے۔ان کے شعری مجموعے ''بال ہما'' اور ''بال عنقا'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔میکش جموں میں ہی پیدا

ہوئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔میکش نے ریڈیو جموں کے وسیلے سے سینکڑوں نوجوان اور غیر معروف شاعروں اور ادیبوں کو منظر عام پر لاکر جموں میں اُردو زبان وادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کئے۔ان کے علاوہ۔ ویدراہی، کشوری منچیدہ، اللہ رکھا ساغر، داکٹر ظہورالدین، پشکر ناتھ، ٹھاکر پونچھی، خالد حسین، عشرت کشتواڑی، عرش صہبائی، رام کمار ابرول، احمد شناس، آنندلہر، فدا راجوری، کے ڈی مینی، فاروق مضطر، خورشید بسمل، بیتاب جے پوری، خورشید کاظمی، امین بنجارا، اسداللہو الی، اسیر کشتواڑی، بشیر بھدرواہی وغیرہ اُردو کے ایسے لکھنے والے ہیں جنھوں نے صوبہ جموں میں اُردو شاعری، افسانہ نگاری، ناول نویسی، صحافت، طنز ومزاح، ڈرامہ نگاری اور انشائیہ نگاری وغیرہ میدانوں میں اپنی اپنی دلچسپی ور رجحان کے مطابق بہترین کارنامے انجام دئے ہیں اور ان میں سے بیشتر آج بھی اپنی نگارشات کے ذریعے اُردو زبان وادب کے فروغ وارتقا میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ان میں سے کئی لکھنے والوں کی تخلیقات آج بھی جموں وکشمیر سے نکلنے والے روزناموں ''اُڑان'' اور ''کشمیر عظمی'' میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر اور لداخ میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں صوبہ جموں کے مختلف علاقوں کے لکھنے والوں کا اہم کردار رہا ہے۔

(ج) : صوبہ لداخ میں اُردو زبان کا آغاز وارتقاء

جموں اور کشمیر کی طرح اُردو لداخ کی بھی تہذیبی اور رابطے کی زبان ہے۔ یہاں مادری زبان کے بعد اُردو پڑھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔۱۸۸۸ء میں جموں وکشمیر میں اُردو کو سرکاری زبان بنانے سے بہت پہلے سے ہی لداخ میں اُردو باہمی لین دین اور آپسی تبادلہ خیال کے لیے رابطے کی زبان کی حیثیت سے مقبول تھی۔تب لداخ ایک خود مختار خطہ تھا۔لیہہ وسط ایشیاء کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ بہت سارے پنجابی، کشمیری، تبّتی اور ترکی تاجر تجارت کے سلسلے میں لداخ آتے تھے۔اس لیے رابطے کے لیے ایک زبان کی ضرورت تھی۔ترکی تاجروں کے ساتھ لداخی ترکی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔پنجابیوں اور کشمیریوں کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی سہی، اُردو میں بات

چیت کرتے تھے۔ ۱۸۲۰ءاور ۱۸۲۱ء کے دوران ایک انگریز مورکرافٹ لداخ میں تھا۔وہ رقم طراز ہے’’ کرگل میں ہر گاوں میں ایک یا دو فارسی اور ہندوستانی جاننے والے تھے‘‘۔

مسلمانوں نے ریاست میں اُردو کو سرکاری زبان بنانے سے دوسوسال پہلے لداخ کو فارسی سے روشناس کیا۔لداخ مغلیہ حکومت کا باج گذار اور لداخ کے راجے کشمیر کے مغل گورنر سے فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ اس ضمن میں ایک لداخی راجہ نے کشمیر سے ایک فارسی دان مسلمان کو مدعو کیا اور لیہہ میں آباد کیا۔

اُنیسویں صدی میں لداخ میں اُردو کی مقبولیت کی تصدیق ایک واقعہ سے ہوتی ہے ۔مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء۔۱۸۸۵ء) نے ۱۸۷۴ء میں لیہہ میں سنسکرت کی درس وتدریس کے لیے ایک پاٹھ شالہ کھولی اور اس کے لیے کشمیر سے ایک اُستاد بھیجا۔لداخ کے تمام نمبرداروں کے نام ہدایت جاری کی گئی کہ اپنے بیٹے یا اپنے رشتے کے ایک قریبی بچے کو پاٹھ شالہ میں سنسکرت سیکھنے کے لیے داخل کریں لیکن لداخیوں نے سنسکرت سیکھنے میں بالکل دلچسپی نہیں دکھائی ۔اکثر بچے سکول سے بھاگ جاتے تھے اور والدین اُن کو روکنے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔اس لیے لداخ میں مقامی زبانوں کے بعد اُردو ہی علم وادب اور رابطے کی زبان کے طور پر ترقی کرتی رہی۔

وسط ایشیاء سے تجارتی امور کی نگرانی کے لیے لیہہ میں متعینہ انگریز جوائنٹ کمشنر نے اکتوبر ۱۸۸۲ء میں اپنی ڈائیری میں لکھا ہے:

> ’’لداخی فارسی رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں ۔یہ کشمیر کی سرکاری زبان ہے کیونکہ یہ ہندوستانیوں اور ترکی تاجروں میں آپسی میل جول کے دوران عملی طور زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ (اشارہ اُردو کی طرف ہے۔ترکی تاجر بھی اُردو رسم الخط میں لکھتے تھے)اس کے برعکس لداخی سنسکرت کے چند صفحات رٹانے میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ان لڑکوں کو بڑی مشکل سے سکول میں حاضر

رکھا جاتا ہے۔ مہاراجہ کی طرف سے فراخ دِلانہ وظائف کی ادائیگی، خوراک وغیرہ کی فراہمی کے باوجود وہ لگاتار سکول سے بھاگتے رہے ہیں۔ مہاراجہ کو پاٹھ شالہ کی ناپسندیدگی کا علم رہا ہے۔ ہر سال طلباء کی تعداد گھٹتی جارہی ہے لیکن اُس نے اسکول بن نہیں کیا ہے''۔(۲۰)

آگے وہ لکھتا ہے:۔''شاستری سکول جو یہاں چند سال سے قائم ہے، آج عملی طور پر بے کار پڑا ہے اور اس میں صرف پانچ طلباء زیرِتعلیم ہیں''۔(برٹش جوائنٹ کمشنر کی یہ ڈائیری نیشنل آرکائیوز میں موجود ہے۔)

اس سے پہلے کشمیر میں برطانوی ہند سرکار کے خصوصی ڈیوٹی پر تعینات افسر میجر پی۔ ڈی، ہنڈرسن نے معاملہ انداز یرنمبر ۴۴۱ مورخہ ۲۵ اِکتوبر ۱۸۷۷ء برطانوی ہند حکومت کی نوٹس میں لایا تھا۔ غالباً لیہہ میں تعینات برٹش جوائنٹ کمشنر نے اس طرف ان کو متوجہ کیا ہوگا۔ میجر ہنڈرسن نے لکھا تھا:

''لداخی لڑکوں کی تعلیم کے لیے مہاراجہ کا قائم کردہ یہ شاستری سکول (مقامی لوگوں میں) بالکل نامقبول ہے۔ مہاراجہ صورتِ حال سے آگاہ ہے لیکن اپنے فیصلے پر اڑا ہے''۔(۲۱)

آخرکار مہاراجہ کو لوگوں کی مرضی کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا پڑا اور سکول بند کر دیا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں عیسائی مشنری موراوین مشن نے لیہہ میں ایک سکول کھولا۔ سکول میں اُردو اور انگریزی دونوں زبانیں پڑھائی جانے لگیں۔ اگرچہ اس وقت تک اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان نہیں بنی تھی۔ لیکن اُردو کی مقبولیت کے پیشِ نظر مشن نے اُردو کو نصاب میں شامل کیا۔

آزادی سے پہلے لداخ میں متعدد انگریز سیاحت اور شکار کے لیے آتے تھے۔ اُن میں سے بہتوں نے اپنے سفرنامے لکھے ہیں۔ کئی سفرناموں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے اور لداخیوں کے درمیان ذریعہ اظہار کی

زبان اُردو تھی۔ یہ انگریز، جن میں بہت سارے فوجی افسر ہوتے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی ہندسرکار کے ملازم رہ چکے تھے۔

۱۹۴۰ء میں والئی ریاست مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے جانشین مہاراجہ ہری سنگھ (۱۹۲۵ء ۔ ۱۹۴۷ء) کے دور حکومت میں خواجہ غلام السیدین ریاست میں محکمہ تعلیم میں ناظمِ اعلیٰ تھے۔اس وقت تک ریاست کے تمام سکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی تھی۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۸ء میں جموں صوبہ میں اُردو کو عدالتی زبان کا درجہ دیا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں وادیٔ کشمیر اور لداخ کی عدالتوں میں اُردو میں کام ہونے لگا۔تقریباً اُسی زمانے میں محکمہ مال میں بھی اُردو مروج ہوئی۔

شخصی حکومت کے دور میں ریاست میں اخبارات کی اشاعت اور بیرون ریاست سے اخبارات کی آمد پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ لاہور، الہ آباد اور دوسرے شہروں میں چھپنے والے اُردو اخبارات چوری چھپے ریاست میں منگائے جاتے تھے۔جنہوں نے ریاست میں تحریکِ آزادی کا بیج بونے اور اسے بڑھاوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

جموں اور کشمیر کی طرح لداخ میں بھی لاہور سے ''صداقت''، ''خلافت''، ''زمیندار''، ''انقلاب''، ''پرتاپ'' اور ''ملاپ'' جیسے اخبارات خفیہ طریقے سے منگائے جاتے تھے۔ کیونکہ مہاراجہ نے بیرون ریاست سے اخبارات کی آمد پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ ان اخبارات کو پڑھ کر ایک لداخی منشی عبدالستار نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا اور جیل گئے۔ وہ لداخ کے پہلے مجاہدِ آزادی ہیں۔ مذکورہ کئی اخبارات میں کئی دفعہ لداخ میں شخصی حکومت کے مظالم کی روئداد بھی چھپتی تھی۔

بعد میں سرینگر سے شائع ہونے والے اخبارات ''ہمدرد'' اور ''صداقت'' وغیرہ بھی لیہہ آنے لگے۔ ڈوگرہ حکمرانوں نے اُردو کی ترقی و ترویج میں بڑی دلچسپی لی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اُردو کے فروغ کے لیے سکولوں میں

انسپکٹر تعینات کئے اور اُردو ادیبوں کی اعلیٰ تخلیقات کے لیے انعامات اور اعزازات کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

ریاست میں اُردو کی پہلی کتاب ''سفرنامۂ بخارا'' ہے۔ جو جموں میں چھپی۔ اس کا مصنف مہتہ شیر سنگھ ہے۔ وہ بخارا سے لداخ کے راستے واپس کشمیر روانہ ہوا تھا۔ اس کتاب میں لداخ کا ذکر ہے۔

اسی طرح ''احوالَ ملک لداخ'' اس خطے کے بارے میں ایک پرانا قلمی نسخہ ہے۔ یہ دونوں نسخے سرینگر کی ریسرچ لائبریری میں موجود ہیں۔

آزادی کے بعد لداخ میں اُردو نے نمایاں ترقی کی۔ اُردو میں کتابیں لکھی گئیں اور اُردو قارئین کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی۔ لداخ میں زبان کے نام پر کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آج لداخ میں ادبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی پر اُردو کا اثر ہے۔ یہ ریاست اور ملک کے دوسرے حصوں کے لیے رابطے کی زبان کا کام دیتی ہے۔ اندرون ملک سے کوئی بڑی شخصیت آتی ہے تو عام طور پر اُردو ہی میں اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اُردو میں سپاسنامہ پڑھا جاتا ہے۔ کھیل کے میدان میں کومینٹری اسی زبان میں ہوتی ہے۔ اور مختلف اعلانات کے لیے اسی زبان کا سہارا لیا جاتا ہے۔

لیکن تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہے جو حال کی پیداوار ہے۔ اس زبان کے ساتھ ماضی میں جو گہری وابستگی تھی۔ اب لیہہ ضلع میں اس میں کمی آئی ہے۔ البتہ کرگل ضلع میں اس کی گرفت مضبوط ہے۔

۱۹۵۲ء میں جموں وکشمیر آئین ساز اسمبلی نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم ایک سرکاری زبان کو فروغ دینے کے لیے جو اقدام کرنے چاہئے تھے وہ سرکار نے اب تک نہیں کئے ہیں۔

۱۹۷۵ء میں جب شیخ محمد عبداللہ دوبارہ ریاست کے وزیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے اُردو ہندی کو دسویں جماعت تک لازمی قرار دیا۔ جس نے ابتدائی جماعت میں اُردو زبان اختیار کی ہو، اسے چوتھی جماعت سے

ثانوی زبان کی حیثیت سے ہندی پڑھنی ہوگی اور ہندی ابتدائی جماعت سے پڑھنے والے طالب علم کو چوتھی سے اُردو پڑھنی ہوگی۔

اُردو کو اس لحاظ سے فوقیت دی گئی کہ ایک لازمی مضمون کے علاوہ ابتدائی درجے سے میٹرک تک ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔سرکاری نوکری کے لیے اُردو ہندی دونوں کا جاننا لازمی قرار دیا گیا۔

حکومت نے قانون تو نافظ کیا لیکن اس پر شروع سے ہی نیم دلی سے عمل ہوا۔ پرائیویٹ سکولوں کی بے اعتنائی پر کوئی باز پُرس نہیں کی گئی اور پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ سبھوں نے اُردو کو کم وبیش خیر باد کہہ دیا۔لیکن کچھ عرصے بعد پھر سے پرائیویٹ اسکولوں میں اُردو پڑھانے کی طرف توجہ دی گئی۔

عام طور پر جو زبان شروع میں اختیار کی جاتی ہے۔اس کی بنیاد اچھی رہتی ہے۔خاص کر آج کل جب تعلیم کا معیار گر گیا ہے۔ یہ مسئلہ زیادہ سنگین بنا ہوا ہے۔ چوتھی جماعت میں پہنچنے کے بعد طلباء دونوں زبانوں میں کمزور ہوتے ہیں، میٹرک کے بعد ہر طالب علم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کیونکر ان دونوں زبانوں کو خیر باد کہےاور دوسرا مضمون اختیار کرے۔ یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہونے کی وجہ سے سبھی انگریزی کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ خاص کر حالیہ برسوں میں انگریزی نے ملکی اور بین لاقوامی سطحوں پر غیر معمولی افادیت حاصل کی ہے۔اب تو انگریزی ذریعہ تعلیم بھی ہے۔لیکن اسکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔

کئی ریاستی سرکاریں سہ لسانی فارمولہ کو نہیں مانتی ہیں ۔ یہاں چار زبانیں پڑھانے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کی تینوں اکائیوں میں مادری زبانوں کو لازمی بنانے کی دیرینہ مانگ ہے۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال میں حکومت کو ریاست کی سرکاری زبان اُردو کی بقا اور نشو ونما کے لیے نئی حکمت عملی وضع کرنی ہو گی۔عبدالغنی شیخ کے مطابق:

’’لداخ میں اُردو قارئین ہزاروں ہیں لیکن لکھنے والے بہت کم ہیں۔۱۹۳۰ء کی دہائی میں منشی عبدالستار نے

اُردو میں ''لداخ کی تاریخ''، لکھی۔ یہ ریاست میں لکھی جانے والی اُردو کی اولین تصنیفات میں سے ایک ہے۔

آزادی کے بعد کاچو سکندر خان نے اُردو میں تین کتابیں تصنیف کیں۔ ''قدیم لداخ'' جو لداخ اور بلتستان کی تاریخ پر ایک مبسوط تصنیف ہے۔ ۳۴۷ صفحات کی اس ضخیم کتاب میں کاچو صاحب نے بلتستان اور لداخ کی تاریخ، تہذیب اور تمدن پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس تاریخ کی تیاری میں اُنہوں نے جہاں مختلف مورخوں سے استفادہ کیا ہے وہاں اپنی تحقیق سے نئی باتیں بھی منظر عام پر لائی ہیں۔ خاص طور پر دردوں کی تہذیب پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔

اُن کی دوسری کتاب ''نربوزانگپو وایت ٹھہوق لہامو'' مشہور لداخی داستان کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس داستان کا اصلی ماخذ سنسکرت ہے۔ اسے مقامی ماحول کے مطابق تبّتی اور لداخی جامہ پہنایا گیا تھا۔ کاچو صاحب نے اس داستان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

اُن کی تیسری تصنیف ''افکارِ پریشان'' اُن کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ کتاب کے خوبصورت عنوان کی طرح اُنہوں نے اپنی آپ بیتی، مشاہدات اور تجربات کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ کاچو صاحب کی زبان سلیس، شیریں اور دلنشیں ہے۔

''اول الذکر دو کتابوں پر کاچو صاحب کو ایوارڈ بھی ملے ہیں''۔ (۲۲)

اکبر لداخی مرحوم نے لداخی زندگی پر اُردو میں کئی کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں۔ بابو عبدالحمید نے لداخی، اُردو اور انگریزی لغت مرتب کی ہے۔ یہ پہلی لغت ہے۔ جس میں لداخی الفاظ کے اُردو متبادل دئے گئے ہیں۔ مصنف نے اپنی دوسری کتاب میں ایک ہزار لداخی کہاوتوں کے متبادل، اُردو کہاوتیں یا اُن کے ترجمے پیش کئے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اس نوعیت کی منفرد تصنیفات ہیں جن سے اُردو قارئین زبان اور کہاوتوں سے روشناس ہوئے ہیں۔

''لداخ میں اُردو کی صورت حال'' کے جائزے کا سب سے اہم ماخذ لداخ کے مشہور ادیب و دانشور عبدالغنی

شیخ کی وہ تحریریں ہیں جو انھوں نے اُردو میں ہی لکھی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ لداخ کی تہذیب و ثقافت، علوم وفنون اور رسوم ورواج کے بارے میں بیرونی دنیا کو جو معلومات حاصل ہو رہی ہیں وہ عبدالغنی شیخ کی اُردو اور انگریزی کتابوں اور مضامین کے حوالے سے ہی ہو رہی ہیں۔ عبدالغنی شیخ نے عبدالقادر سروری کی ''کشمیر میں اُردو'' کی طرز پر 'لداخ میں اُردو' کے حوالے سے کوئی مبسوط کتاب تو نہیں لکھی لیکن لداخ میں اُردو زبان وادب کے آغاز وارتقا کے حوالے سے انھوں نے جو متعدد مختصر اور طویل مقالے لکھے ہیں۔ انھیں یکجا کیا جائے تو لداخ میں اُردو کا پورا منظر نامہ سامنے آسکتا ہے۔

عبدالغنی شیخ ۵، مارچ ۱۹۳۶ء کو لیہہ کے ایک باعزت گھرانے میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم انھوں نے لیہہ میں حاصل کی۔ انھوں نے تاریخ (History) میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں کلاس ون افسر کے فرائض انجام دئے 1991ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد سے لکھنے لکھانے میں ہی اپنا سارا وقت صرف کر رہے ہیں۔

عبدالغنی شیخ کو شروع سے ہی لکھنے کا شوق تھا۔ ابتدا انھوں نے افسانہ نگاری سے کی، ان کا پہلا افسانہ ''جلن'' سرینگر کے ماہنامہ ''دیش'' میں ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''زوجیلا کے آر پار'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں دس افسانے ہیں۔ پانچ افسانے زوجیلا کے اُس پار لداخ کے حوالے سے ہیں جبکہ پانچ دیگر افسانوں میں سرینگر، جموں اور ملک کے دیگر علاقوں کے افراد اور واقعات پر مبنی افسانے ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''وہ زمانہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ایک مختصر ناول ہے جسے ناولٹ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس ناول میں ۱۹۴۷ء سے قبل لداخ کے سماجی وثقافتی، معاشی اور تمدنی حالات کی ترجمانی دِلچسپ اور جاندار کرداروں اور واقعات کے حوالے سے کی گئی ہے۔ ۱۹۷۸ء میں لیہہ کے پس منظر میں ان کا ناول ''دل ہی تو ہے'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس ناول میں لیہہ کے قدرتی مناظر، سیاحوں کے

ساتھ مقامی لوگوں کے میل جول اور ان سے مالی فائدہ اُٹھانے کی عام روش اور لیہہ کی صدیوں پرانی اخلاقی قدروں کے تناظر میں کہانی کو پیش کیا۔ ناول کے ہیرو ڈاکٹر سونم اور ہیروئن پدماں کے عشق کا افسانہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ عبدالغنی شیخ کے اس ناول کے بارے میں جان محمد آزاد نے لکھا ہے:

''یہ (دِل ہی تو ہے) ایک سیدھی سادی سی کہانی ہے۔ اس کے مفہوم میں کوئی پیچیدگی یا تہہ داری نہیں۔ رومانی آرزومندی کی یہ کوشش گرچہ جدید ادبی تقاضوں کے میزان و معیار پہ کھری نہیں اُترتی تاہم مصنف نے اپنے ماحول کی جو پرخلوص عکاسی کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔ اسی بات کے پیش نظر ریاستی کلچرل اکادمی نے مصنف کو اس کتاب کے لیے ۱۹۸۰ء میں بہترین تصنیف کے انعام سے بھی نوازا تھا۔ انھوں نے ''دوراہا'' کے نام سے افسانوں کی ایک انتھولوجی بھی ترتیب دی ہے''۔ (۲۳)

عبدالغنی شیخ نے افسانہ، اور ناول کے علاوہ بھی لداخیات اور دیگر موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً،

۱۔ سونم نربو سوانح عمری
۲۔ اسلام اور سائنس تحقیق
۳۔ لداخ آزادی کے بعد تحقیق و تاریخ
۴۔ لداخ محققوں کی نظر میں تحقیق و تاریخ
۵۔ قلم، قلم کار اور کتاب تحقیق و تنقید
۶۔ لداخ۔ تہذیب و ثقافت تحقیق و تنقید

عبدالغنی شیخ کے پچاس سے زائد مضامین اُردو، ہندی، انگریزی اور لداخی زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔

ان کے مطبوعہ افسانوں کی تعداد ۲۰ سے زیادہ ہے۔ جو متفرق رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔اس کے علاوہ لداخ کی سیر، ''گاندھی جی اور ان کا فلسفہ''، ''لداخ کی نئی تاریخ'' وغیرہ ان کی کئی کتابیں زیرِ طبع ہیں۔عبدالغنی شیخ کے افسانے اور مضامین ریڈیو، دوردرشن لیہہ سرینگر اور دہلی سے متواتر پیش کئے جاتے ہیں۔

دراصل ایک طرف جہاں عبدالغنی شیخ کی تحریروں سے لداخ میں اُردو کی صورتِ حال کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے وہیں خود ان کی ادبی تخلیقات اور تحقیقی وتنقیدی مضامین سے لداخ میں اُردو شعروادب کی رفتار اور معیار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

کئی لداخی قلم کار مثلاً ٹشی ربگیں، چھوانگ تولدن، ستزین آنچگ، عبدالقیوم وغیرہ نے اُردو میں اکا دُکا مضامین قلم بند کئے ہیں۔کئی شعراء اور شاعرات طبع آزمائی کرتے رہے۔ان میں منیر احمد، رقیہ بانو، چھرنگ آنگموں، پنچگ آنگموں اور خالدہ باری (مرحومہ) شامل ہیں۔

کئی غیر لداخی ادیبوں اور قلم کاروں نے لداخ کے بارے میں اُردو میں لکھا ہے۔اُن میں وزیر حشمت اللہ کی کتاب ''تاریخ لداخ، جموں وکشمیر'' ایک معرکتہ الاراء تصنیف ہے۔ نیز امین پنڈت کی کتاب ''لداخ کی کہانی'' اور ستیش بترا کا سفر نامہ ''جولے لداخ'' قابل ذکر ہیں۔

لیہہ اور کرگل کے ریڈیو سٹیشنوں نے لداخ میں اُردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ان سٹیشنوں سے اُردو میں وقتاً فوقتاً پروگرام نشر ہوتے ہیں۔

ریاستی کلچرل اکادمی کی مطبوعات خاص کر ادارہ کے جریدے ''ہمارا ادب'' اور ''شیرازہ'' کے خصوصی شمارے تاریخی طور پر دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔ان میں ریاست کے تینوں خطوں کے مشاہیر، ثقافت، فنونِ لطیفہ، رہن سہن، رسم ورواج، پکوان، لباس، تاریخ، جغرافیہ، اساطیر اور دیومالائی کتھاؤں پر تحقیقی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔اس ضمن میں تینوں اکائیوں کے قلم کاروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر

اینڈ لینگویجز اب تک ''جموں کشمیر اور لداخ'' کے نام سے شیرازہ کے کئی خصوصی نمبر شائع کر چکی ہے۔ جن میں لداخ کے بارے میں بھی ہر زاوئے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مُلک کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی فلمیں اُردو کے فروغ اور بقاء میں اہم رول ادا کر رہی ہیں اور فلمی مکالمے اور گیت ناخواندہ لوگوں کی بھی زبان پر چڑھے ہیں۔ اُردو نے لداخی اور بلتی زبانوں کو غزل، قوالی، نعت، منقبت، قصیدہ اور مرثیہ عطا کیا ہے۔

لداخ کے مشہور اُردو ادیب عبدالغنی شیخ نے اُردو اور لداخی کے لسانی رشتوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ان کے مطابق:

> ''لداخی بول چال کی زبان کو اُردو نے متعدد الفاظ دئے ہیں۔ جن میں متعدد الفاظ اپنی اصلی صورت میں ہیں۔ اور اکثر الفاظ لداخی سانچے میں ڈھل کر اس میں ضم ہو گئے ہیں۔ کئی مقبول عام کہاوتوں میں اُردو کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ لداخی زبان کی لسانی ساخت اور مزاج کچھ ایسا ہے کہ اس میں اُردو، ہندی یا فارسی کے الفاظ نہیں پھبتے۔ اس لیے لداخی ادیب اور مترجم متبادل اور نئے الفاظ کے لیے تبّتی ماخذ سے الفاظ ڈھونڈتے ہیں یا لداخی لفظ یا اُن کے مرکبات سے تلمیحات اور اصطلاحات وضع کرتے ہیں۔ تاہم متعدد اُردو الفاظ لداخی میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ اُن کے بغیر لداخی نامکمل ہوگی''۔ (۲۴)

عبدالغنی شیخ نے مزید لکھا ہے: اُردو کے متعدد الفاظ لداخی زبان میں استعمال ہوتے ہیں جیسے کمبل، کمرہ، چلم، کشتی، بنیان، کنٹوپ، کلچہ، بقچہ۔ بستہ، الماری، میز، پیوند، دیدی، خواجہ، برقع، گلاب، قالین، شال، توپ، دری، مخمل، رنگ، ٹماٹر، آلو، پھول گوبھی، دیگ، ٹھک، آرہ، سپاہ، کباب، گوشتابہ، یخنی وغیرہ۔ بہت سارے الفاظ بگڑی

ہوئی صورت میں لداخی زبان کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں جیسے:

فارسی/ اُردو	لداخی	اُردو	لداخی
دف	دپس	جنازہ	جناز
بالٹی	بالٹین	چادر	ژازر
چڑیا	چوتی	نیلام	لیلم
سموسہ	سمو	کھجور	خسور
مسخرا	مسکر	مردار	مُل دار
پلاؤ	پولا	الائچی	لیشی
بندوق	تُوبق	کھانڈ	خرا
پاپوش	پابُو	قمض	کمیز
موتی	موتیک	بگھار	بفر
چائے	چاء	موم بتی	بتی
قفل	کولیک	دارچینی	دالچین
طشت	طاس	فلیتہ	فتیلہ
تمغہ	تغمہ	پراٹھا	پوروٹا
توا	تاؤ	ڈائین	ڈین
وسوسہ	وسواس	مسجد	مجید
تمباکو	تمق	ابّا	آوا

ڈمرو	دُرو	نیند	نیت
کُم کُم	کُرکُم	سرائے	سرا
پڑاو	پڑا۔		

لداخیوں نے اُردو الفاظ سے لداخی زبان کے الفاظ کے طرز پر حروف مکبّر اور حروفِ تصفیر بنائے ہیں جیسے دیگ سے دیگچین یا بڑی دیگ، دیگچونگ یا چھوٹی دیگ،۔

کئی دفعہ اُردو اور لداخی ہم معنی الفاظ ایک ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں جیسے ٹھیل شرم، شرع شرم، ٹھمز قانون، ٹھل بے کار، خدا قو نجوق، گارُ خور لو وغیرہ۔ کئی اُردو الفاظ لداخی میں دوسرے معانی میں استعمال ہوتے ہیں جیسے:

کھیل تپ چیس	ہوشیاری سے نفع کمانا یا فائدہ لینا
خوشی چن	متلون مزاج
جورار یگ چیس	غلط باتیں بنانا
ٹوٹا پھوفچیس	نقصان ہونا
منت چودُوگ	ٹرخا رہا ہے
باقی پھوق چیس	کمی پیش آنا
ادب چیگ دُوگ/ حساب چیگ دُوگ	تھوڑا بہت ہے
بُومیدوگ	نام ونشان نہیں ہے
غُدود	چاچی، کمینہ آدمی

کئی لداخی کہاوتوں میں اُردو کے الفاظ شامل ہیں۔ جیسے خا خارا، نینگ آرہ یعنی زبان کا میٹھا لیکن دِل کا بُرا،

آرہ کو یہاں خراب کے معنی میں لیا ہے۔ یا ایک اور محاورہ لیجئے۔ چھوکھیونگ کن لاشاباش میت، چُھو کرچق کن لاکپ کیوں میں یعنی پانی لانے والے کوشاباش نہیں لاشاباش نہیں اور گاگر توڑنے والے کو ڈانٹ نہیں۔

لداخ میں منشی عبدالستار مصنف تاریخِ لداخ (۱۹۳۰ء) سے لے کر عصر حاضر میں عبدالغنی شیخ تک اُردو نثر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ شاعری کی کم۔ لیکن آزادی کے بعد لداخ میں اُردو شاعری کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک کئی شعرا سامنے آئے ہیں۔ جو بڑی سنجیدگی کے ساتھ اُردو نظمیں اور غزلیں لکھ رہے ہیں جنھیں زبان و بیان کی ندرت اور افکار و خیالات کی جدت کی بنیاد پر جموں و کشمیر ہی نہیں برصغیر کے دوسرے اہم ادبی مراکز دِلی، لاہور کے بالمقابل رکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر لداخ کے ایک معاصر اُردو شاعر کاچو اسفندیار خاں کی ایک مختصر نظم اور غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حقیقت

گنبدِ نور سے آگے تیرہ و تار سمندر سے پرے

نیلے تاروں سے پرے سرخ شعلوں سے پرے

ہے اگر حسن کوئی اس حسن کا جلوہ دیکھوں

ورنہ اب چھین لے مجھ سے

مری عقل مرے ہوش و حواس

کیوں مجھے آتشِ نمرود میں زندہ جلاتے ہو

کس کی پاداش میں مجھ کو یہ سزا دیتے ہو

کیوں مجھے دے کے کھلونے یونہی بہلاتے ہو

اور غزل کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

ہمی تو بزم جہاں میں بہت عزیز نہ تھے
یہ کس کی یاد میں ساکت ہیں سب درو دیوار
ہمارا دل تو وہ ہیرا ہے جس کا مول نہیں
لیے پھروں اسے ہاتھوں میں کیوں سر بازار

☆

اے زندگی تری گلیوں پہ ہم فدا لیکن
ہماری راہ میں حائل ہے شیشۂ پندار

☆

تمام رات تو گزری چراغ ہجر کے ساتھ
سحر قریب جو آئی تو سو گیا بیمار

☆

زندہ دلاں کے شہر میں وحشت ابھی بھی ہے
اک کاشف رشی کی ضرورت ابھی بھی ہے

☆

ممکن کہاں کہ برف سے تنہا بجھائی جائے
زخموں کی آگ میں حرارت ابھی بھی ہے

☆

ظلمت کدوں میں نور کے مینار ہوں نہ ہوں

پر اس سیاہ رات کی ظلمت ابھی بھی ہے

☆

وارفتگانِ عشق کا انجام کچھ بھی ہو

ان کے سروں پہ بازِ امانت ابھی بھی ہے

کاچو اسفندیار خان لداخ کے پہلے صاحب مجموعہ شاعر ہیں۔ کاچو اسفندیار خان کے علاوہ بھی اور کئی نام ہیں۔ جنھوں نے اُردو شاعری میں اپنی پہچان قائم کی ہے۔ مثلاً خالدہ باری (مرحومہ) منیر احمد، رقیہ بانو، چھرنگ آنگموں اور پنچگ آنگموں وغیرہ۔

غرض کہ جموں اور کشمیر کی طرح لداخ میں بھی اُردو زبان وادب کی صورت حال بحیثیت مجموعی اطمینان بخش ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں اول یہ کہ جموں اور کشمیر کی طرح لداخ بھی ایک اہم سیاحتی مرکز (Tourist Centre) ہے آمدورفت کے وسائل اور قیام وطعام کی سہولتوں میں اضافہ کی وجہ سے ملک اور بیرون ملک سے لداخ آنے والے سیاحوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ قومی سطح کے تجارتی، ثقافتی اور تعلیمی اداروں کی شاخیں بھی قائم ہو رہی ہیں جن میں مقامی کے علاوہ غیر مقامی ملازمین اور افسران بھی ملازمت کے حوالے سے لداخ میں رہتے ہیں۔ ریاستی پولس اور ملکی فوج کے افراد بھی یہاں بڑی تعداد میں تعینات ہیں۔ تعلیمی اداروں ریڈیو، ٹیلی ویزن، بینکوں وغیرہ میں بھی غیر لداخی ملازمین کافی تعداد میں ہیں اور ان سب کے لیے رابطے کی زبان اُردو ہی ہے۔ لداخ کے اسکولوں میں اُردو کی تدریس ہوتی ہے۔ بعض طلباء کشمیر، جموں اور دِلی کی یونیورسٹیوں سے اُردو میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر رہے ہیں۔ لیکن لداخ کے مشن اسکولوں میں اُردو زبان کی تدریس کی جانب سے بے توجہی برتی جا رہی ہے جس پر حکومت کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ بحیثیت مجموعی لداخ میں اُردو زبان وادب کی صورت حال مایوس کن نہیں ہے۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اُردو، جلد اول (دورِ قدیم) آغاز سے ۱۷۵۰ء تک، تمہید، ص ۷، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۷۷ء

۲۔ عبدالاحد آزاد: کشمیری زبان اور شاعری ص ۳۴۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر، ۱۹۹۸ء

۳۔ ایضاً ۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۴۱

۴۔ گوپی چند نارنگ: ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔ ص ۳۴۱۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۱۹۹۳ء

۵۔ عبدالقادر سروری: کشمیر میں اُردو، ص ۱۹۔ جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نیا اڈیشن، ۱۹۹۳ء

۶۔ ایضاً ۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳۸

۷۔ بحوالہ۔ ہمارا ادب: از۔ کلچرل اکادمی سرینگر، ۱۹۵۹ء، ص ۸۸

۸۔ سروِ آزاد: از۔ میر علی آزاد۔ ص ۱۹۷

۹۔ عبدالقادر سروری: کشمیر میں اُردو۔ حصہ اول، ص ۱۰۵۔ کلچرل اکادمی سرینگر ۱۹۷۹ء

۱۰۔ مقالات محمود شیرانی: از۔ حافظ محمود شیرانی۔ جلد دوم، ص ۲۲۰۔ انجمن ترقی اُردو ہند ۱۹۶۸

۱۱۔ عبدالقادر سروری: کشمیر میں اُردو، ص ۱۱۲۔ کلچرل اکادمی سرینگر ۱۹۷۹ء

۱۲۔ شیخ محمد عبداللہ: آتش چنار، ص ۲۵۶۔ گلشن بکس، ریزیڈنسی روڈ سرنیگر، ۲۰۰۸ء (دوسرا ایڈیشن)

۱۳۔ ڈاکٹر برج پریمی: جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو و نما ص ۱۸۔ رچنا پبلی کیشنز، نصیب نگر، پیوش کالونی جانی پورہ جموں، ۱۹۹۲ء

۱۴۔ حبیب کیفوی: کشمیر میں اُردو، ص ۱۷۔ مرکزی اُردو بورڈ لاہور، بار اول، ۱۹۷۹ء

۱۵۔ ڈاکٹر برج پریمی: جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما، ص۲۰۔ رچنا پبلی کیشنز جموں ۲۰۰۴ء (تیسرا ایڈیشن)

۱۶۔ عبدالقادر سروری: مضمون ''مہاراجہ رنبیر سنگھ اوران کا دارالترجمہ'' مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت''۔ از۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۲۰۱۱ء (دوسرا ایڈیشن)

۱۷۔ ڈاکٹر صوفی: بحوالہ، کشمیری پر اُردو کے اثرات۔ از۔ ڈاکٹر نذیر آزاد، ص۹۰۔ ناشر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۲ء

۱۸۔ محمد یوسف ٹینگ: پیش گفتار، کشمیر میں اُردو ص۱۱۔ کلچرل اکادمی سرینگر، ۱۹۸۲ء

۱۹۔ پروفیسر ظہوالدین: جموں میں اُردو زبان کا آغاز وارتقا، بحوالہ۔ جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما۔ از۔ ڈاکٹر برج پریمی، ص۱۸۔ رچنا پبلی کیشنز۔ جموں، ۱۹۹۲ء

۲۰۔ عبدالغنی شیخ: بحوالہ۔ لداخ۔ تہذیب وثقافت۔ ص۳۲۸۔ شیخ محمد عثمان اینڈ سنسز، سرینگر کشمیر۔ ۲۰۰۵ء

۲۱۔ ایضاً۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۳۲۹

۲۲۔ ایضاً۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۳۳۳

۲۳۔ جان محمد آزاد: جموں وکشمیر کے اُردو مصنفین، ص۲۰۵۔ جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر، ۲۰۰۴ء

۲۴۔ عبدالغنی شیخ: لداخ تہذیب وثقافت، ص۳۳۵۔ شیخ عثمان اینڈ سنسز تاجران کتب۔ سرینگر کشمیر۔ دوایڈیشن، ۲۰۱۲ء

باب سوم

1950 کے بعد جموں و کشمیر میں اُردو نثر کا تنقیدی جائزہ

1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اردو نثر کا تنقیدی جائزہ

دنیا کی بیشتر زبانوں میں نثر کا ظہور شاعری کے بعد ہوا لیکن نثر نے خصوصاً جدید زمانے میں بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ادب میں بھی شاعری کے برابر درجہ حاصل ہوگیا ہے۔آج انسان کو اپنی روزمرہ زندگی میں بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے۔وہ معلومات، وقت گزاری یا تفریح کے لئے ادب کا مطالعہ کرتا ہے۔نثر کا ہے؟۔۔۔نثر وزن، قافیہ اور ردیف کی پابندی سے آزاد تحریر ہوتی ہے جس کا بنیادی فریضہ معلومات بہم پہنانا ہوتا ہے۔نثر ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔اس میں مواد کی تعمیر ہوتی اور یہ لفظوں، فقروں اور جملوں کی منطقی اور نحوی ساخت پر اصرار کرتی ہے۔اس میں ہر طرح کے خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔نثر میں اگر نثر نگار جذبہ اور تخیل سے کام لے تو ایسی نثر شاعرانہ نثر کہلاتی ہے۔

نثر کی متعدد اصناف ہیں جن میں سے ایک کا نام ''ناول'' ہے۔ناول اردو میں انگریزی کے وسیلے سے آیا۔ اس کا اطلاق ان نثری قصوں پر ہوتا ہے جو نہ تو داستان کی طرح ہوں اور نہ جن میں صرف فرضی اور خیالی معرکے بیان کیئے گئے ہوں اور نہ قصوں کی طرح ان کی بنیاد مافوق الفطرت عناصر پر رکھی گئی ہو۔ناول سے مراد سادہ زبان میں ایسی کہانی ہے جس میں انسانی زندگی کے معمولی واقعات اور روزانہ پیش آنے والے واقعات کو اس انداز میں بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کو اس میں دلچسپی پیدا ہو۔یہ دلچسپی پلاٹ، منظر نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری سے پیدا کی جاتی ہے اور یہی ناول کے بنیادی عناصر ہیں۔اردو کے ابتدائی ناول نگاروں میں مولوی نذیر احمد خاص طور پر قابل

ذکر ہیں۔نذیر احمد کے پیش نظر معاشرے کی اصلاح تھی اس لئے ان کو اردو میں مقصدی ناول کا بانی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔تاہم یہ ایک طویل روایت ہے جس کو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔اصل موضوع جموں وکشمیر میں اردو نثر کے ابتدائی نقوش اور اردو نثر کی پیش رفت ہے۔اس لئے اسی حوالے سے بات کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

جموں وکشمیر اپنے دلفریب حسن اور فطری دلکشی کے باعث اردو ادب کا ایک مستقل موضوع ہے۔ یہاں صدیوں کے ظلم و جبر اور خطہء رنگ ونور کے باسیوں کی نا قابل بیان حالت نے حساس ادیبوں اور شاعروں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ایک کامیاب ناول نگار کی یہ خاصیت بھی ہوتی ہے کہ وہ زندگی اور سماج سے قریب تر ہو۔برصغیر ہندو پاک میں اسی دور کے بڑے نثر نگاروں میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اور قرۃ العین حیدر قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ ان میں سے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، اور قدرت اللہ شہاب کا تعلق کشمیر سے بلواسطہ طور پر رہا ہے اسی لئے کشمیر کی جھلک منٹو کے کہانیوں میں کہیں کہیں اور کرشن چندر کے افسانوں میں اکثر نظر آتی ہیں۔ان نثر نگاروں کی دیکھا دیکھی میں جموں وکشمیر کے بھی اہم نثر نگار سامنے آئے جن میں پریم ناتھ پردیسیؔ، اختر محی الدین، پریم ناتھ در، پشکر ناتھ، ڈاکٹر برج پریمی، نور شاہ۔حامدی کاشمیری، مخمور حسین بدخشی جیسے نام شہرت کے حامل ہیں۔جموں وکشمیر کے لکھنے والے دیگر اصناف نثر کی طرح اردو ناول کی جانب بھی متوجہ ہوئے۔آئندہ سطور میں جموں وکشمیر میں لکھے گئے اہم ناول زیر بحث ہوں گے۔ان ناولوں نے جہاں کئی اہم گوشوں کو وا کیا اس کے ساتھ ساتھ جموں وکشمیر میں اردو ادب کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

پنڈت ہرگوپال خستہؔ کو ریاست جموں وکشمیر کا پہلا باقاعدہ نثر نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ریاست جموں میں پنڈت ہرگوپال خستہؔ سے پہلے اردو نثر نگاری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ ہرگوپا خستہؔ کی تصنیف ''گلدستہ کشمیر'' جو ۱۸۷۷ء میں تصنیف ہوئی کشمیر کی پہلی نثری تصنیف ہے۔پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ نے اس وقت ریاست میں تباہ کاری کے خلاف آواز بلند کی تھی جس کے عوض انہیں سزا ہی نہیں ملی بلکہ ریاست سے نکال دیا گیا تھا اور خستہؔ لاہور میں

مقیم ہوئے۔لاہور میں قیام کے دوران بھی آپ نے اہل کشمیر کی حالت زار پر کئی کتابیں تصنیف کی۔۱۸۸۲ء میں آپ نے لاہور سے ایک اخبار ''خیر خواہ کشمیر'' کے نام سے جاری کیا جو عوام کی پسندیدگی کا باعث بنا اور یہ اخبار پنڈت خستہؔ کے بقیہ حیات تک جاری رہا۔

تصنیف ''گلدستہ کشمیر'' کی غرض وغایت اور سن تالیف کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے خستہؔ رقمطراز ہیں:

> ''۱۹۳۱ء بکرمی میں اس ناچیز نے ایک مختصر جغرافیہ کشمیر کا لکھا تھا جو کہ مطبع بہار کشمیر لکھنو میں چھپا تھا۔اس کے نامکتفی ہونے کے باعث دل کو یہ شوق پیدا ہوا کہ تواریخ کشمیر زبان اردو میں جو کہ فی زمانہ مروج اور زود فہم ہے بشمول جغرافیہ کشمیر جواب تک ہندوستانی زبانوں یا فارسی میں کسی نے نہیں لکھا ایس تیار کروں جس کے پڑھنے سے نظرین کو سطح کشمیر کا حال اس طرح معلوم ہو سکے گویا وہ کشمیر میں پھر کر سیر کر رہے ہیں۔۔۔۔۔تحقیق کیں اور ۱۹۳۴ء بکرمی (۱۸۷۷ء) میں بڑی احتیاط کے ساتھ بلا مبالغہ بہ ترک فضول نسخہ ہذا کو لکھ کر تین حصوں میں تقسیم کیا اور نام ''گلدستہ کشمیر'' رکھا حصہ اول میں جغرافیہ دویم میں حالات تاریخ سوئم میں نقشجات راستہ ہو وغیرہ لکھے۔''[۱]

کتاب کا مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خستہؔ نے کہنہ مشق اور منجھے ہوئے ادیب اور تاریخ دان کی طرح ادبی انداز اور محققانہ طرز اختیار کرتے ہوئے واقعات کی صحت کی جانچ پرکھ تحقیقی اور تنقیدی نقطہ نظر سے کی اور انھیں بیان کرنے کے لئے ایک دلکش انداز بیان کا سہارا لیا ہے۔

خستہؔ نے اس کتاب کے بعض حصوں میں ایسی نثر لکھی ہے جو مقفیٰ و مسجع بھی ہے اور ایسی رواں دواں شگفتہ بھی کہ ان کی نثر پر نظم ہونے کا گمان ہوتا ہے۔کتاب کے آغاز میں خدائے بزرگ کی حمد وثنا کے ذیل میں کیا دلکش انداز اختیار کیا ہے:

''ہر چند سب سے اول اس سلطان السلاطین کا نام لینا انسانی پر واجب ولازم ہے کہ جس کے حکم قضا شیم سے انتظام ملک جسم انسان وحیوان واہتمام زمین وآسمان قائم ہے۔مگر میں کیا اور میری زبان کیا جو ایسے کار دشوار میں دم مارسکوں اور ایسے قادر ۔۔۔کی توصیف کروں جس کی قدرت کاملہ سے ایک لفظ''کن'' کے ساتھ تمام عالم پیدا ہوگیا، عقل کہنہ رس کی کیا مجال جو اس صورت گرِ ندرت کے کارستانوں کے تماشے میں ایک شمہ بھی بتا سکے، قیاس اس کے حال دریافت کرنے میں حیران و سرگرداں ہے۔گمان اس کے سوچنے میں نگراں و پریشان ہے نہ فکر کو وہاں تک رسائی، نہ ذہن کو اس کی شناسائی ہے اس میں تقریر کا کام نہ تحریر کا کلام ہے، آسمان سے لے کر زمین تک جو شے ہے وہی اس مسبب الاسباب کی قدرت وعظمت کی گواہی دے رہی ہے۔''[۲]

کشمیر کے مناظر اور تاریخ بیان کرتے ہوئے بعض اوقات وہ ایک داستان کا روپ دھا لیتے ہیں اور کوئی قصہ کہانی سنانے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ داستانوی انداز کتاب کی دلچسپی میں بیش بہا اضافہ کرتا ہے۔جھیل ڈل کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے ایک باپ بیٹے کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں:

''روایت ہے کہ ایک تاجر نے اپنے لڑکے کو دو تین لاکھ روپے کا مال دے کر تجارت کے واسطے ہندوستان سے یہاں بھیجا تھا۔تجارت بالائے طاق رکھ کر اس نے سب روپے سیر ڈل میں ضائع کر دئے۔ باپ نے جب حساب طلب کیا اس نے لکھ بھیجا کہ روپیہ میاں ''ڈلو'' کے ذمہ ہے بہت مانگتا ہوں وہ کچھ نہیں دیتا۔ بلکہ اور مانگتا ہے۔ باپ اس کا پریشان ہو کر کشمیر میں پہنچا اور سیر دل میں ایسا گرفتار ہوا کہ بقیہ

دولت بھی کھو بیٹھا۔ ایک دب باپ بیٹا کشتی میں سوار سیر ڈل کر رہے تھے باپ نے
پوچھا بیٹا وہ میاں ''ڈلو'' کہاں رہتا ہے جو روپیہ نہیں دیتا بیٹے نے جواب دیا کہ یہی
حضرت ہیں جن کی آپ سیر فرما رہے ہیں۔ دونوں پشیماں ہو کر وہیں مر گئے اور گگری
بل میں دفن کئے گئے۔''[۳]

خستہ کی زبان ایک صدی قدیم ہونے کے باوجود اس قدر ندرت و تازگی لئے ہوئے ہے کہ بالکل آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کہیں کہیں متروک اور غیر معروف الفاظ ضرور ملتے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہے۔

نامور ماہر کشمیریات اور بسیار نویس محمد الدین فوق ایک جامع الحیثیات شخصیت کے مالک تھے آپ سینکڑوں کتابوں کے مصنف اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صحافت اور سیاست کے میدان میں بھی سرگرم رہے، سیکریٹری ''انجمن کشمیری مسلمانان'' کی حیثیت سے بھی آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ کشمیر کے موضوع پر جس شخص نے سب سے زیادہ کام کیا وہ محمد الدین فوق ہی ہیں۔ اس موضوع پر انہوں نے ذاتی حیثیت میں جتنا زیادہ اور گرانقدر کام کیا وہ اس مقصد کے لئے قائم کئی ادارے بھی انجام نہیں دے سکے۔ آپ کی ان خدمات کے عوض حضرت علامہ اقبال آپ کو ''مجدد الکشامرہ'' کہتے تھے۔ فوق کا خاندان اگرچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں کشمیر سے پنجاب آ بسا تھا لیکن فوق کی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گذرا۔ بقول حبیب کیفوی:

''فوق مرحوم نے اہل کشمیر کی خدمت کرنا زندگی کا نصب العین بنایا ہوا تھا۔ موسم
گرما شروع ہوتے ہی وہ کشمیر پہنچ جاتے ہیں اور جہاں جہاں بھی انھیں مطلوبہ
معلومات حاسل ہوتی ہیں وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہوں نے کشمیر کے لئے ہی ادبی
علمی اور تاریخی کارنامے انجام دیئے بلکہ اس کے علاوہ بھی انہون نے بہت کام کیا
ہے ان کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے۔ تعجب ہے کہ اخبار نویسی کے ساتھ

ساتھ انہوں نے اتنا کام کس طرح انجام دیا۔علامہ اقبال انہیں ''مجدد الکشامرہ'' کہا کرتے تھے۔''۴۹

فوق بیسویں صدی کے نصف اول میں ادب ،صحافت اور تاریخ نویسی کے افق پر ایک نامور اور ممتاز شخصیت کے طور پر ابھرے آپ نے مختلف موضوعات پر سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں اور مختلف اوقات میں ۶ رسالے جاری کئے۔ان رسالوں کے ذریعے فوق نے مسلمانان پنجاب اور کشمیر کی فکری اصلاح اور آزادی کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔

فوق نے جو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ تاریخ کشمیر جلد اول
۲۔ تاریخ کشمیر جلد دوم
۳۔ تاریخ کشمیر جلد سوم
۴۔ تاریخ اقوام کشمیر جلد اول
۵۔ تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم
۶۔ تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم
۷۔ تاریخ اقوام پونچھ جلد اول
۸۔ تاریخ اقوام پونچھ جلد دوم
۹۔ تاریخ شالامار
۱۰۔ یادرفتگان
۱۱۔ تذکرہ العلماء ومشائخ لاہور

۱۲۔ لاہور عہد مغلیہ میں

۱۳۔ تاریخ حریت السلام (اس کے علاوہ کئی اور)

سوانح

۱۔ سلطان زین العادین

۲۔ مشاہیر کشمیر

۳۔ ملادو پیازہ

۴۔ نواب دبیر الملک

۵۔ تذکرۃ العالمین

۶۔ حیات مولانا روم

۷۔ داتا گنج بخش

۸۔ خاتون جنت

۹۔ حیات نور جہاں و جہانگیر

۱۰۔ مہاتمہ گاندھی

۱۱۔ تذکرہ خواتین دکن

۱۲۔ محبّ وطن خواتین ہند

۱۳۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی

۱۳۔ للہ عارفہ

۱۴۔ خواتین کشمیر

۱۵۔ حسن بصری

۱۶۔ مجدد الف ثانی

ناول

۱۔ انارکلی

۲۔ رام کہانی

۳۔ اکبر

۴۔ خانہ بربادی

۵۔ محروم تمنا (کئی اور)

شاعری

۱۔ کلام فوق

۲۔ نغمہ وگلزار

۳۔ سکاؤٹوں کے گیت

رسالے

۱۔ پنجہ فولاد نومبر ۱۹۰۱ء

۲۔ کشمیری میگزین، جنوری ۱۹۱۹ء

۳۔ رسالہ ''نظام''، فروری ۱۹۱۹ء

۴۔ اخبار ''کشمیر جدید'' ۱۹۳۶ء

فوق کی یہ جدو جہد اور مختلف جہتیں انہیں ایک ہمہ گیر علمی وادبی شخصیت کے روپ میں سامنے لاتی ہیں اور یہی

وہ خوبی ہے جو انہیں فکری اور عملی یکسانیت کے باعث سرسید احمد خان کے قریب کر دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر اجمل نیازی:

> ''فوق کی یہ جدوجہد علم و عمل کی ایک مشترک رویے کی نشاندہی کرتی ہے جس کا آغاز سرسید احمد کی ہمہ گیر شخصیت کی بدولت ممکن ہوا اس طرح بالواسطہ طور پر فوق کو سرسید کے رفقا میں شمار کیا جا سکتا ہے۔''۵

تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کے بعد فوق کی تیسری حیثیت ایک ناول نگار کی ہے۔ مجموعی طور پر فوق نے کم و بیش ۱۴ ناول لکھے لیکن ''انارکلی'' کے سوا ان کے باقی ماندہ ناولوں کو بمشکل ہی ناول کہا جا سکتا ہے۔ انارکلی اور اکبر تاریخی نوعیت کے ناول ہیں جبکہ باقی ناول معاشرتی مسائل کے حوالے سے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی لکھتے ہیں:

> ''فوق کا افسانوی ادب بھی مقصدی ادب کے ذیل میں آتا ہے۔ فوق کا افسانوی ادب، ناول حکایات اور ایک غیر مطبوعہ ڈرامے پر مشتمل ہے یہ بات تحقیقی نقطہ نظر سے تعجب خیز ہے کہ اردو ادب کی تاریخوں اور ناول کے تنقیدی جائزوں میں فوق کی ناول نویسی پر کوئی مواد نہیں ملتا۔ جبکہ ان کی دیگر حیثیات کے بارے میں مشاہیر اور اہم ہم عصروں کی آراء موجود ہیں اس صورتحال میں فوق کے ناولوں کا مطالعہ ناول کے مورخوں اور نقادوں کے لئے بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ امید ہے اب فوق کے ناولوں کو بھی ناول نگاری کے تجزیے میں شامل کیا جائے۔''٦

حقیقت یہ ہے فوق کی باقی ادبی حیثیت اتنی بلند اور نمایاں ہیں کہ ان کے بطور ناول نگار ابھرنے کے امکانات کم تھے اور اگر وہ ناول اور ڈرامے نہ لکھتے تو بھی ان کا ادبی مقام کم نہ ہوتا فوق کے متعلق یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ کسی بھی موضوع یا شخصیت پر لکھنے پہلے اسے اپنی محبتوں کا مرکز بناتے ہیں، اس کی تفصیلات و جزیات حاصل کرتے ہیں۔

کشمیر کی علمی وادبی اور تاریخ میں ایک حق گو، غیر متعصب اور جرات مند حقیقت نگار کے بطور پر پنڈت پریم ناتھ بزاز لاثانی شہرت کے حامل ہیں۔ بزاز یوں تو اپنے علمی مرتبے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں لیکن ان کی پہچان اور وجہ شہرت ایک بے باک اور نڈر صحافی کے طور پر ہے وہ اپنے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر اور غیر متعصّبانہ طرز عمل کے کشمیر مسلم وغیر مسلم سب میں یکساں معروف اور ہر دلعزیز رہے ہیں۔

ایک بلند پایہ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ بزاؔر نے انگریزی اور اردو میں کئی مستقل تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

۱۔ شاعر انسانیت (عبدالاحد آزاد کا کلام پر تبصرہ)

۲۔ کشمیر کا گاندھی (اہل کشمیر کی جدوجہد آزادی کی کہانی)

۳۔ ان سائیڈ کشمیر

۴۔ جدوجہد آزادی کشمیر

۵۔ کشمیر کی سچی کہانی گاندھی ازم، جناح ازم، سوشلزم

۶۔ آزاد کشمیر

جموں وکشمیر کو اپنے جن ادیبوں پر ناز ہے ان میں قدرت اللہ شہاب کا نام بھی قابل ذکر ہے۔شہاب کا نام اردو کے ان خوش قسمت ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے علم وادب سے جز وقتی تعلق کے باوجود اس قدر اعلیٰ ادب تخلیق کیا کہ اردو ادب کی تاریخ میں انہیں ایک مستقل اور بلند ترین مقام حاصل ہو گیا۔شہاب اپنے سماجی مرتبے کے لحاظ سے بھی ایک بڑا اور اہم نام ہیں۔لیکن بنیادی طور پر وہ ایک ادیب اور ادب شناس انسان کا دل ودماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔۹۔۱۰ سال کی عمر میں ماگھی رام کے کباڑ خانے سے ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار جیسے ادیبوں اور ناول نگاروں کی تصانیف حاصل کرنا اور اسکول سے بھاگ کر بند کمرے میں ان کا

دلجمعی سے مطالعہ کرنا اوران کے اسلوب کواپنانا اولین اکتساب کا ذکر کرتے ہوئے قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

''کوئی تین ہفتے میں اسی طرح کرم کتابی بن کر اپنی بیٹھک میں معتکف رہا۔جتنی محنت میں نے ان ایام میں کی ہے ساری عمر پھر نہیں کی۔بیس بائیس دن کے بعد جب میں نے دوباری اسکول جانا شروع کیا تو جس دم کرنے والے جوگیوں کی طرح میری کایا کلپ ہو چکی تھی۔ ماسٹر سنگھ کے خوف سے زبان میں لکنت کی جگی ''آب حیات'' کے پرشکوہ فقرے فراٹے بھرنے لگے تھے،تنہائی میں میری حدیث نفس بھی عبدالحکیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کی عبارت میں ہونے لگی۔کلاس روم میں تابڑتوڑ تین چار جواب مضمون لکھ کر میں نے اپنا سکہ ایسا بیٹھا دیا کہ کبھی کبھی ماسٹر منگل سنگھ اردو کا سبق میرے سپرد کر کے خود غائب ہو جاتے تھے۔''[۷]

کچھ اپنے فطری میلان اور کچھ اعلیٰ پائے کے اردو انگریزی ادب کے مطالعہ نے لڑکپن میں ہی شہاب کو ایک ادیب کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا لیکن ان کے ادبیانہ کمالات کی ابتدا قیام لاہور سے ہوئی۔ جب شہاب جموں سے بی ایس سی کرنے کے بعد ایم اے انگریزی کرنے کی غرض سے ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک ہندو دوشیزہ چندراوتی سے ملاقات اوراس کے عشق نے قدرت اللہ شہاب کے ادبی ذوق کے لئے مہمیز کا کام کیا۔چندراوتی اور شہاب کے عشق کی داستان تو زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور وہ جلد ہی انہیں مفارقت دے کر ''سرگباش'' ہوگئی لیکن اس کی موت شہاب کو ایک افسانہ نگار کے روپ میں منظر عام پر لے آئی۔

چندراوتی کی بے وقت موت شہاب کو بے آسرا اور نڈھال کر دیتی ہے وہ مجنوں کی طرح ان شاہراہوں

پر آوارہ گردی میں مصروف ہو جاتے ہیں جن پر کبھی وہ اپنی بائیسکل پر چندراوتی کو لے کر گھوما کرتے تھے۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

''چلتے چلتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے جب مزید چلنے کی سکت باقی نہ رہی تو میں گورنمنٹ کالج کے لان میں واپس آ گیا اور اپنا پہلا افسانہ لکھنے بیٹھ گیا۔ افسانے کا عنوان چندراوتی تھا۔ افسانہ لکھتے لکھتے میں کئی بار رویا کئی بار ہنسا مکمل کرنے کے بعد میں نے یہ کہانی اختر شیرانی کی خدمت میں بھیج دی انہوں نے اسے پسند فرمایا اور مجھے بڑا پیارا خط لکھا اور افسانہ انہوں نے ''رومان'' میں شائع کر دیا۔'' ۸؎

جس تصنیف نے قدرت اللہ شہاب کو شہرت عام اور بقائے دوام کا درجہ دلایا ان کی شہرہ آفاق خودنوشت ''شہاب نامہ'' ہے اردو میں سینکڑوں اعلیٰ پائے کی آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی لیکن آپ بیتی کے طور پر جو شہرت اور مقبولیت شہاب نامہ کو ملی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ کم عرصے میں اس کے جتنے ایڈیشن چھپے ہیں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔

''شہاب نامہ'' بادی النظر میں قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت سوانح عمری ہے لیکن حقیقت میں ''شہاب نامہ'' اپنے عہد کی ایک ہمہ جہت اور مستند دستاویز اور دلچسپ تاریخ ہے۔ جس میں ایک محقق کے لئے تاریخ کے گوشے وا ہوتے ہیں اور ادب کت قاری کے لئے ادبی حظ اور چاشنی کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جہاں مصنف کی ذاتی زندگی کے نشیب و فراز نظر آتے ہیں۔ وہاں کشمیری مسلمانون کی حالت زار، وقتی حکمرانوں کی چیرہ دستیاں، تحریک پاکستان کے دوران میں مسلمانان ہند کا جوش و ولولہ، سکھوں کے مظالم، مہاجرین کی بے سروسامانی، پاکستانی حکمرانوں کی کوتاہ اندیشیاں سیاست دانوں کی من مانیاں، نوکر شاہی اور بیوروکریسی کی دھاندلیاں بھی شہاب نامہ کی وساطت سے دیکھنے کو ملتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کتاب میں قلب و نظر کے مشاہدات اور تزکیہ نفس کے

معاملات کا حسین امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔

''شہاب نامہ'' کے چار اہم موضوع ہیں۔

۱۔ کشمیر

۲۔ پاکستان

۳۔ اسلام

۴۔ قدرت اللہ شہاب اور ان کا خاندان۔

ان چار موضوعات کی جزئیات وتفصیلات اٹھاون ابواب پر محیط ہیں۔ ہر باب ازخود مکفی اور مکمل ہوتے ہوئے بھی دوسرے باب کے ساتھ کچھ اس طرح مربوط ہے کہ یہ ارتباط موتیوں کیا یک خوشنما لڑی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔شہاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات کو بھی سپاٹ اور روایتی انداز میں بیان کرنے کے بجائے ایک ایسا دلچسپ اور افسانوی انداز اختیار کرتے ہیں کہ معمولی واقعہ بھی غیر معمولی بن کر قاری کی توجہ بن جاتا ہے۔

اگر اکیسویں صدی کی بات کی جائے تو صرف چند ناول نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں اور اُن کے ناولوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ یہ ناول انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جموں وکشمیر میں اُردو ناول کی روایت ویسے بھی کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے۔یہاں آزادی کے بعد ہی اُردو ناول کی طرف توجہ دی گئی ہے اور جس طرح یہاں اُردو افسانے کو فروغ ملا ہے اُس اعتبار سے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ناول کی صورتِ حال مایوس کن ہے یہاں ناول کم لکھے گئے ہیں لیکن جو ناول وجود میں آئے ہیں وہ بھی بلاشبہ ان فنی معیاروں کی کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے ہیں جو اُردو میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین یا پھر موجودہ دور میں مشرف عالم ذوقی، پیغام آفاقی، غضنفر اور عبدالصمد وغیرہ نے قائم کئے ہیں۔لیکن پھر بھی بعض ناول ایسے ہیں جن کی شہرت ومقبولیت ریاستی سطح

پر ہی نہیں ہے بلکہ ملکی سطح پر بھی مسلم ہے بقول نور شاہ۔

> ''ناول نگاری کے پسِ منظر میں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ریاست سے تعلق رکھنے والے اُردو ادیبوں اور قلم کاروں کو ناول کی بجائے افسانوں میں دلچسپی رہی ہے اور افسانوی ادب کو ایک مقام دلانے میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں ۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ریاست میں جتنے بھی ناول لکھے گئے وہ ریاست سے باہر ناول نگاروں کے ناولوں سے کسی طور پر کمزور نہیں بلکہ ان میں سے اکثر ناول ملکی سطح کے معیار پر پورے پورے اُترتے ہیں۔'' ۹

جموں و کشمیر میں لکھے جانے والے اُردو ناول فنی، تکنیکی اور موضوعی اعتبار سے کافی حد تک روایتی ہیں۔ ان ناولوں کی مقبولیت و شہرت کا سبب جنتِ بے نظیر ہے یعنی ان ناولوں میں کشمیر کے متعدد موضوعات، سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، سحر آلود مناظر، فطری حسن اور یہاں کی سسکتی، تڑپتی زندگی کے رنگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ ناول کشمیر کی سچی اور حقیقی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں اُردو کے چند ناول نگار ہی سامنے آتے ہیں۔ اس لئے اکیسویں صدی میں ناول نگاری کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ اگر اُس سے قبل چند سطور میں جموں و کشمیر میں اُردو ناول کی روایت پر روشنی ڈالی جائے تو بجا نہ ہوگا۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو ناول نگاری نے باقاعدہ طور پر ۱۹۴۷ء کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ اس سے پہلے جو ناول لکھے گئے وہ اخباروں میں قسط وار شائع ہوتے رہے لیکن پریم ناتھ پردیسی کا ناول ''پوتی'' شائع ہوتے ہوتے رہ گیا کیونکہ تقسیمِ ملک کے وقت اس کا مسودہ ضائع ہو گیا۔ ''اور انسان مر گیا'' رامانند ساگر کا فسادات پر ایک اہم ناول مانا جاتا ہے۔ اس ناول کو رامانند ساگر نے ابتدا میں ''فساد اور امن'' کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ خواجہ

احمد عباس ناول کے پیش لفظ میں اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

''یہ ہنگامی لٹریچر نہیں ایک کلاسیک ہے۔اس کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ مرتی ہوئی انسانیت کی صدائے بازگشت ہے۔۔۔۔۔۔۔اس میں آپ خوب پہچان لیں گے کہ انسانیت کی مرنے کے بعد شکل کیا ہوجاتی ہے۔'' ۱۰

ڈاکٹر برج پریمی ناول ''اور انسان مر گیا'' کے بارے میں اپنی کتاب ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما'' میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

''فسادات کے موضوع پر لکھا ہوا یہ ناول کافی متنازعہ فیہ رہا اور ایک عرصے تک پورے برصغیر کے ادبی حلقوں میں موضوع بحث بنا رہا۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔یہ ناول انتہائی ذہنی اور جذباتی خلفشاروں کے دوران ایک ہنگامی موضوع پر لکھا گیا ہے۔جس کی بنیاد فرقہ وارانہ فسادات ہیں''۔ ۱۱

ریاست جموں وکشمیر میں مذکورہ ابتدائی دور کے لکھے گئے ناولوں کا ذکر تو ریاستی ادب کی تاریخی کتابوں میں ہر جگہ ملتا ہے لیکن مایوس کن بات یہ ہے کہ یہ ناول آج کہیں بھی دستیاب نہیں ہیں۔

نرسنگھ داس نرگس نے جموں کے دیہاتوں کے پسِ منظر میں ناول لکھے ہیں۔نرگس ایک ادیب، ناول نگار اور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے۔ان کے ناولوں میں ''پاربتی''، ''نرملا'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نرسنگھ داس نرگس کے ہم عصروں میں کشمیری لال ذاکر اور ٹھاکر پونچھی کے نام بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔کشمیری لال ذاکر نے ''سیندور کی راکھ'' لکھ کر ناول نگاری کے میدان میں اپنی پہچان بنائی اور بعدہ انہوں نے کئی کامیاب ناول تخلیق کر کے ادبی دُنیا میں اپنا ایک الگ مقام بنا لیا۔ان کے اہم ناولوں میں ''

انگوٹھے کا نشان‘‘،’’ دھرتی صدا سہاگن رہے‘‘،’’کرماں والی‘‘،’’لمحوں میں بکھری زندگی‘‘ ،’’جاتی ہوئی رت‘‘،’’خون پھرخون ہے‘‘،’’ڈوبتے سورج کی کتھا‘‘،’’چھٹی کا دودھ‘‘،’’ چارمیل لمبی سڑک‘‘اور’’میں اسے پہچانتی ہوں‘‘وغیرہ قابل قدر ناول ہیں۔

ٹھاکر پونچھی بحیثیتِ افسانہ نگارکسی زمانے میں بہت معروف تھےلیکن ان کی شہرت ومقبولیت کی وجہ ان کے ناول ہی ہوئے۔جن میں’’رات کے گھونگھٹ‘‘،’’وادیاں اورویرانے‘‘،’’شمع ہررنگ میں جلتی ہےسحرہونے تک‘‘،’’چاندنی کےسائے‘‘،’’پیاسے بادل‘‘،’’یادوں کےکھنڈر‘‘،’’زلف کےسرہونےتک‘‘اوراب میں وہاں نہیں رہتا‘‘ اہم اور کامیاب ناول اردو ادب کو دیئے ہیں۔ان کے ناولوں کی فنی خصوصیات کوتفصیلاً بیان کرنے کے بجائے مناسب یوں ہے کہ برج پریمی کا یہ قول نقل کیا جائے۔

’’ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ایک طرف ترقی پسندی کے رجحانات کارفرما ہیں اور
دوسری طرف ڈوگرہ طرز زندگی کی حقیقت آمیز تصویریں بھی ملتی ہیں‘‘۔ ۱۲؎

ٹھاکر پونچھی کے بعد تیج بہادر نے ولرجھیل کے پسِ منظرمیں ایک خوبصورت ناول’’سیلاب اورقطرے‘‘ لکھا ہے۔جس میں ایک غریب سنگھاڑے جمع کرنے والے خاندان کی زندگی کی روداد ہے۔غلام رسول سنتوش نے بھی چند کہانیوں کے علاوہ ایک ناول’’سمندر پیاسا ہے‘‘ لکھا جوایک بیانیہ ناول ہے۔علی محمد لون بحیثیت افسانہ نگار پوری دنیا میں معروف ہیں۔لیکن ایک زمانے میں انہوں نے بھی اپنے قلم کا ذوق بدلنے کے لئے اپنا رجحان ناول کی طرف مرکوز کیا۔انہوں نے’’شاید ہے آرزو تیری‘‘ ایک ہی ناول لکھا۔جس میں دہلی کی معاشرت کو دور بینی کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اکیسوی صدی کے ناول نگاروں میں اُنہیں لوگوں کوشمار کیا جاتا ہے جوگذشتہ ایک دو دہائیوں سے اُردوناول نگاری کوفروغ بخشتے آرہے ہیں۔اوروہ لوگ آج بھی اپنے خونِ جگر سے اس صنف کی آبیاری

میں محو ہیں۔ان میں نور شاہ، حامدی کاشمیری، ترنم ریاض، آنندلہر، جان محمد آزاد، حسّی سید ساحل، خواجہ فاروق اور بھوشن لال بھوشن وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

نور شاہ نے دو ناول ''نیلی جھیل کالے سائے'' اور ''پائل کی زنجیر'' لکھے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے تین ناولٹوں کا مجموعہ ۲۰۰۹ء میں میزان پبلشرز سرینگر نے ''نور شاہ کے تین ناولٹ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔اگر ان ناولٹوں کو بھی ناول مان لیں تو پھر نور شاہ کے نالوں کی تعداد پانچ ہو جاتی ہے۔افسانوں کی طرح نور شاہ کے ناول بھی ان کے مخصوص مزاج اور ذوقِ جمال کے ہی آئینہ دار ہیں۔نور شاہ کا ناول ''آؤ سو جائیں'' ماہنامہ شاعر کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا۔''شاعر'' کے مدیر اعجاز صدیقی نے نور شاہ کے فنی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''نور شاہ کی تحریروں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں، اندازِ بیان میں شگفتگی رچاؤ اور موسیقی ہے۔کچھ تو حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت و جلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہین منت، نور شاہ بطورِ کہانی کار مقبول و معروف ہیں ۔نور شاہ کی تحریروں میں شعور کی فکر اکثر ملتی ہیں۔زبان و اسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے''آؤ جائیں'' جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے۔وہیں ایک یگ کی کہانی بھی ہے۔ اس ناول میں نور شاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کشائی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔'' ۱۳؎

اعجاز صدیقی کی مذکورہ بالا رائے سے نور شاہ کے ناولوں کی زبان اور اسلوب کا بلخصوص ہو جاتا ہے۔عام لوگوں کے علاوہ خود نور شاہ بھی یہ مانتے ہیں کہ ''زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے ہی پھوٹتے ہیں''۔لیکن یہ رومان عام معنی کا رومان نہیں ہے بلکہ رومان کا یہ تصور اس پوری کائنات کے بارے میں مثبت سوچ سے عبارت ہے۔نور شاہ لازوال حسن فطرت کے حوالے سے انسانوں کے ذہن و ضمیر میں پوشیدہ حسن و خیر کی قدروں کو نمایاں

کرنے پر یقین رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں کشمیر کے حسن کو برف پوشپہاڑوں، سرسبز وادیوں باغوں اور دریاؤں کے حوالے سے تو سمیٹا ہی ہے لیکن کشمیر کی ثقافت اور اہل کشمیر کی سادہ لوحی اور حلیمی کو اپنے کرداروں کے ذریعے جیتے جاگتے روپ میں پیش کیا ہے۔ سلونی، صنوبر، راشد، برج، نیلی، اقبال، اختر، سلمی، احسن وغیرہ نورشاہ کے ناولوں کے اہم کردار ہیں۔ نورشاہ نے یہ کردار محنت سے تراشے ہیں۔ نورشاہ کے کردار سادہ بھی ہیں، احسن کی طرح پیچیدہ بھی ہیں۔ اختر کی طرح نورشاہ نے اپنے کرداروں کی نفسیات کا تجزیہ جگہ جگہ بڑی مہارت اور سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لیکن نورشاہ کے بعض کرداروں کی سچائیاں عام قارئین کو ناگوار بھی لگ سکتی ہیں۔ مثلاً ان کے ناول ''آؤ سو جائیں'' کے کردار ''راشد'' ناول کی ہیروئن ''نیلی'' سے یہ کہتا ہے۔

> ''میں حقیقی زندگی کا قائل ہوں۔ اسی لیے ذہنی رشتوں پر جسمانی رشتوں کو ترجیح دیتا ہوں''۔ ۱۴

نورشاہ اپنے ناولوں میں جدید موضوعات اور کرداروں کو پیش کرتے ہوئے بھی اپنی زمین اور اپنے کشمیر کو نہیں بھولتے ہیں۔

> ''یہ کوئی بہادری نہیں کہ تم نے اپنے مکان کی سیڑھیوں پر سونا بچھا رکھا ہے اور گھر میں صندل کے دروازے اور کھڑکیاں لگا رکھی ہیں یا اس کی اونچی بنیادیں سونے کی انیٹوں سے تعمیر کی ہیں۔ بہادری تو یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی تلوار سے کھلینا سیکھو۔ یہ آزادی کی باتیں شاعر، کشمیر آزادی کی آواز ہے، عوام ظلم، غربت، ناانصافی، پس ماندگی اور جہالت کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ اور خودغرض لیڈر شان وشوکت سے رہتے ہیں۔ یہ کشمیر ہے۔ بڈشاہ کا کشمیر، لل دید اور نورشاہ الدین ولی کا کشمیر یہ میرا کشمیر ہے .... میرا گھر رات اتنی تاریک کیوں ہے؟ یہ اندھیرا کیسا ہے؟'' ۱۵

نورشاہ نے افسانوں کی طرح اپنے ناولوں میں بھی بیانیہ کے مختلف تجربے کیے ہیں۔کرداروں کی خارجی اور باطنی دنیاؤں کو کبھی بلا واسطہ تو کبھی بالواسطہ پر بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔اکثر نورشاہ کا اسلوب ایک دلکش استعاراتی فضا کی تشکیل بھی کرتا ہے جوان کے مخصوص رومانی مزاج سے ہم آہنگ ہے۔

ریاست جموں کشمیر میں ہی نہیں بلکہ کُلی طور پر اُردو فکشن کی روایت کو مستحکم کرنے میں ترنم ریاض کا نام سرِ فہرست ہے۔ترنم ریاض ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔اُردو فکشن میں وہ افسانہ اور ناول کے علاوہ صحافت،تنقید اور شاعری کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔اس کے علاوہ برقی میڈیا سے وابستگی نے ان کے فن اور شخصیت میں ایک دانشورانہ رمق پیدا کر دی ہے جس کا مظاہرہ ان کی شاعری،افسانوں اور ناولوں میں کھل کر ہوتا ہے۔

جموں و کشمیر کے اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں ترنم ریاض کا نام بڑا معروف و معتبر ہے۔ترنم ریاض کا پہلا ناول ''مورتی'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔یہ ناول ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اس ناکامی کے اسباب پر مبنی ہے۔اس ناول میں ایک تعلیم یافتہ اور خوبصورت مجسمہ ساز لڑکی ''ملیحہ'' کی کہانی پیش کی گئی ہے۔جس کی شادی ایک کاروباری بدذوق انسان سے ہو جاتی ہے۔لیکن ناول کا اختتام الم ناک انداز میں ہوتا ہے۔ملیحہ کا شوہر بے حد دولت مند ہے وہ ملیحہ کے ظاہری حسن کو تو محسوس کرتا ہے مگر اس کے اندر کے فنکار کو پہچان نہیں پاتا۔ملیحہ بے حد حساس اور نازک خیال ہے لیکن اس کے شوہر کے اندر جذبات اور احساسات کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ملیحہ فن کے اظہار اور اس کی نمائش کی راہ تلاش کرتی ہے اور گھر کے تہہ خانے میں مورتیاں خلق کرتی ہے۔ترنم ریاض کا بیانیہ بے حد پُر تاثر اور تہہ دار ہے۔ملیحہ کے لیے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔واقعات اور رشتے اس کو متاثر کر تے ہیں۔اسی لیے ملیحہ بے حد جذباتی ہے لیکن اس کا شوہر بے حس ہے اس کے لیے جذبات و احساسات کی کوئی اہمیت نہیں۔اُسے جو بھی چیز پسند آتی ہے اُسے خرید کر لے آتا ہے۔وہ یہ سمجھنے کے لیے قاصر ہے کہ ہر چیز خریدی نہیں

جاسکتی۔خلوص، انسانیت اورمحبت خرید وفروخت سے بہت بلند نعمتیں ہیں۔اپنے شوہر کے رویے کی وجہ سے ملیحہ کے اندر کا فنکار رفتہ رفتہ ٹوٹتا پھوٹتا رہتا ہے۔اس کی بنائی ہوئی مورتیوں کی طرح ترنم ریاض نے ناول کے آغاز میں ہی استعاراتی انداز میں ''ملیحہ'' کے داخلی وجود کو بیان کردیا ہے۔

> ''ٹوٹے ہوئے پنکھ والی فاختہ کے مجسمے کی چونچ ٹوٹ گئی تھی اور آنکھ کی پتلی کی سیاہی
> غالباً بارش سے دھل گئی تھی ....مرد کے مجسمے کا کندھا ٹوٹ چکا تھا اور ٹوٹا ہوا
> کندھا حصّے کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ ہرن کے بچے کا داہنا کان آدھا ٹوٹا ہوا تھا
> ....کتّے کی آدھی دم بھی ٹوٹ گئی تھی اور اسی پتھر پر پڑی ہوئی تھی............سادھو
> کے سر کے اُوپر تراشا گیا جوٹوٹ چکا تھا اور پدم آسن میں مڑی ہوئی اس کی ٹانگوں
> کے قریب اس کی گود میں پڑا تھا۔'' ۱۶

ترنم ریاض کا ناول ''مورتی'' پلاٹ اور مرکزی کرداروں کے علاوہ اپنے موضوع کو بھی عمدگی سے پیش کرتا ہے۔

ترنم ریاض کا دوسرا اہم ناول ''برف آشنا پرندے'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آیا۔ترنم ریاض نے اس ناول میں کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کو سمیٹ کر کشمیر کی سماجی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کو پیش کیا ہے۔ناول کشمیر کی سماجی تاریخ پر مبنی ہے۔ مصنفہ نے کشمیر کی صدیوں کی تاریخ کئی صفحات پر بیان کی ہے جس میں کشمیر کی شناخت، کشمیری افراد کے مصائب، کشمیر کی قدرتی خوب صورتی، کشمیر کے پکوان وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔

ناول میں کشمیر کی تہذیبی تاریخ کا پسِ منظر خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار شیبا ایک دلچسپ کردار ہے۔چونکہ ناول کا سارا منظر شیبا کے اردگرد پھیلا ہے اس لیے شیبا کے کردار میں یکسانیت پورے منظر میں دکھائی دیتی ہے۔اس کے علاوہ ناول میں مصنفہ نے تاریخی حوالوں کا ذکر بڑی مشقت سے کیا ہے جو ناول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ترنم ریاض کا ناول ''برف آشنا پرندے'' ایک چمن کی مانند ہے جس کی سیر کر کے

دل شاداں ہو جاتا ہے۔اسی لیے اس ناول کو کئی ناقدین نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا اہم ترین ناول قرار دیا ہے۔''برف آشنا پرندے'' کی موضوعاتی ،فکری وثقافتی انفرادیت کی بنا پر ترنم ریاض کا شمار بجا طور پر موجودہ دور کے نمائندہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔

آنندلہر:۔ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے ناول نگاروں میں ایک اہم نام آنندلہر کا ہے۔آنندلہر نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور اب تک ان کے دس کے قریب افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے ناول نگاری کے میدان میں بھی قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔پیشے کے لحاظ سے آنندلہر وکیل ہیں اور ناول نگار کی حیثیت سے ناول نگاری کے سلسلے کو آگے بڑھایا ہے۔

آنندلہر کا پہلا ناول ''سرحدوں کے بیچ'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہو کر منظر پر آیا۔اس ناول میں انہوں نے ہندوستان کی تقسیم اور سرحدوں کے دونوں جانب رہنے والے لوگوں کی دقتوں کا خلاصہ پیش کیا ہے۔آنندلہر کے اس ناول کی اُردو کی ادبی دنیا میں کافی پزیزائی ہوئی۔اس کے بعد ان کے تین ناول اور منظرِ عام پر آئے۔

آنندلہر کا دوسرا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' ہے، یہ ناول ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔اس ناول میں کشمیر کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔اس ناول میں آنندلہر نے کشمیریوں کی مذہبی روا داری اور اُن کی مہمان نوازی کا احاطہ پیش کیا ہے۔اس ناول میں دو کرداروں عبدل اور بدری کے ذریعے کشمیریوں کے آپسی بھائی چارے کی وضاحت بھی کی گئی ہے اور ہندو، مسلم سکھ اتحاد کے نعرے کو ایٹم بم سے زیادہ طاقتور قرار دیا ہے۔''اگلی عید سے پہلے'' پلاٹ، کہانی، زبان و بیان، کردار نگاری، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری کے لحاظ سے ایک عمدہ ناول ہے۔ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کی کہانی ختم ہونے پر خود قاری تلملا اُٹھتا ہے۔

آنندلہر کا تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں آنندلہر نے جنگ کے اسباب، جنگ کی تباہ کاریاں اور جنگ کے بعد ہولناک مناظر کی عکاسی کی ہے۔ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں پرندوں اور جانوروں کی زبانی تباہی و بربادی

کے المیے کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول اصل میں امریکہ کی طرف سے بلا وجہ عراق پر حملے اور جنگ کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے۔اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کاروباری جنگ سے نہ صرف انسان تباہ ہوتا ہے بلکہ چرند، پرند اور روئے زمین پر پیدا ہونے والے نباتات، حیوانات اور ماحولیات کی بربادی بھی ہوتی ہے۔

آنند لہر کا چوتھا ناول ''یہی سچ ہے'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں انہوں نے زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔اس ناول کو نہایت ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔آنند لہر نے دو سگے بھائیوں شیوا اور شنکر کے ذریعے امیری، غریبی، پاپ، سورگ، نرگ کا تصور اور ان دونوں بھائیوں کے درمیان تضاد اور کشمکش کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ناول ''یہی سچ ہے'' دراصل زندگی کی سچائیوں کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے زبان و بیان کے لحاظ سے یہ ایک عمدہ ناول ہے۔اس میں شک نہیں کہ آنند لہر کا مشاہدہ کیا ہے۔ان کی کہانیاں زندگی سے اتنی قریب ہوتی ہیں کہ ان کا شمار موجودہ دور کے اہم فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔

اس دوران نئی نسل کے کئی فنکار ناول نگار سامنے آرہے ہیں۔ان میں عمر مجید کے دو ناول ''یہ بستی یہ لوگ''، ''درد کا دریا''، ''پھوشن کا ناول ''صرف پانچ ہزار'' رشید پروین کے دو ناول ''دل اور دیا''، ''پیاسی پایل'' اور وحشی سعید ساحل کے ناول ''خون اور محبت''، ''منزل اور تلاش'' اور ''قحط'' منظرِ عام پر آئے ہیں۔

ان ناول نگاروں کا اپنا ایک الگ لکھنے کا انداز ہے۔یہ کہیں رومان کی دھند میں لپٹی فضا کو پیش کرتے ہیں اور کہیں سماجی نابرابری سے پیدا شدہ مسائل کو اُبھارتے ہیں۔اکیسویں صدی کے یہ ناول نگار اپنے گردو پیش کی زندگی کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ان کے تجربے احساس کی آنچ سے پگھل کر لفظ و بیان میں ڈھل جاتے ہیں۔انہیں کشمیری عوام کی زندگی کا قریبی مشاہدہ ہے۔

غرض کہ اکیسویں صدی تک آتے آتے ریاست جموں و کشمیر میں اُردو افسانے کے ساتھ ساتھ اُردو ناول کے معیار و مزاج اور رفتار میں بھی تیزی اور تبدیلی آئی ہے۔آج اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں یہاں اُردو ناول کی

کیفیت اتنی مایوس کن نہیں ہے جتنی گذشتہ کچھ دہائیوں سے تھی۔

<u>اُردو افسانہ</u>:۔ جموں وکشمیر ایک طرف فطری حسن کی بنیاد پر ایک الگ مقام رکھتا ہے تو دوسری طرف اردو نثری ادب کے کئی معتبر قلم کار بھی رکھتا ہے۔اپنے قدرتی مناظر کی دلفریبی ودلکشی کی وجہ سے دُنیا میں جہاں ارضی جنت کے نام سے معروف ہے وہیں ریاست جموں وکشمیر نے ادبی لحاظ سے بھی برصغیر ہندو پاک میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔موجودہ افسانہ نگاروں میں کئی نامور کہانی کار ہیں جن کی افسانہ نگاری کو ادبی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور آج بھی ان کا قلم خون جگر سے واردات قلب پیش کرنے میں مصروف ہے۔آج اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کو بھی بڑے پیمانے پر فروغ دیا جارہا ہے۔اور دوسری اصنافِ ادب کے مقابلے میں صنف افسانہ میں گراں قدر اضافہ کیا جارہا ہے۔دورِ حاضر میں صنفِ افسانہ کی خونِ جگر سے سنچائی کرنے والوں میں نور شاہ، ترنم ریاض، حامدی کاشمیری، آنندلہر، خالد حسین، آمین بنجارا، ویدراہی، مشتاق احمد وانی، ولی محمد، حسن ساہو، ڈاکٹر ظہورالدین، ورنیدر پٹواری، جان محمد آزاد، مشراق مہدی، بشیر شاہ، خواجہ فاروق، غلام نبی شاہد، دیپک بدکی، زاہد مختار، شیام طالب، شیخ بشیر احمد، ذنفر کھوکھر، منصور احمد منصور، پرویز مانوس، سیدہ نکہت فاروق، مجید ارجمند، شیخ خالد کردار، مقبول ساحل، میر ایوب میر، ناصر ضمیر، ریاض توحیدی اور ملک ریاض فلک وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان افسانہ نگاروں میں بعض ایسے معتبر فن کار ہیں جو گذشتہ دو تین دہائیوں سے جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کی نئی راہیں ہموار کررہے ہیں۔لیکن اُن کا شمار آج بھی اکیسویں صدی کے نامور افسانہ نگار میں ہوتا ہے۔

نور شاہ کا شمار ریاست میں عہدِ حاضر کے نمائیدہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اور اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کے ابتدائی نقوش پریم ناتھ پردیسی اور محمد دین فوق ہیں لیکن افسانے کے پودے کی آبیاری کرنے والوں میں نور شاہ کا نام سرفہرست ہے۔اُنھوں نے اُردو افسانے کو مختلف رنگوں میں رنگا۔اُنھوں نے جموں وکشمیر جنتِ بے نظیر کی ہر چیز مثلاً دریاؤں، جھلیوں، جھرنوں،

آبشاروں، کی عکاسی کی اوران کواپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ کشمیر کےحسن کےساتھ ساتھ اُنہوں نےعصری حالات کوبھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔آپ کےافسانوں میں ہمیں شعری تخیل کےساتھ ساتھ رومانیت کی لذت بھی ملتی ہے۔کشمیری سماج کی ہو بہوعکاسی کےعلاوہ ان کےافسانوں کےکردار بھی اسی وادی سےتعلق رکھتے ہیں۔

نورشاہ کوزبان پرقدرت حاصل ہےجس طبقہ کےکردار کاانتخاب کرتے ہیں اُسی طبقے کی زبان بھی استعمال کرتے ہیں اوریہی ایک افسانہ نگار کااوراس کےافسانوں کا ہنراورحسن ہوتا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں کے علاوہ ناول اورڈرامے بھی لکھے ہیں لیکن اُنہیں شہرت افسانوں کی وجہ سے ہی ملی۔اُنہوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں جنسی کج روی کوموضوع بنایا ہے۔اُن کاخیال ہے کہ غلاظت کوچھپانے کے بجائے کریدنااورصاف کرنا چاہیے بے شک اس سے بدبو پھیلتی ہےلیکن اس کے سوا چارہ نہیں۔ان کے یہاں جنسی موضوعات کوسمجھنےاورسلجھانے کا رجحان ملتا ہےجس سے یہ لگتا ہے کہ وہ سعادت حسن منٹواورفرائڈ کےجنسی نظریات سے کافی متاثر رہے ہیں۔اس کےساتھ ساتھ ہمیں اُن کےافسانوں میں رومانیت اورحقیقت نگاری کاحسین امتزاج ملتا ہے جواُنہیں اپنے دور کے دوسرےافسانہ نگاروں سےالگ کرتا ہے۔

نورشاہ کےاب تک سات افسانوی مجموعے منظرِعام پرآچکے ہیں ان افسانوی مجموعوں میں اُن کاسب سے پہلا مجموعہ ’’بے گھاٹ کی ناؤ‘‘ ہےاس میں کل دس افسانے ہیں۔دوسرا ’’ویرانے کے پھول‘‘ اس میں بارہ افسانے ہیں۔ تیسرا مجموعہ ’’گیلے پتھروں کی مہک‘‘ ہے۔چوتھا ’’من کا آنگن اُداس اُداس‘‘ اس میں چھ افسانے ہیں۔ پانچویں ’’ایک رات کی ملکہ‘‘ اس افسانوی مجموعے میں گیارہ افسانے ہیں۔چھٹا ’’بے ثمر کا سچ‘‘ جو۲۰۰۵ میں ایک لمبے عرصے کے بعدمنظرعام پرآیااس میں بتیس افسانے شامل ہیں۔آخری مجموعہ ’’آسمان لہواور پھول‘‘ ۲۰۰۸ءمیں شائع ہوا۔اورنورشاہ کاافسانوی سفرابھی جاری وساری ہے۔اُن کےافسانوی مجموعہ ’’ویرانے کے پھول‘‘ پر ریاستی سطح پروزیراعلیٰ جناب غلام محمد صادق نے انعام سےنوازا۔

آنندلہر کا اصلی نام شیام سندر آنند ہے اور ادبی دُنیا میں آنندلہر کے نام سے مشہور ہوئے ان کا تعلق بھی اسی سر زمین سے ہے جس سے چراغ حسن حسرتؔ، ٹھاکر پونچھی، اور کرشن چندر کا تعلق بھی رہا ہے۔ یعنی سرزمینِ پونچھ۔ آنندلہر پیشے سے ایک وکیل ہیں لیکن اپنی ادبی صلاحیتوں کو برروئے کار لا کر ادبی دُنیا میں بھی اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔ اردو نثر کی تقریباً تمام اصناف میں اُنہوں نے طبع آزمائی کی مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی مگر اُن کی شہرت کا باعث صرف افسانوی ادب ہی ہے۔

آنندلہر صوبہ جموں کے ایک مشہور افسانہ نگار ہیں جو نہ صرف ریاست بلکہ بیرونِ ریاست میں بھی اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ آنندلہر نے زمانہ طالبِ علمی سے ہی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا آغاز ۱۹۷۲ء میں اُس وقت کیا جب وہ ایک طالبِ علم تھے۔ اُن کا پہلا افسانہ ''پتھر کے آنسو'' ہے جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے متعدد افسانے، ڈرامے اور ناول لکھے اور کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتے رہے۔

اگر کہا جائے کہ جموں وکشمیر میں تجریدی افسانے کی بنیاد آنندلہر نے ہی ڈالی تو بے معنی نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے علامتی افسانے بھی لکھے مگر علامتی افسانے ان سے پہلے بھی ریاست میں لکھے جا چکے تھے۔ تجریدی افسانے کے موجد جموں وکشمیر میں آنندلہر ہی کہلائے۔ آنندلہر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سرحد کے اُس پار'' اس میں کُل ۱۴ افسانے ہیں۔ اس کا دیباچہ شرن کمار نے لکھا ہے ''سرحد کے اُس پار'' میں کہانی کار نے بڑی فنکارانہ طریقے سے تقسیم کے المیے کی عکاسی کی ہے۔ اس مجموعہ میں تقسیم سے پیدا شدہ حالات اور واقعات کی عکاسی بڑی خوبصورتی کے ساتھ آنندلہر نے کی ہے۔ ہر افسانے کا موضوع الگ اور اپنا مزاج رکھتا ہے۔ جہاں ایک طرف مصنف نے بلند پایہ نثری تحریر کا ثبوت دیا ہے وہاں دوسری طرف روایت سے قدرے ہٹ کر ہر افسانے میں مجموعی طور پر انسانی قدروں کی بازیابی، ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی، انسانی قدروں کے لئے جدوجہد، سماجی خلیجوں کو استوار کرنے کا جتن، زندگی

کے سدھار کی کاوش، سماجی تنقید، سیاسی جادوگری اور جنسی موضوعات کے خاموش تاروں پہ مضراب پھیرنے کی صحت مند سعی بروئے کار لائی ہے۔ ملاحظہ ہوں افسانے کے چند اقتباسات۔

''ایک دن دونوں ملے تو گوپی نے روشن سے پوچھا۔ کس کس سرحد کو پار کرے کوئی فرقوں کی سرحد، مذہبوں کی سرحد، قوموں کی سرحد، لوگ ان سرحدوں کو مٹا کیوں نہیں دیتے؟ گوپی بولی۔ یہی بدقسمتی ہے، لوگ سرحدوں کو بدلتے ہیں، انہیں ختم نہیں کرتے، وہ جنگ لڑتے ہیں، خون بہاتے ہیں مگر پھر ایک نئی سرحد قائم کر لیتے ہیں''۔ ۱۷

''جب دونوں ملکوں کے لیڈر ملتے ہیں، فوجی ملتے ہیں، چور ملتے ہیں، اسمگلر ملتے ہیں، جج ملتے ہیں کھلاڑی ملتے ہیں تو عام لوگ کیوں نہیں مل سکتے؟''۔ ۱۸

افسانہ گوری کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:

''گوری برتن بناتی گئی اور روشن خریدتا گیا۔ برتن نہ ہندو ہوتے ہیں نہ مسلمان، یہ تو بس مٹی کے ہوتے ہیں۔ مٹی جس کا دھرم نہیں، مذہب نہیں، یہ تو بس مٹی ہے، جہاں بھی ہے مٹی ہے''۔

''محبت کے ایک لفظ کے آگے مذہبی کتابوں کے فلسفے چھوٹے نظر آتے ہیں''۔ ۱۹

اس افسانوی مجموعے کے افسانوں میں اختصار، مقصدیت، معنویت، مشاہدے کی غیر معمولی گہرائی اور وسعت کا خصوصی طور پر ذکر ملتا ہے۔ سپیرین، گوری، شکست، پھول والی زندگی اس مجموعے کی بہت ہی عمدہ کہانیاں ہیں جو انسانی نفسیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

آنند لہر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''انحراف'' ہے اس مجموعے میں زیادہ تر تجریدی افسانے ہیں۔ مختصر جملے اور

حقیقت نگاری اس مجموعے کی اہم خوبی ہے۔سماج اور زندگی کی باریک بینیوں پر آنندلہر کی گہری نظر ہے۔وہ اشاروں اور کنایوں میں بڑی بڑی باتیں بیان کرتے ہیں۔آنندلہر نے اپنے افسانوں میں سیاسی ،سماجی نظام کی کمزوریوں کو بڑی بے باکی کے ساتھ دکھایا ہے۔حقیقت نگاری اُن کے افسانوں کی جان ہے۔مذکورہ مجموعے میں ۱۳۳ افسانے ہیں جومختصر ہیں لیکن ان میں معنی خیزی ہے۔فکر کی بالیدگی اور فن کی پختگی مختصر جملوں میں ڈھل کر افسانوں میں گہرائی و گیرائی پیدا کر دیتی ہےان کے فقرے معنویت سے بھر پور ہوتے ہیں ملاحظہ ہوں چند اقتباسات۔

''کوئی بھی لڑنا نہیں چاہتا مگر جنگ پھر بھی جاری ہے''۔(زاویہ)

''چاند کے سینے پہ داغ ہے پر چاندنی تو بے داغ ہے''۔(جواب)

''تمام ناموں،رشتوں اور ناطوں کا حاصل صرف تین لفظ ہیں،میں،تم اور وہ''۔(وجود)

''ہر وہ چیز جو دوسروں کا بوجھ اُٹھاتی ہے اس کا اپنا بوجھ بھی اتنا ہی بڑھ جاتا ہے''۔ (گولائی)

''ایک باراُس نے اُپر دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں نے ستارے نوچ کر آسمان کو ننگا کرنے کی خواہش کی تھی''۔ (قیدی)

''تمہاری اس انگلی کا کیا ہوا جوتم نے آسمان کو چھونے کے لئے اپنے ہاتھ سے الگ رکھی تھی''۔ (اندھی لکیریں) ۲۰

آنندلہر کے ہاں زیادہ تر یہی نیا انداز کارفرما ہے۔ان کے افسانوں میں واقعات کی ترتیب، پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے روائیتی ارتقاء کے بجائے منتشر خیالات ،واقعات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔

افسانوں کے علاوہ اُنہوں نے بڑے اچھے ناول بھی لکھے ہیں۔ان کا پہلا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' ہے جو ۱۹۹۷ء میں منظرِعام پر آیا ۲۰۰۲ء میں اُنہوں نے ایک اور ناول ''سرحد کے بیچ'' لکھا اور ۲۰۰۴ء میں تیسرا ناول ''مجھ

سے کہا ہوتا'' منظر عام پر آیا۔ افسانے اور ناولوں کے علاوہ آنند لہر نے ڈرامے بھی لکھے ہیں ''نروان'' اُن کے ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں چھ خوبصورت ڈرامے ہیں۔

ریاست کی مشہور اور معروف تنظیم ''رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی'' نے ۲۰۰۳ء میں رسا جاودانی میموریل لٹریری ایواڈ سے نوازا۔ میرا کیڈمی لکھنو نے بھی انعام سے نوازا۔ راجستھان اُردو اکیڈمی، جموں کشمیر اردو فورم، نمی ڈوگری سنستھا اور ادبی کنج نے بھی آنند لہر کو مختلف اعزازات اور انعامات سے نوازا ہے۔

اردو افسانہ نثری ادب میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کرنے والی صنف ہے اور اکثر پڑھے لکھے اہلِ قلم حضرات اُردو افسانہ میں طبع آزمائی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ جہاں تک ریاست کی خواتین افسانہ نگاروں کا تعلق ہے تو ان میں ایک ایسی افسانہ نگار کا نام سرفہرست ہے۔ جو اپنے خونِ جگر سے اس صنف کو ترقی دے رہی ہیں۔

ترنم ریاض عالمی سطح کی ایک مشہور و معروف افسانہ نگار، شاعرہ، مترجم اور ناول نگار ہیں انہوں نے ادبی دُنیا میں اپنی محنتی کاوشوں اور دلجوئی سے ایک مقام بنالیا ہے۔ ترنم صاحبہ نے گرچہ نثر کے مختلف شعبوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ ایک کہانی کار ہیں اور کہانی ان کا پہلا مشغلہ ہے۔ ان کے افسانے ادبی و معیاری ہونے کی وجہ سے ملک کے معروف و مشہور جرائد و اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی تخلیقات کو دُنیائے ادب میں کافی سہرایا گیا ہے۔ ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ''یہ تنگ زمین'' ۱۹۹۸ء

(۲) ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' ۲۰۰۰ء

(۳) ''یمبرزل'' ۲۰۰۴ء

(۴) ''مرا رختِ سفر'' ۲۰۰۸ء

ترنم ریاض ایک دردمند دل رکھنے والی حساس اور ذہین خاتون افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے دل پر ایک

گہرانقش چھوڑ جاتے ہیں ۔اُن کے افسانوں میں معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں ،ظلم و جبر اور استحصال کی عکاسی خوب ملتی ہے۔ان کے افسانوں کے کردار معاشرے کے وہ افراد ہیں جوظلم وزیادتی اور ناانصافیوں کا شکار بنے اورغریب سے غریب تر ہوتے گئے مگران کی آہ وفریاد کسی نے نہ سُنی ۔

عورت کوبھی ترنم ریاض نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔جیسے مشہور ہے کہ زمانہء قدیم سے ہی عورت کے ساتھ ناانصافیاں ہوتی آئی ہیں اوران ناانصافیوں کوافسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ایسی بے شمار مثالیں ہیں ۔اس موضوع پربھی ترنم ریاض نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح ہمارے سماج میں عورت کے ساتھ ناانصافیاں ہوتی آئی ہیں ۔ان کی ہرتحریر میں ہمیں گھریلو ماحول اور معاشرے کا عکس دیکھنے کوملتا ہے ۔افسانہ ’’یہ تنگ زمین‘‘ میں افسانہ نگار نے اپنی ماں کے تئیں بچوں سے محبت کوموضوع بنایا ہے۔اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک ماں اتنا ہی پیار دوسرے بچوں کو دیتی ہے جتنا کہ اپنے بچوں کوکرتی ہے۔’’پورٹریٹ‘‘ ترنم ریاض کا ایک اور بہت مشہور افسانہ ہے ۔جس میں ساس اور بہو کے بیچ اختلافات کوموضوع بنایا ہے۔اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک بہو ہمیشہ اس تاک میں رہتی ہے کہ اس کی ساس اس کواپنا ہمراز بنائے اور دوسرے لوگوں کو باتیں نہ بتائے اور آپس میں ہی دونوں ہم راز رہیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔

ترنم ریاض کے یہاں عصری زندگی کی عکاسی ، جدید تہذیب سے پیدا شدہ حالات اور مسائل کی نقاب کشائی بھی خوب طرح سے کی گئی ہے ۔ وہ مختلف واقعات کواپنا موضوع بنا کر قاری کوتحیر، تجسس ، تازگی اور لطف ولذت عطا کرتی ہیں ۔

ترنم ریاض صرف افسانہ نگاری ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں ۔مجموعی طور پر یہ کہ انہوں نے ناول، افسانہ کے علاوہ شاعری اور ترجمہ نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ’’پرانی کتابوں کی خوشبو‘‘ ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ ناول ’’مورتی‘‘ ۲۰۰۴ء میں اور دوسرا ناول ’’برف آشنا پرندے‘‘

۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ترنم ریاض کا ایک تنقیدی مضامین ''جشن نقش قدم'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔''بیسویں صدی میں خواتین کا اُردو ادب'' (تحقیقی و تنقیدی مضامین)، ''گوسائیں باغ کا بھوت'' (ترجمہ ہندی سے)، ''سنو کہانی'' (ترجمہ ہندی سے) اور ''ہاؤس بوٹ پر بلّی'' (ترجمہ انگریزی سے) اہمیت کے حامل ہیں۔

خالد حسین اگرچہ پچھلی دو تین دہائیوں سے لکھ رہے ہیں لیکن اُن کا افسانوی سفر اکیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں ہنوز جاری و ساری ہے۔خالد حسین نے ادبی زندگی کا آغاز پنجابی زبان سے کیا۔پنجابی میں اُن کے کئی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں مگر اُردو زبان میں بھی اُن کو برابر شہرت ملی۔۱۹۸۱ء میں خالد حسین صاحب کا پہلا اُردو افسانوی مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' شائع ہوا۔جس کی ادبی دُنیا میں کافی پذیرائی ہوئی۔اس افسانوی مجموعہ میں وہ کہانی بھی شامل تھی جس کی وجہ سے خالد حسین صاحب کو معطل کیا گیا تھا۔خالد حسین کے اس مجموعے ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' میں کل ۳۳ کہانیاں ہیں۔اس مجموعے میں ایک کہانی ''گھر کی جنت'' کو چھوڑ کر تقریباً ۱۹۸۱ء سے پہلے کی کہانیاں اس مجموعے میں شامل کی گئی ہیں۔جن میں بیشتر پنجابی تخلیقات کا اُردو ترجمہ ہے اس مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' میں ۱۴ کہانیاں خالد حسین نے اپنے پنجابی مجموعہ ''جہلم وگدا رہیا'' سے لی ہیں اور باقی ۱۹ تقریباً نئی تخلیقات ہیں۔''کھوکھلا سورج''، ''گھاس پر چلنا منع ہے''، ''گوری فصل کے سوداگر''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' کافی بہترین کہانیاں ہیں جن کو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی تھی۔

پہلے افسانوی مجموعے کے دس سال بعد یعنی کہ ۱۹۹۱ء میں خالد حسین کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''اشتہاروں والی حویلی'' منظرِ عام پر آیا۔اس افسانوی مجموعے میں ۳۱ افسانے ہیں جن میں ''کنوار گندل''، ''بیڑے کی لنکا''، ''کھوکھلا سورج''، ''دیواروں چھپی واسنا''، ''پانی کی لکیریں''، ''مجاہد''، ''سیاست''، ''سورج کا گت''، ''ابابیل کا خواب''، ''علی بابا چالیس چور''، ''اندھیر نگری''، ''قیامت''، ''انتظار کا قیدی''، ''صلیبِ ذات''، ''بھوشیہ وانی''، ''نئے آدم کا خواب''، ''کارِ جہاں دراز ہے''، ''روحیں''، ''دُشمنی''، ''گھاس پر چلنا منع ہے''، ''بابا ٹکی''، ''اپنا دامن اپنی آگ''،

''پتھریلے پانی میں بہتی ناؤ''، ''آوارہ سانپ کا ڈھنگ''، ''دُشمن کون''، ''دل کی گلیاں''، ''گہرے پانیوں کا دُکھ''، ''کوئلہ بھئی نہ راکھ''، ''میری چادر میرے پیر'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس افسانوی مجموعہ پر پیشِ لفظ اور تبصرے خالد کفایت، ڈاکٹر زینت اللہ جاوید اور ڈاکٹر اسد اللہ وانی نے کیے ہیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ اس کے علاوہ خالد حسین نے خود اس افسانوی مجموعے میں ''میں اور میری تخلیق'' کے عنوان سے اپنے حالات اور بہت سی سچائیوں کو قلم بند کیا ہے۔ جو اپنی طرح کی ایک منفرد بات ہے۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں جو عام ادیب بتانے سے گریز کر تے ان کو بھی خالد حسین نے منظرِ عام پہ لانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اپنی بیوی سے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

''میری بیوی صورت کی اچھی ہے، سیرت کی خوب ہے لیکن ایک ادیب کے ناطے میں اس کے دماغ کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کر سکتا اگر چہ یہ جملہ اُسے ناگوار گزرے تو وہ مجھے معاف کر دے۔'' ۲۱

اس طرح کی حقیقت کو قلم بند کرنا بڑی جرأت مندی کی بات ہے اس کے علاوہ اُنھوں نے اپنی افسانہ نگاری پر بھی تھوڑا تبصرہ کیا ہے جس کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:۔

''میری تخلیق کا خمیر سماج کے آٹے سے گندھا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ادیب بنیادی طور پر سماج کا حصّہ ہوا ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے سماج مین رونماں ہوئے واقعات، عوام کے اقتصادی و سیاسی مسائل اور دیگر حالات سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ اس کی نظر گہری ہوتی ہے، وہ بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔'' ۲۲

''بیٹے کی لنکا''، ''پانی کی لکیریں''، ''دُشمن کون''، ''گوری فصل کے سوداگر''، ''اشتہارون والی حویلی''، ''کنوار گندل''، ''دیواروں میں چھپی واسنا''، اس مجموعے کی بہترین کہانیاں ہیں۔ جن کو ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ ڈاکٹر اسد اللہ وانی افسانوی مجموعہ ''اشتہاروں والی حویلی'' کے پیش لفظ میں خالد حسین کے بارے میں کچھ اس

طرح سے اپنا تاثر بیان کرتے ہیں۔

’’ خالد حسین کے افسانوں میں نہ صرف حسن و جمال اور حقیقت و رومان کا امتزاج پایا جاتا ہے یا سماج میں پنپتے ناسوروں کی عکاسی کی ہے بلکہ کئی دوسرے مسائل کی نفسیاتی موشگافی ،حق گوئی اور بے باکی سے بات کہنے کی جرأت مصلحانہ طنز، شگفتہ فقرے بازی، محاوروں کا برمحل استعمال اور کہیں کہیں ابہام بھی پایا جاتا ہے اور علامتی و استعارتی انداز بھی۔‘‘ ۲۳

خالد حسین کی آخری تصیف ’’ستی سر کا سورج‘‘ ہے جو ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آئی۔اس مجموعے میں ۲۰ افسانے ،ایک انشائیہ ’’ہاتھی اڈائی لاکھ کا‘‘ اور ایک انشائیہ ’’عشق نچائے تھیا تھیا‘‘ شامل ہیں۔اس افسانوی مجموعے کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی ہے۔اس مجموعے میں وہ افسانہ بھی شامل ہے جو خالد حسین کا پہلا افسانہ ہے جو اُنہوں نے ۱۹۶۹ء میں لکھا تھا جس کا نام ’’گھر کی جنت‘‘ ہے۔’’ستی سر کا سورج‘‘ خالد حسین کا شاہکار افسانہ بھی اسی مجموعے میں شامل ہے جس کے نام پر اس مجموعے کا نام رکھا گیا۔جس کو کچھ محقق اور نقادوں نے خالد حسین کا سب سے بہترین افسانہ کہا ہے۔

خالد حسین پنجابی اور اُردو دونوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں اب تک اُن کی پنجابی اور اُردو کی مندرجہ ذیل تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

۱۔	ٹھنڈی کانگری کا دھواں	۱۹۸۱ء
۲۔	اشتہاروں والی حویلی	۱۹۹۱ء
۳۔	ستی سر کا سورج	۲۰۱۱ء
۴۔	جہلم وگدا ریہا	۱۹۷۶ء

۵۔ گوری فصل دے سوداگر ۱۹۸۲ء

۶۔ ڈونگے پانیاں دادکھ ۱۹۹۳ء

۷۔ بلندی برف داسیک ۲۰۰۵ء

۸۔ گواچی جھانجھر دی چیک ۲۰۱۰ء

۹۔ نوری رستماں ۲۰۰۹ء

۱۰۔ خالد حسین دا کتھا ساگر ۲۰۱۰ء

خالد حسین نے اپنے افسانوں ''بھوشیہ وانی''، ''نئے آدم کا خواب''، ''اندھیری نگری'' اور ''گھاس پر چلنا منع ہے'' میں موجودہ دور کی زندگی کی بے چینی، مفلسی، انتشار واضطراب، طبقاتی کشمکش، بیکاری اور جہالت کو علامتوں کے ذریعے اُبھارا ہے۔لیکن وہ اس میں پوری طرح سے کامیاب نظر نہیں آتے اس کے برعکس اُن کو اگر روایت پسند افسانہ نگار کہا جائے تو زیادہ موزوں رہے گا۔ بقول پروفیسر نصرت چودھری۔

> ''انہوں نے دورِ حاضر کے فرد کے داخلی احساسات اور محسوسات کو فکری سطح پر محسوس کیا اور مختلیف پیچیدہ نفسیاتی اور جنسی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے ہاں زندگی کے خارجی مظاہر کی معرفت انسان کے داخلی، ذہنی، نفسیاتی تاثرات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ کہیں کہیں انہوں نے ابہامی اور علامتی طرز بھی اختیار کیا ہے۔لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں۔ وہ بنیادی طور پر روایت پسند افسانہ نگار ہیں۔ [۲۴]

نصیر احمد قریشی المعروف امین بنجارا اُردو کے ایک ممتاز افسانہ نگار، تنقید نگار اور ادبی وسماجی کارکن کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ بطورِ ایک صحافی امین بنجارا کو کافی شہرت اور مقبولیت حاصل رہی ہے۔ آپ جموں وکشمیر کے کئی اخبا

رات اور رسائل سے منسلک رہے اور ریاست میں اُردو صحافت کی خدمت کرتے رہے۔اس کے علاوہ امین بنجارا ریڈیو، ٹی۔وی، تھیٹر سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ریاست جموں وکشمیر میں وہ اُردو فکشن، تحقیق وتنقید اور صحافت کے علاوہ ڈرامے کی دُنیا سے بھی وابستہ رہے ہیں۔علمی ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں اُنہیں کئی انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔امین بنجارا کا ادبی سفر تقریباً تین دہائیوں پر مشتمل ہے۔اس طویل عرصہ میں اُردو افسانے میں کئی ہئیتی اور موضوعاتی اعتبار سے تبدیلیاں رونماں ہوئیں۔جن کا اثر اُن کے افسانوں اور دوسری تخلیقات میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔اُن کا اب تک ایک افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے جس کا نام ''الاؤ'' ہے اور جو ۱۹۹۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔جن کی رسم اجراء ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔چودہ کہانیوں پر مشتمل ان کا یہ افسانوی مجموعہ ہمارے سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں، دھاندلیوں، فرقہ وارانہ فسادات، اور انسانی زندگی کے عدم تحفظ کی نشاندہی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔''الاؤ'' میں شامل افسانے ''جنم دن کا سندر پہاڑ''، ''امن کے لئے اجالا''، ''مکتی''، ''رب کی مار''، ''نکلا تیری تلاش میں''، ''آنسو چنار کے'' اور ''الاؤ'' اردو ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔امین بنجارا کے افسانوں میں کہیں کہیں ترقی پسند نظریے کی چھاپ بھی نظر آتی ہے وہ عام لوگوں پر ہو رہے ظلم و جبر اور زیادتیوں کو بھی اپنے افسانوں میں سمونے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔فرقہ وارانہ فسادات، مذہبی ٹھیکیداروں اور سماج کی سربرائی کرنے والے مکار سیاست دانوں کے گھناونے چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش اُن کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔جموں وکشمیر کی مشترکہ تہذیب کی عکاسی بھی اُن کے افسانوں میں ہوئی ہے۔

امین بنجارا نے تحقیق وتنقید کے حوالے سے بھی اچھا خاصا کام کیا ہے۔اس کے علاوہ سوانحِ حیات پر ایک بہت ہی موثر کتاب ''گمنام شخصیت'' کے عنوان سے لکھی جس میں اُنہوں نے اپنے اُستاد ماسٹر موہن لال گپتا کی سوانحِ حیات قلم بند کی ہے۔جو اپنے آپ میں ایک مکمل تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے علاوہ امین بنجارا

نے اُردو ادب کی نامور ہستیوں پر درجنوں تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ جن میں محمد یوسف ٹینگ، پرتپال سنگھ بیتاب، وید بھسین، ابوالکلام آزاد، سید قطب عالم شاہ سبزواری، پیر مٹھا، رسا جاودانی، جگن ناتھ آزاد، پروفیسر شہاب عنایت ملک وغیرہ وغیرہ پر کافی تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ امین بنجارا نے کئی کتابیں مرتب کی ہیں جو اُن کی نگاہ انتخاب اور تخلیقی شعور کی غمازی کرتی ہیں۔ امین بنجارا کی ان ادبی خدمات پر اُن کو ڈرامہ نگاری، انشاپردازی، اداکاری اور علمی، ادبی اور سماجی خدمات پر مختلف اداروں اور انجمنوں کی طرف سے متعدد بار اعزازت اور انعامات سے نوازا گیا ہے۔

ڈی۔ مینی کا شمار بھی اکیسویں صدی کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا پورا نام خوش دیو مینی ہے۔ یہ جموں وکشمیر کی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اُردو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اُنہوں نے تاریخ نگاری، صحافت، افسانہ نگاری، شاعری، انشایئہ نگاری وغیرہ تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ خوش دیو مینی نے اُردو کے علاوہ پنجابی، ڈوگری، پہاڑی اور گوجری زبانوں میں افسانے لکھے اور شعر کہے ہیں۔ مینی کے اُردو افسانوں کا پہلا مجموعہ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ جس میں دس کے قریب افسانے تھے۔ جن میں سیڑھیاں، عرفان، پہلا پتھر، چاند، نجات، ہوش مند، جشن، آخری تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔

خوش دیو مینی نے اپنے افسانوں میں زندگی کو درپیش مسائل کی عکاسی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ انسانی زندگی کا احساس اُن کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جو اُن کے افسانوں میں ہمیں ملتا ہے۔ مینی کے افسانے معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے سماج اور معاشرے میں بُرے رسم رواج پر بھی ایک طرح سے کھلی تنقید بھی کرتے ہیں۔ حقیقت نگاری اور سچائی کی منظر کشی اُنہوں نے اس طرح سے کی ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ کوئی افسانہ یا کہانی نہیں بلکہ گاؤں کے کسی غریب گھر کا منظر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مینی گاؤں میں پلے بڑھے لہذا ظاہر ہے کہ دیہاتیوں کی لاچاری، غربت اور بے

بسی کی عکاسی اُن کے بغیر اور کوئی کیسے بہتر انداز سے کرسکتا ہے۔ ناز نوشاد احمد خان مینیؔ کے بارے میں اپنے تاثر کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> ''خوش دیو مینیؔ کے افسانوں میں کرشن چندر کا افسانوی فن دکھائی دیتا ہے وہی سادگی، وہی ناز وادا، وہی جوش اور وہی دھڑکن ہے جو کرشن چندر کے نمائیدہ افسانوں میں موجود ہے۔'' ۲۵؎

کے۔ ڈی۔ مینیؔ کی زبان نہایت سادہ سلیس اور دلچسپ ہے اور یہی افسانے کی خصوصیات ہے جو اس کو دوسری اصناف سے الگ کرتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں قدرتی مناظر کی تصویر کشی بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ مینیؔ نے زندگی کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہ بالکل حقیقی اور فطری معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے زیادہ تر کردار دیہات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی دیہاتی زندگی کے فرد ہیں۔

موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں ایک نام مشتاق احمد وانی کا ہے۔ اُردو افسانہ نگاری میں انکی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کی شخصیت اپنے ادبی، سیاسی اور سماجی کارناموں کے باعث قائم رہی ہے اور آئیندہ بھی رہے گی۔ بچپن ہی سے وہ کافی ذہین اور خوش اخلاق شخص تھے۔

پہلے شاعری کی طرف راغب ہوئے اور بعد میں نثر کی طرف بڑھے۔ اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا جس کا نام ''ہزاروں غم'' ہے۔ اس میں سولہ کہانیاں شامل ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کو ادبی حلقوں میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ۲۰۰۸ء میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''میٹھا زہر'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔ اس افسانوی مجموعے میں کل بارہ کہانیاں شامل تھی۔ یہ افسانوی مجموعہ پہلے افسانوی مجموعے سے بالکل الگ ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ تقریباً تمام بڑے فکشن کے اہم نقادوں کی نظر سے گزرا ہے اور تمام افراد نے اس کا جائزہ لیا اور اپنے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔

مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے گردونواح کی زندگی کے حوادث اور واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اُنہوں نے گھسے پٹے موضوعات پر افسانے نہیں لکھے بلکہ نئے موضوعات کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ انسانی زندگی کی عکاسی وہ بڑی بے باکی کے ساتھ کرتے ہیں۔ سیدھی سادھی زندگی کی کہانی کو وہ بڑے موثر انداز کے ساتھ سادہ پلاٹ اور سادہ زبان میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیں اپنی جموں و کشمیر کا عکس نظر آتا ہے۔ یہاں کا موسم، یہاں کی بہاریں، یہاں کی افراتفری ان کے افسانوں میں ہمیں ملتی ہے۔ سیدھی سادھی زبان میں بہت بڑی بات کہنے کا ہنر مشتاق احمد وانی کو خوب آتا ہے اور یہی بات افسانے کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ مشتاق احمد وانی ریاست جموں و کشمیر کے وہ نوجوان ادیب ہیں جنہوں نے قلیل مدت میں ریاست کے ادبی حلقوں میں اپنی الگ شناخت بنائی ہے۔ ان کے افسانوں سے متعلق نامور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ یوں رقمطراز ہیں۔

> ''ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک مدت سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کی کہانیاں میری نگاہ سے گذرتی رہتی ہیں وہ ایک دردمند اور احساسِ طبعیت رکھتے ہیں۔ وہ کشمیری اہلِ زبان ہیں لیکن اُردو میں بھی ان کی پیٹھ مادری زبان سے کم نہیں۔ ان کی اُنگلیاں معاشرے کی نبض پر ہیں اور ان کی کہانیاں آج کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تنقید نگار اور محقق بھی ہیں ان کی ان تصانیف میں ''تقسیم کے بعد ناول میں تہذیبی بحران'' جو ۲۰۰۱ء میں منظرِ عام پر آئی اور دوسری ''آئینہ آئینہ'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ ان کی دوسری تصانیف میں اعتبار و معیار، شعور بصیرت اور اُردو ادب میں تانیثیت منظر عام پر آکر یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ تحقیق اور تنقید کا بھی شعور رکھتے ہیں۔ اب تک مشتاق احمد وانی کی

ان کوششوں سے اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔''۲۶؎

ہربھجن سنگھ ساگر کی اُردو ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز اُس وقت ہوا جب اُنھوں نے اپنی پہلی کہانی ''فرشتہ'' ۱۹۶۲ء میں لکھی ۔ یہ کہانی سرینگر ٹائمز میں ۱۹۶۲ء میں چھپی اس کہانی کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی ۔اس کے بعد اُنھوں نے ایک سے بڑھ کر ایک اچھی کہانیاں لکھیں جن میں ''حملے''، ''فرض''، ''عشق کے پیچ وخم''، ''فرزند''، ''پتھر کی حفاظت میں''، ''اگر فردوس برروئے''، ''دو تصویریں ایک روح''، ''راہ گیر کی لالٹین''، ''دو پیاسی آنکھیں'' ہیں جو کافی معیاری اور بہترین کہانیاں ہیں۔ان کی یہ کہانیاں ملک کے کئی نامور اُردو رسائل اور جرائد کی زنیت بنی۔جن میں ''پتھر کی حفاظت'' لکھنو کی میگزین ''کتاب'' میں ''اگر فردوس برروئے'' حیدرآباد کی میگزین قلم کار میں ''دو تصویریں ایک روح'' ملک کے مشہور و معروف میگزین بیسویں صدی میں ''راہ گیر کی راتیں'' شب خون میں چھپی ۔اس کے علاوہ ۱۹۷۳ء میں نور شاہ نے ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نام ''انتخاب اُردو ادب'' تھا اُس میں ہربھجن سنگھ ساگر کی کہانی ''دو پیاسی آنکھیں'' بھی چھپی تھی۔اپریل ۱۹۷۰ء میں امام مرتضےٰ نقوی نے ایک تحقیقی کتاب ''اُردو ادب میں سکھوں کا حصّہ'' لکھی تھی جس میں ان کی ایک کہانی ''دو تصویریں ایک روح'' کو شامل کیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ ہربھجن سنگھ ساگر پنجابی کے بھی بہت بڑے قلم کار ہیں ۔ پنجابی میں اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ۔جن میں ''دائرہ'' ۱۹۷۹ء میں دوسرا ''یاتری'' ۲۰۰۳ء میں اور تیسرا ''بند دروازے دا پرتانت'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ ہربھجن سنگھ ساگر کی ان ادبی خدمات پر اُنہیں دو بار کلچرا کیڈمی سے پنجابی سائیتہ سبھا سرینگر، پنجابی لٹریری انجمن(Punjabi litrary organization) پٹیالہ سے اور شری متی میلا دیوی کی طرف سے متعداد بار اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا ہے۔

اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں میں ذنفر کھوکھر کا نام اہمیت کا حامل ہے اُن کے اب تک تین افسانوی مجموعے منظر عام آچکے ہیں ''خوابوں کے اُس پار'' ذنفر کھوکھر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے یہ مجموعہ پریس کلب جموں

کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعہ میں کل تیس افسانے شامل ہیں حصہ اول کے چودہ افسانوں کا رنگ مزاحیہ ہے جب کہ حصہ دوم کے سولہ افسانوں کے موضوعات سنجیدہ ہیں۔اس افسانوی مجموعے میں شامل افسانے ''مدہوش''، ''گھر پیارا گھر''، ''انتخاب''، ''ہم ہندوستانی ہیں''، ''یوں بھی ہوتا ہے''، ''نصیحت''، ''جوابی کاروائی''، ''ہمارے ماسٹر جی''، ''عزت کا سوال''، ''چکری''، ''اہلیہ محترمہ''، ''پہلی ہی نظر میں''، ''گذشتہ راصلوۃ''، ''پرنسپل صاحب''، ''خوابوں کے اُس پار''، ''ایک چھوٹی سی لڑکی''، ''بے بسی''، ''در دِنہاں''، ''تشویش''، ''گھر''، ''بڑی بہو''، ''رعایت''، ''نسخہ''، ''وہ''، ''دربہ''، ''حسنِ سلوک''، ''ایس۔ٹی''، ''ایک انسان''، ''پچھتاوٗ'' اور''اے جانِ ناتواں'' ہیں۔ان افسانوں میں کچھ افسانے فن کے معیار پر پورے اُترتے ہیں اور بعض فنی اور تکنیکی لحاظ سے اتنے اچھے افسانے نہیں ہیں۔

ذنفر کھوکھر کے افسانوں کا جائزہ لیتے وقت قاری کو اس بات کا ہر دم احساس ہوتا ہے کہ ذنفر کھوکھر مشرقی عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں جہاں آزادی کے ساٹھ سال کے بعد بھی ماڈرن زندگی کی رمق دکھائی نہیں دیتی اتنا ہی نہیں بلکہ اس افسانوی مجموعے کو پڑھنے سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ جب یہ افسانوی مجموعہ تخلیق ہوا۔اس وقت مصنفہ کے علاقے میں زندگی کی بنیادی ضروریات جیسے بجلی اور پانی ،ہسپتال اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالج اور یونیورسٹیاں بھی نہیں ملتی تھیں۔افسانہ نگار نے اس محدود ماحول میں رہ کر بھی خوبصورت افسانے تحریر کئے ہیں جن میں انکے مشاہدے سے زیادہ ان کے مطالعے کا عمل دخل ہے۔''خوابوں کے اُس پار'' پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہورالدین لکھتے ہیں۔

> ''یہ صحیح ہے کہ ابھی ذنفر کھوکھر کی تحریر میں وہ مقناطیسیت تو پیدا نہیں ہوئی جس کے بغیر فن کار کو حیاتِ دوام حاصل نہیں ہوتی لیکن خوش آئندہ بات یہ ہے کہ اس مقناطیسیت تک پہنچنے کے لئے جس بنیادی جوہر کی ہر فن کار کو ضرورت ہوتی ہے

یعنی تخیل کی بے پایانی اور فکر کی جولانی، یہ دونوں عناصر ذنفر کے قلم کو قدرت نے

کما حقہ عطا کئے ہیں۔'' ۲۷

''کانچ کی سلاخ'' ذنفر کھوکھر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس کی اشاعت پریس کلب جموں کے زیر اہتمام ۲۰۰۸ء میں ہوئی۔ یہ افسانوی مجموعہ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس افسانوی مجموعے میں کُل چھبیس افسانے شامل ہیں۔جن میں سترہ سنجیدہ افسانوں کے علاوہ نو مزاحیہ افسانے بھی شامل ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ پہلے افسانوی مجموعہ ''خوابوں کے اُس پار'' کے چار سال بعد منظرِ عام پر آیا۔اس افسانوی مجموعہ کے سنجیدہ افسانوں کی فہرست میں ''چار سکینڈ ہینڈ''، ''خواب''، ''کانچ کی سلاخ''، ''حادثہ''، ''یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے''، ''خاموشی''، ''یادیں''، ''پانچ سو روپے'' اور ''تلقین'' شامل ہیں اور مزاحیہ حصے میں ''باتیں کچھ راتوں کی''، ''خود کردہ را چارا نسیت فہم کا اپنے مقصود تھا''، ''آس کا دامن''، ''صندوق''، ''حکمنامہ''، ''ریز وریشن''، ''خواب نہیں''، ''دیکھا کرو'' اور ''گالی'' افسانے شامل ہیں۔اس افسانوی مجموعے میں ذنفر دکھوکھر نے اپنے گردو پیش ہونے والے واقعات و حادثات کا اثر قبول کر کے اور اچھے بُرے لمحوں کے کھیل تماشوں کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انسانی فطرت کے رموز و اسرار کی گر ہوں کو کھولنے کی سعی کی ہے۔

''عبرت'' ذنفر کھوکھر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ ۲۰۱۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔اس میں ۲۰۵ صفحات ہیں۔اس افسانوی مجموعے میں کل پچیس (۲۵) افسانے شامل ہیں جو ان کے فن اور صلاحیت کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں۔اس افسانوی مجموعہ میں مصنفہ نے زیادہ حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔''عبرت'' میں شامل افسانوں کو پڑھ کر لگتا ہے کہ ذنفر کھوکھر نے اپنے ذاتی تجربے اور واقعات کے نقشے کو قاری کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ان کی کہانیاں سماج کے مختلف رنگوں کی آئینہ دار ہیں۔''دہشت گردی''، ''بربریت''، ''اغوا''، ''بے چارگی''، ''بے بسی''، ''گھٹن''، ''خوف''، ''غصہ''، ''لوٹ کھسوٹ''، ''حراستی''، ''

ہلاکتیں‘‘، ’’ضمیر فروشی‘‘ وغیرہ ایسے عوامل ہیں جو ذنفر کھوکھر کی گرفت میں آنے کے بعد افسانوں کے موضوع بن جاتے ہیں۔ سرحدی علاقوں میں فوج، پولیس، خفیہ ایجنسیوں اور دیگر حفاظتی دشتوں کی طرف سے بے گناہ اور معصوم لوگوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ، آتش زنی، املاک تباہی، قتل وغارت، فرضی جھڑپوں میں انسانی جانوں کا زیاں ،اخوانی (جعلی ملی ٹینٹ، جو فوج کی پناہ میں رہتے ہیں اور ان کی ہدایت پر کارروئیاں کرتے ہیں) مجاہدوں کے ہا تھوں روزانہ کی ذلت ورسوائی، عصمت دری اور دوسری طرف ہمسایہ ملک کی جانب سے آہٹ ترتیب یافتہ ملی ٹینٹوں کا عوام پر مظالم ڈھانا اور نقلی مجاہدوں کے بھیس میں نقلی دہشت گردوں اور غنڈہ عناصر کا غریب اور لاچار لو گوں کو تنگ کرنا، غرض عوام کا اس دو دھاری دہشت گردی کا مسلسل شکار ہونا ایسا پس منظر ہے جس میں ذنفر کھوکھر کے افسانوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان موضوعات پر ذنفر کھوکھر کے افسانے خون رلاتے ہیں اور لگتا ہے اس حساس خاتون افسانہ نویس نے لہو میں قلم ڈبو کر لکھا ہے۔

ذنفر کھوکھر چونکہ ہمارے افسانہ نگاروں کی جدید تر نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے وہ ایک نئی فکر ایک نئی سوچ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں کشمیر کی سماجی، معاشرتی اور انسانی زندگی کے مختلف رشتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذہن کی لکیر روشن ہے اور وہ اس روشنی میں بہت کچھ دیکھ لیتی ہیں اور پھر اپنے پڑھنے والوں کو بھی ذہنی طور پر اس روشنی سے ہم کنار کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے حسن وجمال، رعنائیوں اور رنگینیوں سمیت معاشرتی اونچ نیچ، درد و کرب اور حقائق کو آئینہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کم وبیش پندرہ سال کی ملی ٹینسی کی شب وتار میں پوشیدہ بہت ساری کہانیوں کو اُجال کر عبرت کا سمان مہیا کیا ہے۔ درحقیقت پندرہ سال کے اس عبوری دور کی پہنائیوں میں جو واقعات وحوادث پنہاں ہیں انہیں حقیقت کا پیکر عطا کرنے کے لیے فنی مہارت کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی باریکیوں پر بھی مکمل دسترس کی ضرورت ہے۔ ذنفر کھوکھر کو وہ فنی مہارت حاصل ہے۔

شیخ بشیر احمد اور غلام نبی شاہد بھی کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں لیکن اُن کے افسانے رسائل و جرائد میں کم ہی چھپتے ہیں۔ شیخ بشیر احمد نئی نسل کی بے راہ روی کا ذکر اکثر اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ ''مٹھی سے بھاگا پرندہ'' ان کا افسانوی مجموعے کا نام ہے۔ غلام نبی شاہد کی کہانیاں ان کے الگ اندازِ بیان کی آئینہ دار ہیں۔ مشتاق مہدی ایک سنجیدہ افسانہ نگار ہیں۔ اُن کا دوسرا افسانوی مجموعہ '' آنگن میں وہ'' اکیسوی صدی میں ہی شائع ہوا ہے۔ ان کے اکثر افسانے ہماری آج کی زندگی سے جڑے ہوئے مسائل و معاملات کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے نئے افسانہ نگاروں کے بارے میں نور شاہ اپنی کتاب ''جموں کشمیر کے افسانہ نگار'' میں لکھتے ہیں۔

> ''ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے نئے نام سامنے آ رہے ہیں اور یہ لوگ افسانوی ادب کے فروغ کے لیے کافی محنت کر رہے ہیں۔ افسانوی دنیا میں ان کا نام روشن نظر آ رہا ہے۔ ان میں پرویز مانوس، ڈاکٹر اشوک مشتاق احمد کینی، مقبول ساحل، پیارے ہتاش، مجیدار جمند، ریاض توحیدی، میر ایواب میر، خالد کرار اور ملک ریاض فلک پیش پیش ہیں۔'' ۲۸

پرویز مانوس کا افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت'' منظرِ عام آ چکا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں طبقاتی کشمکش اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کی عکاسی اپنے انداز سے کرتے ہیں۔ '' کچھ لمحے کچھ سائے'' ڈاکٹر اشوک پٹواری کا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں ہاسپٹل (اسپتال) کا موحول ملتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ایسا موحول ان کے پیشے سے منسلک ہے۔ میر ایوب میر اپنے افسانوں کے ذریعہ معاشرہ کو بدلنے کی وکالت کر تے ہیں۔ ''ٹھنڈی آگ'' کے بعد ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''اور پھر ایک دن'' شائع ہو چکا ہے۔ مجیدار جمند کے کہانیوں کی زبان رواں دواں ہے۔ ''ابابیلوں کی بستی'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی کے افسانوں میں کشمیر کا درد و کرب، خون خراب اور ٹوٹتی ہوئی زندگی کی جھلکیاں ملتی

ہیں۔'' کالے دیوؤں کا سایہ'' اُن کا افسانوی مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔مشتاق احمد کینی اپنے افسانوں میں عوام دوستی اور انسان دوستی کی تابناک تصویریں پیش کرتے ہیں۔ان کا افسانوی مجموعہ'' غافل'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا ہے۔خواتین میں سیدہ نکہت فارق کا افسانوی مجموعہ'' قہر نیلے آسمان کا'' ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں وادی کے حالات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔وہ شاعرہ بھی ہیں۔نسرین نقاش بنیادی طور پر یہ بھی شاعرہ ہیں لیکن انہوں نے آہستہ آہستہ افسانے کی طرف بھی توجہ دی ہے اور قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر رہی ہیں۔عصرِ حاضر میں ریاست جموں وکشمیر کے اُردو افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر قدوس جاوید اپنے ایک مضمون'' آج کا کشمیر اور اُردو افسانہ'' میں لکھتے ہیں۔

> '' اکیسویں صدی میں تیسری دنیا کے ممالک ،مثلاً۔۔۔،سوڈان ،فلسطین ،افغانستان وغیرہ (black Literature) اور ہندوستان میں دلت لٹریچر کے حوالے سے یہ تصور بھی عام ہو رہا ہے کہ'' کاغذ اور زمین'' پر الگ الگ چہروں کے ساتھ جینا منافقت ہے۔اگر یہ مفروضہ قابل ہو تو آیئے اب کشمیر کے ماضی قریب کے ادبی سرمایہ کے اندر جا کر اپنے قلم کاروں کے تخلیقی رویوں کو سوچ لیں۔ہم گئے ....اور واپس آئے۔ ۹۰۔۱۹۸۹ء کے بعد کے کڑے وقتوں کے زیر سایہ بلوغت حاصل کرنے والے'' حال'' کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کو ہم میں سے نور شاہ ،محمد یوسف ٹینگ ،آ ثاری اور غلام نبی خیال نے دیکھا پرکھا اور پایا کہ'' کرب حاضر کے رمز شناس ان افسانہ نگاروں کے افسانوں میں سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں'' اور ایسا اس لیے ہے کہ یہ افسانے کشمیر کی عصری زندگی کے کلیدی استعاروں ،گولی ،چیک آوٹ ،گرینیڈ دھماکہ ،تلاشی ،بنکر اور کرفیو وغیرہ کو گرفت میں لے کر بُنے گئے ہیں۔غلام نبی ،شاہد ،مشتاق مہدی ،ریاض

توحیدی، ایثار کشمیری، پرویز مانوس، ناصر ضمیر، ڈاکٹر نیلوفر ناز، عبدالرشید راہگیر لداخی وغیرہ کے افسانوں میں عمر مجید، نورشاہ، اشرف آثاری، خالد حسین، حسن ساہو، عبدالرشید شیخ، شبنم قیوم، دیپک بدکی اور دیپک کنول، زاہد مختار وغیرہ معتبر افسانہ نگاروں کی طرح تجلیات کلیم کی ضیا پاشیاں اور مشاہدات حکیم کی گل افشانیاں تو نہیں لیکن یہ بات طئے ہے کہ گذشتہ دو ڈھائی دہائیوں میں کشمیر جو کچھ ہوا، ہورہا ہے ان سب کی اصلیت کا اندازہ نئی نسلوں کے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بیان کردہ سچائیوں کی تہوں اور طرفوں کو کھولنے کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔'' ۲۹

جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب کے مقابلے افسانوی اور شعری ادب کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ چند گنے چنے لوگوں نے غیر افسانوی نثر کو فروخ بخشا ہے۔ یوں تو غیر افسانوی ادب کے زمرے میں انشائیہ، خاکہ، سفر نامہ، خودنوشت اور مکتوب وغیرہ سب کچھ آتے ہیں لیکن غیر افسانوی ادب کی جس صنف کو شعوری یا غیر شعوری طور فروغ ملا وہ اُردو خودنوشت ہے۔ جموں وکشمیر میں کی جن اردو سوانحی عمریوں کو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اُن می غلام عباس کی ''کشمکش''، شیخ محمد عبداللہ کی ''آتش چنار''، سردار محمد ابراہیم خان کی ''متاع زندگی''، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ''، ڈاکٹر کرن سنگھ کی ''ولی عہد''، سید میر قاسم کی ''داستان حیات''، ڈی ڈی ٹھاکور کی ''یادوں کے چراغ''، آغا اشرف کی ''کچھ تو لکھیئے کہ لوگ کہتے ہیں''، شیخ محمد عبداللہ کی ''آتش چنار''، سید علی شاہ گیلانی کی ''ولر کے کنارے''، شہاب عنایت ملک ''یادوں کے لمس'' وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

جموں وکشمیر میں اردو آپ بیتی کے ابتدائی نقوش مختلف اصناف سخن میں منتشر صورت میں موجود ہیں۔ اس وقت کی تحقیق کے مطابق جموں وکشمیر کی پہلی شعری تخلیق ''گلزارِ فقر'' ہے اس میں آپ بیتی کی پہلی کاوش کے عناصر موجود ہیں۔

''گلزارِ فقر'' کے بعد انیسویں صدی کے وسط تک کوئی اور شعری یا نثری تخلیق ایسی سامنے نہیں آئی جس میں آپ بیتی کے نقوش پائے جاتے ہوں۔ تقریباً ڈیڑھ صدی بعد کشمیر میں اردو کی پہلی نثری تحریر ایک ''سفرنامہ'' کی صورت میں لکھی گئی۔ ''سفرنامہ بخارا'' شیر سنگھ کا سفرنامہ ہے، جو مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ۱۸۶۱۔۱۸۶۷ء میں لکھا گیا۔ اس سفرنامے میں شیر سنگھ نے اپنے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے سفر کے کوائف اور اپنے حالات اور مقصد سفر کی تفصیلات ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل رپورٹ کی صورت میں مرتب کیں۔ سفرنامہ خود ایک خودنوشت تحریر اور اپنے احساسات، خیالات اور حالات پر مشتمل تحریر ہونے کے باعث آپ بیتی کا حصہ ہے۔ لہذا آپ بیتی کے ابتدائی عناصر کی تلاش میں اسے بھی کشمیر میں اردو آپ بیتی کی تاریخ کا ایک اہم اولین ثبوت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح چراغ حسن حسرت، ہرگوپال خستہ، پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولوی میر عالم کی تصانیف اور اس عہد کے دیگر شعرا اور ادیبوں کی تخلیقات میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں۔

اردو آپ بیتی کی باقاعدہ ابتدا سے قبل ایک آپ بیتی کا تذکرہ ضروری ہے، جو اگرچہ انگریزی میں لکھی گئی اور صاحب تصنیف نے پچیس سال کی عمر میں لکھی، جس کے باعث جزوی ہے لیکن اپنے اسلوب بیان اور جدید رجحانات کے باعث اردو آپ بیتی کے لئے راہ ہموار کرنے والی ہے۔ یہ آپ بیتی رسول گلوان کی "Servant of the Sahibs" ہے۔ رسول گلوان جموں وکشمیر کا پہلا باشندہ تھا جس نے اپنی زندگی کی سرگزشت انگریزی زبان میں لکھی۔ اس کا پورا نام غلام رسول گلوان تھا۔ اس کی پیدائش لیہہ میں ہوئی۔ وہ ایک معمولی قلی تھا، اس نے یورپی سیاحوں کے ہمراہ کشمیر کے مختلف حصوں اور سنٹرل ایشیا تک متعدد سفر کئے، اپنی محنت سے انگریزی زبان سیکھی اور ترقی کرتا ہوا بڑے عہدے تک پہنچا:

''رسول گلوان نے اپنی کتاب امریکی سیاح اور محقق رابرٹ براٹ کی تحریک پر لکھی۔

رابرٹ کی ہدائت پر رسول گلوان اپنی خودنوشت کے مسودے صاحب کو مختلف پتوں

پر بھیجتا۔ پہلی کوشش میں رابرٹ نے کئی مرتبہ دوبارہ لکھنے کے لئے واپس کیے۔ آخر

کار بقول رابرٹ براٹ رسول گلوان نے لکھنے کا ایک طرز پالیا اور اسی کو اپنایا۔'' ۳۰؎

رسول گلوان کی آپ بیتی اس حوالے سے اہم ہے کہ اس میں طرزِ نگارش آپ بیتی کت اسلوب اور دیگر امور کا کسی حد تک اس زمانے میں خیال رکھا ہے۔ جب اردو میں آپ بیتی کے فنی امور ابھی طے بھی نہ پا سکے تھے۔ اس کی وجہ رابرٹ براٹ کی رہنمائی تھی۔ رسول گلوان نے آپ بیتی میں زندگی کے ابتدائی ایام، بچپن، جوانی اور سفر کی روداد کو تفصیلاً تحریر کیا ہے، جس سے اس کی ذاتی زندگی کی مہم جو یانہ صورت حال کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کے آخری ربع اور بیسویں صدی کے پہلے ربع کے لداخ کی سماجی زندگی، تعلیمی کیفیات، معاشی حالات، تمدنی سرگرمیوں، سیاسی کوائف اور ریاست بھر کے حالات کا علم ہوتا ہے۔

جموں وکشمیر میں اردو ادب کی تاریخ میں پہلی باقاعدہ تصنیف منشی محمد دین فوق کی ''سرگزشت فوق'' ہے۔ لیکن یہ بھی زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوئی۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کا مسودہ مولوی محمد عبداللہ وریشی کے پاس موجود ہے۔ یہ آپ بیتی ۱۹۴۵ء سے قبل کی آپ بیتی ہے۔ ڈاکٹر علم الدین سالک ''سرگزشت'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فوق صاحب خود اس کا مرکزی کردار ہیں۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی اس بات کو فراموش نہیں کرتے کہ وہ اپنی سرگزشت لکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو شخص ان سے ملا اس کا تذکرہ انھوں نے اس انداز سے کیا کہ اس ک خوبیاں نمایان ہو جاتی ہیں اور وہ زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔ ان کے بیان میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ وہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے مگر حقیقت کو ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں کہ اس میں افسانے کا مزہ آتا ہے۔ ان کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب ہندوستان میں آئے۔ کئی تحریکیں اُبھریں، جماعتیں بنیں

اور بگڑیں، پرانی قدریں مٹیں اور نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ان سب کا ذکر اور اثر آپ کی زندگی کی ہر منزل میں نظر آتا ہے،''۳۱؎

ڈاکٹر اجمل نیازی ''سرگزشت فوق'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''سرگزشت فوق'' آپ بیتی اور جگ بیتی کا ایک دلچسپ امتزاج ہے۔اس میں علامہ اقبال کے علاوہ مولونا عبدالحکیم شرر، مولانا حالیؔ، داغ دہلوی، محمد حسین آزاد، اکبرالہٰ آبادی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، خوجہ حسن نظامی، آغا حشر کاسمیری اور کئی دوسرے اہل علم اور اہل قلم حضرات کے ساتھ فوق کی ملاقاتوں اور خط و کتابت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔اس طرح ان کے زمانے کے فکری رجحانات اور ذاتی خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔''۳۲

المختصر ۱۹۴۷ء سے قبل اردو آپ بیتی کا باقاعدہ اردو آپ بیتی کا آغاز ہو چکا تھا لیکن یہ اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی۔منشی محمد دین فوق کی ''سرگزشت فوق'' کے علاوہ کسی دوسری آپ بیتی کا سراغ نہیں ملتا۔اس لئے ہم اسے کشمیر میں اردو آپ بیتی کا ابتدائی زمانہ کہہ سکتے ہیں، جس میں اردو آپ بیتی کی بنیاد پڑ رہی تھی۔

۱۹۴۷ء سے پہلے جس نوعیت کی علمی وادبی فضا قائم کی گئی تھی اسی کے زیر اثر ۱۹۵۰ء کے بعد اگر جموں وکشمیر میں اردو آپ بیتی کا سراغ لگایا جایا تو چودھری غلام عباس کی ''کشمکش'' منظر عام پر آئی، ۱۹۶۶ء میں سردار ابراہیم خان کی ''متاع زندگی'' کے بعد شیخ عبداللہ اور کرن سنگھ کی آپ بیتیاں بھی تصنیف ہوئیں۔سیاسی شخصیات کے ساتھ ساتھ شورش کاشمیری اور دیگر علمی وادبی اصحاب نے پاکستان اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں آپ بیتیاں تحریر کیں۔ کشمیر میں اردو آپ بیتی کا یہ دورانیہ موضوعی اور آپ بیتی کے فنی اور فکری ارتقا کے حوالے سے اردو آپ بیتی کے لئے نہایت اہم ہے۔اس دور کی چند منتخب آپ بیتیوں کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے تا کہ کشمیر میں اردو آپ بیتی کے اس

دور کے نمایاں خدوخال واضح ہوسکیں۔

کشمکش:۔ چودھری غلام عباس ۴ فروری ۱۹۰۴ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم جموں شہر میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر ۱۹۳۱ء میں لا کالج لاہور سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ کشمیر کی تاریخ کا اہم ترین دور تھا۔

چودھری غلام عباس کی آپ بیتی ''کشمکش'' ۱۹۵۰ میں تصنیف ہوئی۔ چھبیس ابواب پر مشتمل یہ آپ بیتی اپنے اسلوب، دنداز فکر اور فن کے اعتبار سے ایک اچھی آپ بیتی اور تاریخی دستاویز ہے۔ یہ نہ صرف ایک عہد کی تاریخ کا صاف اور کھرا بیان ہے بلکہ چودھری غلام عباس کی ذاتی زندگی کا احوال، ان کی سوچ وفکر کے ارتقائی منازل میں کارفرما عناصر کی نشاندہی کرنے والی اہم تصنیف ہے۔ چودھری غلام عباس ایک سیاست دان اور پیشے کے اعتبار سے قانون دان تھے۔ چنانچہ سیاسی جدوجہد کا بیان اور اپنی سیاسی زندگی کے واقعات کا ظہار اُن کی آپ بیتی میں لازمی امر ہے۔ اگر کسی فرد کے اظہار میں بلاغت نہ ہو تو یہ اظہار محض واقعہ نگاری یا روداد نگاری بن جاتا ہے۔ مگر چودھری غلام عباس یہ اظہار اپنے وسیع مطالعہ سے خوبصورت بناتے ہیں:

> ''انسان مقرر کردہ نظام قدرت اور عطا کردہ فطرت کے تابع ہے۔ فطرت انسانی ایک تو وہ ہے، جو قدرت کی جانب سے انسان کے حصے میں آتی ہے، یہ فطرت صحیحہ ہے۔ ایک اور فطرت ہے، جو پیدائش کے بعد انسان کے ماحول، امتدادِ زمانہ، گردوپیش کے حالات اور خاص تاثرات ومحرکات کی پیداوار ہوتی ہے۔ یہ فطرت ثانیہ ہے۔'' ۳۳؎

''کشمکش'' کے مطالعے سے چودھری غلام عباس کی زندگی کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ وہ خود احتسابی کے ذریعے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو سمجھنے اور دور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ دوسروں کی تنقید برداشت کرنا، اپنے

دوستوں اور دشمنوں سے سیکھنا اور خود اپنی ذات کا جائزہ لینا ان کی ارتقا پذیر شخصیت کا پتا دیتے ہیں۔

> ''میں نے ٹھنڈے دل سے اپنے آپ کو اپنا ہی ثالث اور محاسب جان کر غیر جانب داری سے ایک ایک کر کے اپنے محاسن اور معائب کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔اس وقت میری عمر ۳۰ سال ہوگی۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ روحانی اور اخلاق اعتبار سے میری عمر میں بیس سال کی کمی ہے اور تجزیہ اور تزکیہ نفس کے اعتبار سے ۲۰ سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔''[۴۳]

لہذا ''کشمکش'' ایک سیاسی اور عوامی شخصیت کی آپ بیتی ہونے کے باوجود اپنے انداز بیان، خوبصورت لہجے اور لوازمے کے باعث اردو ادب کی ایک اچھی آپ بیتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد منظر عام پر آنے والی یہ جموں وکشمیر کی پہلی آپ بیتی ہے، جس نے آگے چل کر جموں وکشمیر میں اردو آپ بیتی کی روایت کے لئے اچھی مثال قائم کی ہے۔

''کشمکش'' میں فنی حوالے سے پہلی کمی تو یہ ہے کہ یہ جزوی ہے۔ چودھری غلام عباس نے ابتدا میں بیان کر دیا ہے کہ یہ وسط اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ان کے آکری بار جیل جانے کے حالات تک محدود ہے۔ اس طرح ''کشمکش'' چودھری غلام عباس کی زندگی کے آخری بیس سالوں کے تذکرے سے خالی ہے۔ چودھری غلام عباس نے آغاز میں ہی اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آٹو بائیوگرافی ایک مشکل فن ہے۔ اس میں غیر جانبداری و رواداری اور جراتِ اظہار و بے باکی کا پلڑا متوازن رہنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ امر اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ چودھری غلام عباس آپ بیتی کے فن سے آگاہ ہیں مگر جس مشکل کا انھوں نے تذکرہ کیا ہے، اگرچہ انھوں نے اس سے نبرد آزما ہونے کی کوشش اپنی آپ بیتی میں کی ہے، مگر وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ انھوں نے کہیں کہیں اپنی تحریر میں ادبی رنگ لانے کی کوشش کی ہے لیکن چند ایک مواقع پر ہی، انھوں نے اکثر و بیشتر سیدھے سادے اور سپاٹ لہجے میں واقعات کو بیان کیا ہے۔ ان واقعات اور معاملات کی تاریخی اعتبار سے اہمیت مسلم ہے مگر آپ بیتی کے فن اور اس کے کو بصورت اسلوب

بیان کے حوالے سے ''کشمکش'' حق ادا کرنے سے اکثر مقامات پر قاصر نظر آتی ہے۔

آتش چار:۔ شیخ عبداللہ جموں وکشمیر کی سیاست کے ایک اہم کردار اور سب سے مقبول رہنما تھے۔ شیخ عبداللہ نے ایک یتیم بچے کی حیثیت سے آنکھ کھولی، بہت مشکل حالات میں اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔ ایک عام مدرس سے وقت انھیں سیاست میں لے آئے اور مختصر عرصے میں وہ سیاست میں اس قدر مشہور ہوئے جس کی تصدیق خود اپنی آپ بیتی ''آتش چنار'' میں کرتے ہیں:

''میں کشمیری عوام کی تحریک کا ایک نشان بن گیا تھا اور میرے نام نے ایک اسطوری یعنی legendry حیثیت اختیار کر لی تھی۔'' ۳۵

شیخ عبداللہ کی آپ بیتی ''آتش چنار'' اپنے مواد اور موضوعات، ادبی رنگ کے باعث ہی اہم نہیں ہے بلکہ اُن کی زندگی کے عجیب وغریب نشیب وفراز کی عبرت ناک داستان بھی ہے۔

آپ بیتی کے تین اسلوب رائج ہیں۔ واحد حاضر میں لکھنا، صیغہ غائب میں لکھنا اور تیسرے شخص کو اپنی سوانح روایت کرنے کا انداز۔ شیخ عبداللہ کی آپ بیتی بھی لکھوائی ہوئی سوانح ہے، جو انھوں نے محمد یوسف ٹینگ کو لکھوائی۔ ''آتش چنار'' کی ادبیت خوبصورت طرزِ بیان اور عمدہ پیرائیہ اظہار میں یوسف ٹینگ ہی کی محنت کارفرما ہے مگر خود شیخ عبداللہ بھی صاحب مطالعہ، ذہن اور شعروشاعری سے وابستگی اور دلچسپی رکھنے والے تھے۔ علامہ اقبال اور غالب کے اشعار کا کثرت سے اور برمحل استعمال اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ شیخ عبداللہ کے علامہ اقبال سے نیازمندی اور فیض احمد فیض سے دیرینہ ذاتی تعلقات معروف ہیں۔ شیخ عبداللہ کی شاعری وادب سے دلچسپی اور یوسف ٹینگ کی تحریر نے ''آتش چنار'' کے اسلوب کو خوبصورت اور دلنشیں بنا دیا ہے۔ ''آتش چنار'' کی دوسری خوبی انکشاف ذات اور اظہار ذات ہے۔ شیخ عبداللہ نے اپنے بچپن کی محرومیوں، اپنے گھرانے کی غربت، اپنی طبیعت کی لاجولانیوں اور سیاسی کلابازیوں کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''میری زندگی میں دھوپ چھاؤں ایک دوسرے کا اس تواتر، تسلسل اور تیزی سے پیچھا کرتے رہے ہیں کہ مجھے ستانے کی فرصت کم نصیب ہوئی۔ یہ ایک عاشق اور سپاہی کی زندگی کا تانا بانا ہے، جو بظاہر دو مختلف رنگوں سے بنا ہے، لیکن غور سے دیکھنے پر ان میں ایک باطنی ہم آہنگی نظر آئے گی۔ میری زندگی میں رومان پرست اور سپاہی کی آویزش میری جستجو کی نوعیت میں ہی مضمر تھی۔''۳۶

''میرے والد میری پیدائش سے کوئی پندرہ دن پہلے وفات پا گئے تھے اور اس طرح میں نے ایک یتیم کی حیثیت سے دنیا میں آنکھ کھولی۔۔۔۔۔ میرے والد نے تین نکاح کئے تھے۔''

''دیگ دان چوں کہ مشترک تھا لہٰذا اس بڑے کنبے میں ہماری پرورش ایک سوتیلے ماحول میں ہوئی۔''۳۷

''میری والدہ کو اپنے سوتیلے بیٹوں کے طعنے اور کبھی کبھار جھڑکیاں بھی سہنا پڑتی تھیں۔ بچاری کو کبھی کبھار ذہنی کوفت کے علاوہ جسمانی اذیتیں بھی برداشت کرنا پڑتیں۔ اس قسم کے ماحول میں ہماری تعلیم و تربیت کا جو حال ہو سکتا تھا اس کا ندازہ کرنا مشکل نہیں۔''۳۸

''آتش چنار'' کی اہمیت اس حوالے سے زیادہ ہے کہ اس میں کشمیر کی تاریخ اور تحریک کو دوسری آپ بیتیوں کی نسبت زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''میں زاتی طور پر ایک ناچیز بندہ ہوں، مگر قدرت نے مجھے ایک تقدیر ساز اور انقلاب آفریں تحریک کی سار بانی اور حدی خواہی کا شرف عطا فرمایا۔ اس لحاظ

سے میری کہانی میرے عہد میں کشمیر کی آپ بیتی بن جاتی ہے اور ہماری عظیم

تواریخ کا حصہ۔'' ۳۹؎

المختصر شیخ عبداللہ کی آپ بیتی '' آتش چنار'' اگر چہ اپنے خوبصورت اسلوب بیان، ادبیت، بھر پور بیانیے اور نفس مضمون کی سنسنی کے حوالے سے ایک دلچسپ اور قابل مطالعہ لوزمے کی حامل ہے، مگر بعض واقعات کے بار بار بیان سے جہاں اس کی وحدت مجروح ہوتی ہے وہاں ضخامت بھی غیر ضروری حد تک بڑھ گئی ہے۔

یادوں کے چراغ:۔'' یادوں کے چراغ'' ڈی ڈی ٹھاکور کی خودنوشت ہے۔ جو ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آئی۔ ۱۰۲ ابواب اور ۴۷۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب سیاسی اور تاریخی دستاویز کہی جاسکتی ہے۔ اگر چہ یہ خودنوشت اُردو میں شائع ہونے سے پہلے انگریزی میں Mylife and years in kashmir Polilics کے نام سے شائع ہوئی تھی لیکن ٹھاکور صاحب کو اُردو کے ساتھ بچپن سے ہی رغبت رہی جس کی وجہ سے آپ نے اپنے تلخ وشریں واقعات ومشاہدات کو عوامی سطح تک پہنچانے کے لئے اردو زبان کو ہی ذریعہ اظہار بنایا۔ آپ نے اُردو اور ریاستی عوام سے اپنی محبت اور لگن کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

> '' چونکہ ریاست میں اُردو سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے اور ساتھ ہی ریاست کا بیشتر
> آبادی کا حصہ اس زبان میں مہارت رکھتا ہے۔ اس لیے یہ خودنوشت مجموعہ الموسوم
> '' یادوں کے چراغ'' اُردو خواندہ قارئین کی نظر کی جارہی ہے''۔ ۴۰؎

ٹھاکور صاحب کا جنم ۹ دسمبر ۱۹۲۹ء میں ضلع ڈوڈہ میں بٹرو کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوا۔ اپنے بچپن کے تجربات ومشاہدات کے ساتھ ہی مصنف اپنے گاؤں کا جغرافیائی اعتبار سے ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ قاری اپنے آپ کو مذکورہ جگہ پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ بٹرو، مگر کوٹ، نیل، رام بن وغیرہ کی سماجی زندگی کا بھی اُنہوں نے بہت ہی عمدہ طریقے سے تذکرہ کیا ہے۔

ڈی ڈی ٹھاکور نے اپنے خاندان کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ اپنے والد ٹھاکور موتی رام اپنے کردار، ایمانداری اور غیر جانبدارانہ خصوصیات کی بنا پر پورے علاقے کے پنچوں میں مشہور تھے۔ والدہ شریمتی دو پتی دیوی والد کی تیسری بیوی تھی کیونکہ اس سے پہلے دو بیویوں کی وفات ہو چکی تھی۔ ٹھاکور صاحب کے بڑے بھائی بھگیلا رام کی پیدائش کے وقت ان کی پہلی سوتیلی ماں کی وفات ہوئی اور دوسری ماتا دیوکی دیوی، رام داس کی پیدائش کے چند سال بعد اس دنیا فانی سے رحلت فرما گئیں تھی۔ والد موتی رام کے کردار اور شخصیت کو مصنف نے بڑی فنی پختگی سے سامنے لایا ہے۔

چار برس کی عمر میں مصنف کو گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کروایا گیا۔ پہلے ہی دن اُردو قاعدہ سے تعلیمی سفر کی ابتدا ہوئی۔ ان کو خاندانی ورثے میں یہ شوق ملا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ وراثت سے جڑا ہوا شوق ہی انہیں اپنی خودنوشت کو اُردو میں بھی شائع کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کے بعد اُنہوں نے پرائمری اسکول بانہال اور ہائی اسکول اودھم پور سے بھی اپنی تعلیم مکمل کی۔ اعلیٰ تعلیم ایس۔ پی کالج سرینگر اور دو سالہ قانون کی ڈگری لکھنؤ یونی ورسٹی سے حاصل کی۔

شری پرتاپ سنگ کالج سرینگر میں دورانِ تعلیم ہی مصنف کو کشمیر کی سیاست اور سماجی صورتِ حال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آہستہ آہستہ اُنہوں نے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ سے اپنے اچھے تعلقات بھی استوار کر لیے۔ ٹھاکور صاحب نے کشمیر کی سیاست کا اس قدر باریک بینی سے مشاہدہ اور تذکرہ کیا ہے جس سے ڈوگرہ شاہی حکومت کی اصلی کارکردگیاں مانند تصور سامنے آجاتی ہیں۔

ڈی ڈی ٹھاکور نے قبائلی حملے کے وقت مہاراجہ کی ہجرت سے متعلق بھی کچھ معلومات خودنوشت میں درج کی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے پہلے ہی ہفتے میں قبائلی حملوں کی خبریں اور رپورٹیں آرہی تھیں۔ حالانکہ مہاراجہ کے پاس یہ خبر پہنچ گئی تھی اور یوں مہاراجہ نے اس کو قابل غور ہی نہیں سمجھا۔ ہندوؤں کا ایک وفد سرینگر سے مہاراجہ کے پاس پہنچا تا

کہ وہ مہاراجہ کو حملے کی خبر دے لیکن مہاراجہ نے ملنے سے انکار کر دیا اور وفد مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔ حملے کے دوران مہاراجہ کشمیر سے بھاگ کر جموں چلے آتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ بزدلی سے اور اپنی رعایا کو مصیبت میں چھوڑ کر اپنی جان بچانے میں لگ گئے۔اس حرکت سے کشمیری عوام کو مہاراجہ سے کوئی ہمدردی نہ رہی اور یوں لوگوں نے ان کو بزدل، وادی کشمیر اور عوام سے بے وفائی کرنے والے حکمران کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔

''اس کے بعد لوگ مہاراجہ کو ایک بزدل اور وادی کے لوگوں سے بے وفائی کرنے
والے کہے جانے لگے۔ یہ دلیل پیش کی جانے لگی کہ ایک حکمران کے لیے اس سے
زیادہ قابلِ نفرت بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو ایک ایسے نازک وقت میں
چھوڑ کر جائے جبکہ لوگوں کو اُمید تھی کہ وہ محاذ پر جا کر ہر خطرے کا مقابلہ کرتے ہوئے
اپنی جان کی قربانی دیں گے۔'' [۱۴]

مہاراجہ کے بعد کسی بھی قسم کی حکومت باقی نہ تھی۔نیشنل کانفرس کے کارکنوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور تمام انتظامیہ نیشنل کانفرس کے لیڈروں کے ماتحت تھا۔ٹھاکور نے بیرونی ممالک کا دورہ بھی کیا جن میں لبنان، یونان، اٹلی، پیرس، لندن، جرمنی، اسٹریم ہالینڈ، سوئزرلینڈ وغیرہ ہیں۔ان ممالک میں مصنف کے جتنے بھی شب و روز گزرے ہیں ان کا تفصیلی بیان ہمیں ''یادوں کے چراغ'' میں ملتا ہے۔روزمرہ کے معمولات اور سیر و سیاحت کے دوران اپنے مشاہدات اور تجربات کے ساتھ وہاں کی عوامی زندگی اور طرزِ معاشرت کو بھی بڑی بے باکی اور خوبصورتی سے تحریر کیا ہے۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی آمد و جانشینی کی جنگ کو بھی اس خودنوشت میں موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔فاروق عبداللہ نے جے پور میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے اس سے قبل وہ گورنمنٹ ہسپتال میں بحیثیتِ ڈاکٹر کام کر چکے تھے۔بیماروں اور تیمارداروں سے ان کے ہمدردانہ

سلوک قائم تھے۔ بجائے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے فاروق عبداللہ نے برطانیہ میں ایک ہسپتال میں کام کرنا شروع کردیا اور وہیں ایک نرس مسز رمولی سے شادی کرلی۔ بیرونی ممالک سے واپسی کے بعد شیخ صاحب فاروق کو شیرِ کشمیر انسٹی چیوٹ آف میڈیکل سائنسز کا ڈائریکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن فاروق نے اس سے انکار کردیا کیونکہ وہ اپنے آپ کو کشمیر کا ولی عہد حکمران تصور کرتا تھا۔ قلم بند تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب نے حقیقت میں اس چیز کو محسوس کیا تھا کہ میرا بیٹا اس عہدے کو سنبھالنے میں لاپرواہ ہے۔ شیخ عبداللہ خود اپنے بیٹے فاروق عبداللہ کو جانشین بنانے پر خوش نہیں تھے۔ اُنہوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے جب فاروق کو کابینہ میں شامل کیا گیا تھا۔

> ''اُنہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے فاروق کو کابینہ میں شامل کیا ہے لیکن مجھے یقین نہیں کہ میں اپنے فیصلے میں صحیح ہوں۔ میری تمنا ہے کہ کاش میری پسند کا جانشین ہوتا جو میں نے آج کیا ہے اس سے میں خوش نہیں ہوں۔ چند دن پہلے جب میں شدید بیمار تھا وہ معمولی بہانہ بنا کر بنگلور جانا چاہتا تھا جبکہ آپ یعنی ٹھاکر صاحب نے اس کو جانے سے باز رکھا۔ اُنہوں نے وقت کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے جی ایم شاہ کے کان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس گھر میں کل تک جو چہل پہل تھی وہ ختم ہوگئی۔ اب سارے راستے گپکار روڈ کو جاتے ہیں۔ فاروق کا مکان گھپ گار روڈ پر تھا۔''۲۴؎

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ اپنے بیٹے فارق عبداللہ کی کارکردگیوں سے خوش نہیں تھے اور نہ ہی ان کو اپنے بیٹے پر پورا یقین اور اعتماد تھا۔ جانشینی کے سلسلے میں بھی اپنی مرضی سے ہی قدم اُٹھانا چاہتے تھے لیکن حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ شیخ صاحب کو اپنی دل خواہشات کا گلہ گھونٹنا پڑا۔ جانشینی کے بعد فاروق عبداللہ کا واحد مقصد اپنے والد کے وزیروں سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔

خودنوشت ''یادوں کے چراغ''میں مصنف نے اپنی علالت کا بڑا دردناک ذکر کیا ہے۔اکثر ان کو آئی سی یو اور سی سی یو میں رکھا گیا۔حالت زیادہ ابتر ہوگئی تو کئی مرتبہ ہیموڈائی لیسس بھی کروایا گیا۔کتاب کے آخری حصے میں اُنہوں نے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں جن میں ان کا زندگی سے متعلق نظریہ، مذہب کے متعلق ان کا رویہ، انسانی فطرت، دنیاوی قوانین اور اپنے ذاتی مشاہدات اور محسوسات کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے۔

مجموعی طور پر''یادوں کے چراغ''میں ڈی ڈی ٹھاکور نے اپنی زندگی کے نجی واقعات ومشاہدات کے ساتھ ہی اپنے تجربات کو بھی پیش کیا ہے۔اپنے تعلمی سفر میں آبائی گاؤں، بانہال، ایس پی، کالج سرینگر، لکھنو یونی ورسٹی کے گزشتہ دنوں کو بڑے ہی عمدہ پیرایۂ اظہار اور خوش اسلوبی سے تحریر کیا ہے۔خودنوشت میں ریاست کی سیاست کا اس قدر تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے کہ شاید ہی ریاستی سطح پر سیاسی معلومات کی کوئی دوسری کتاب فراہم کر سکے۔گویا خودنو شت ذاتی تحریر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی دستاویز بھی کہی جاسکتی ہے۔

کچھ تو لکھیے کہ لوگ کہتے ہیں:۔آغا اشرف کی خودنوشت ہے جو ۲۰۰۹ء میں شالیمار آرٹ پریس سرینگر سے شائع ہوئی۔اگر چہ اس خودنوشت کو اشرف کے عزیز شاگرد سید حبیب نے ترجمہ کر کے اُردو زبان میں شائع ہونے کے مرحلے تک پہنچایا ہے۔اس خودنوشت سے قبل ہی سید حبیب صاحب نے اپنے استاد (آغا اشرف) کی سوانح عمری ''راہنما''کے عنوان سے لکھی تھی۔

اشرف صاحب نے یہ خودنوشت باضابطہ طور پر نہیں لکھی بلکہ اُن کے ایک عزیز کے کہنے پر وہ اس کو کیسٹ میں ریکارڈ کر کے محفوظ کر لیتے تھے اور یوں یہ برقی مواد کتابی صورت میں اُردو زبان کی وساطت سے شائع ہوتا ہے۔

خودنوشت''کچھ تو لکھیے کہ لوگ کہتے ہیں''کے کل گیارہ ابواب اور ۳۲۳ صفحات ہیں۔یہ خودنوشت سوانح عمری ایس پی کالج سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، یورپ اور امریکہ میں تسلیم وتربیت کے دلکش تجربات وواقعات کی داستان ہے۔اپنی اعلیٰ تعلیم کے دوران وہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے بہت متاثر ہوئے۔اُنہوں نے ذاکر صاحب کی

طبیعت، شخصیت اور علم و آگہی سے بہت فیض حاصل کیا۔ اشرف صاحب ذاکر حسین کو اپنا رول ماڈل مانتے ہیں۔ یہاں تک وہ ان سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ عاشقی کا بھوت اپنی سحر انگیزی میں گرفتار کرنے لگا۔

> ''ذاکر صاحب نے اپنے بولوں سے مجھ پر عاشقی کا سحر پھینک دیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اُن دنوں کری لحاظ سے میں، اسکول میں، کالج میں، سماج میں، مذہب میں جو کچھ ہو رہا تھا، مجھ پر اثر انداز ہو رہا تھا''۔۴۳؎

خودنوشت کا پہلا باب ''آغاز اور بڑھتی ہوئی زندگی'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے اپنے بچپن کے مشاہدات اپنے خاندان کے تمام افراد کی علم پروری اور ان کے عہدوں سے متعلق گفتگو کی ہے۔ اشرف صاحب کی شخصیت پر دادا اور نانا کی شخصیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ دادا مغربی طرز کے شوقین اور نانا مشرق و مغرب کا دل کش امتزاج تھے۔ آغا اشرف کا تعلق ایک جاگیردارانہ خاندان سے تھا۔ اُنہوں نے اپنے خاندان کی جاگیردارانہ شان و شوکت، وضع قطع اور ٹھاٹھ باٹھ کو بھی سامنے لانے کی سعی کی ہے۔

اشرف علی نے اپنے بچپن، ابتدائی تعلیم، جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش سے متعلق کوئی بھی معلومات فراہم نہیں کی ہے۔ البتہ اپنی پیدائش سے متعلق وہ صرف اتنا لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۱ء میں جبکہ عمر کی پہلی دہائی سے ہی گزر رہا تھا۔ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین سے ذہنی و نفسیاتی ٹکراؤ کا حادثہ پیش آیا۔ اگر وہ ۱۹۴۱ء میں عمر کی پہلی دہائی سے گزر رہے تھے تو ان کی عمر تقریباً دس برس ہو سکتی ہے تو یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی پیدائش ۱۹۳۱ء کا زمانہ گزر چکا تھا اور میری عمر تقریباً گیارہ سال کی تھی۔ اس لحاظ سے سن پیدائش ۱۹۳۰ء ٹھہرتا ہے۔ ان دو بیانات کی بنیاد پر ہم ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۱ء کے درمیانی عرصے کو ہی ان کی پیدائش کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے بچپن، بھائی، والدہ، بچپن کے دوست و احباب، مکتب، ابتدائی تعلیم وغیرہ کا کہیں بھی کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشرف صاحب نے اپنے بچپن کے شب و روز اور ابتدائی تعلیم کو نظر انداز کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مصنف

نے اپنی والدہ محترمہ بیگم ظفر علی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ وہ اپنے وقت کی معزز شخصیات میں شمار ہوتی تھیں اور اُنہوں نے ریاستی اور ملکی سطح پر سرکاری عہدوں پر کام کیا ہے لیکن اشرف صاحب نے اس کتاب میں ان کے تذکرے میں ورق سیاہ نہیں کیا ہے۔

مصنف نے اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں بیرونی ممالک کی سیر بھی کی اور اُنہوں نے مغربی تہذیب کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ بھی کیا۔ مغربی تہذیب کی کھوکھلی شان وشوکت پر اُنہوں نے طنز بھی کیا ہے۔ مغربی ممالک میں امریکہ اور یورپ جیسے ملکوں کی عصر حاضر کی تہذیبی قدروں کا زوال آمادہ تصویر کو اُنہوں نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ قتل، خودکشی، طلاق، بے رحمی اور عصمت ریزی اور شخصی آزادی کے نام جسم فروشی اور بے حیائی وغیرہ پر ہوئے دل کے تاثرات سامنے لائے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکی سماج میں غریب رعایا سے جو بھاری تعداد میں ٹیکس وصول کیے جاتے تھے اس سے امیر اور غریب کے درمیان ایک خلا بن چکی تھی۔

ملٹری جی ، جے ہند کے عنوان سے مصنف نے کشمیری پنڈتوں کے دلوں کی حقیقت بیان کی ہے۔ جموں وکشمیر میں جب سے ہندوستان و پاکستان اور چینا کی طرف سے تعینات فوج کے دبدبے سے عوام کے دلوں میں ایک خوف بیٹھ گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے جب پہلی بار ہندوستانی فوج اور فوجی افسر باریک تر بند گاڑیوں میں گذرے تھے۔ شیخ صاحب کو کشمیریوں نے لارڈ کرشنا کہا۔ کشمیری پنڈتوں نے فوج کو دیکھ کر نعرے لگائے ''جے ہند'' مہاتما گاندھی کی جے، پنڈت نہرو کی جے، لیکن یہی خوش ہونے والے کشمیری پنڈت فوج کے تسلط سے اس قدر خوف زدہ ہو گئے کہ ان کے دل کے اندر ایک احساس کمتری پیدا ہو گیا اور فوج کے ڈر سے جلدی جلدی صرف ملٹری جی کے الفاظ نکلتے ہیں۔ ایک کشمیری پنڈت نے چاہا کہ وہ فوجی افسر کو اپنے گھر چائے پلائے مگر پنڈت جی کو معلوم نہیں کہ اس کو کس طرح بلایا جائے کیونکہ کشمیر جنتِ بے نظیر میں امن وخوشحالی تھی اور جنت میں فوجی تسلط کا دبدبہ کیا معنی رکھتا ہے۔

''جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی فوج کشمیر میں داخل ہوئی تو ایک فوجی حبہ کدل کے
اوپر نمودار ہوا، گشت کرنے لگا۔ ایک کشمیری پنڈت نے اسے ذرا دور سے دیکھا اور
چاہا کہ فوجی کو چائے پلائے مگر پنڈت کو کو معلوم نہیں تھا کہ اسے کس طرح
پکارے۔ فوجی سے ڈر کر اس کی زبان سے چیخ سی آواز نکلی۔ 'ملٹری جی'' ڈی پی درصا
حب ہمیں محفوظ کرانا چاہتے تھے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ملٹری جی کا ڈرامہ کشمیر میں
کتنے کھیل کھیلے گا۔'' ۴۴؎

اگرچہ مصنف نے اپنی زندگی کے کچھ واقعات اور حقائق کو نظر انداز ضرور کیا ہے مگر جو کچھ اُنہوں نے ضبطِ تحریر میں لایا وہ خودنوشت کے بنیادی اصولوں پر پورا اُترتا ہے۔ حقیقت گوئی کو خودنوشت کا اصلی جز مانا جاتا ہے۔ اُنہوں نے اپنے نانا کے ساتھ بچپن میں برانڈی لی تھی ۔ حالانکہ وہ اس کے عادی نہیں تھے بلکہ وہ جوڑوں کے درد کو دور کرنے کے لئے برانڈی استعمال کرتے تھے۔ آخری حصے میں اشرف علی نے اپنی معلومات اور مطالعہ شدہ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

مجموعی طور پر اشرف علی نے یہاں اپنی ذاتی زندگی کے واقعات و مشاہدات اور دوست واحباب کا تذکرہ کیا ہے وہیں اُنہوں نے اپنی تعلیم کے دوران جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور امریکہ و یورپ کے تعلیمی اداروں اور سماجی سطح پر مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔ مغرب کی کھوکھلی تہذیب پر طنز، کشمیری عوام پر فوج کا تسلط، شیخ محمد عبداللہ اور جموں و کشمیر میں سیاسی بیداری، آزاد کشمیر، جامعہ ملیہ میں معزز شخصیات سے روابط اور علی گڑھ میں سیاسی لہر، گاندھی جی، نہرو اور آزاد کی سیاسی بصیرت پر تفصیلی گفتگو، اپنے خاندان کی جاگیردارانہ شان و شوکت، وضع قطع اور ٹھاٹھ باٹھ، دادا اور نانا کی مغربی اور مشرقی طرزِ شخصیت کی مماثلت اور تضاد، دوست واحباب اور آخری حصے میں اسلامی نقطہ نظر سے اپنے ذاتی مشاہدات اور محسوسات وغیرہ کو بہت ہی فنکارانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔

رودادِ قفس:۔ ''رودادِ قفس'' سید علی شاہ گیلانی کی آپ بیتی ہے۔جنہوں نے جدوجہد آزادی کشمیر میں اپنی زندگی کے متعدد سال جیل میں گزارے ہیں۔سید علی شاہ گیلانی کی آپ بیتی ''رودادِ قفس'' نہ صرف ایام جیل کی کہانی ہے بلکہ جدوجہد آزادی کی مکمل تاریخ اور گیلانی کی زندگی کے شب وروز کی عکاس بھی ہے۔سید علی گیلانی کی پوری زندگی بھرپور اور پرآشوب ہنگاموں میں گذری ہے، انھوں نے مشکل حالات میں اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔ بچپن میں غربت، پریشانی، تنگی اور ناموافق حالات سے گزر کر سیاست کے میدان میں آئے۔تحریک آزادی کے ہدی خواں اور رہنما ہوکر وہ گویا مشکلات کے بحرِ بے کراں میں کود پڑے۔چنانچہ ان کی اس بھرپور زندگی کی یہ داستان بھی کئی حوالوں سے منفرد اور بھرپور ہے:

> ''لوگ آپ بیتی لکھتے ہیں اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے اور خودنوشت سوانح عمریاں ''میں'' ہی کے گرد گھومتی ہیں، لیکن سید علی گیلانی کی آپ بیتی ایک تحریک اور جدوجہد کی کہانی ہے۔بات آخری گرفتاری (اپریل ۱۹۹۰ء) سے شروع ہوئی اور پھر کشمکش سے بھرپور ایک پوری زندگانی پردہ سیمیں پر فلم کی مانند جلوہ فگن ہوگئی ہے اور قاری داستان کے مرکزی کردار سے بھی کہیں زیادہ اصل جدوجہد میں گم ہوجاتا ہے، جیسے وہ خود بھی اس جہاد کا ایک کردار رہا ہو۔''[۴۵]

''رودادِ قفس'' پہلی بار ۱۹۹۳ء میں الہدیٰ پبلشنگ ہاؤس سری نگر نے شائع کی۔اب تک اس کے بیسوں اڈیشن چھپ چکے ہیں۔سترا ابواب پر مشتمل یہ طویل داستان عزیمت اپنے خوبصورت اسلوب، بہترین لوازمے اور موضوعاتی انتخاب کی وجہ اول تا آخر دلچسپی اور انہاک سے پڑھی جانے والی آپ بیتی ہے۔آپ بیتی کا آغاز دلچسپ انداز میں ''خواب'' کے عنوان سے ہوتا ہے،''ام انسہ کا خواب'' (۱۹۹۰) کے سے داستان اسیری کا آغاز ہوکر فلیش بیک کی طرز پر اسیری کی داستان پیچھے ۱۹۶۲ء تک چلی جاتی ہے۔پھر ''رودادِ قفس'' میں علی گیلانی جیل

یاترا، گھر، خاندان اور احباب کا تعارف کراتے ہوئے، تحریکِ جہاد آزادی، تاریخ کشمیر، جیل خانوں کی داستان اور جموں و کشمیر کے تاریخ اور جغرافیہ کی جانے کن کن منزلوں سے گزر جاتے ہیں۔ خارجی حالات و کوائف کے ساتھ ساتھ جذبات و احساسات اور دل کی کیفیات بھی ''روداد قفس'' میں بیان ہوئی ہیں۔ سیدھے سادھے انداز، خلوص اور سچائی کے بیان نے گیلانی کی ''روداد قفس'' کو کشمیر میں اردو آپ بیتی کے سرمائے میں خوبصورت اضافہ بنا دیا ہے۔ آپ بیتی کے فن کی اس بنیادہ خوبی سے گیلانی اچھی طرح اگاہ ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی زندگی کو ایک خوبصورت اور مربوط بیانیے میں پیش کرتے ہوئے واقعات، خیالات اور نظریات کو بھی اس میں پیش کیا ہے۔ ''رودادِ قفس'' کے ایک ایک ورق سے گیلانی کی شاعری اور ادب سے دلچسپی عیاں ہوتی ہے۔ سید علی گیلانی کی اقبال شناسی، اُن کی دیگر کتب اور بالخصوص ''اقبال روح دین کا شناسا'' سے واضح ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال کے اشعار کتاب میں جا بجا ہیں۔ اقبال کے علاوہ مرزا غالب، حفیظ میرٹھی، جگر مراد آبادی، حسرت موہانی، شکیل بدایونی، وحید اختر، فیض احمد فیض اور غنی کاشمیری کے خوبصورت اشعار سے نفس مضمون کو مزین کیا گیا ہے۔ اکثر ابواب کا آغاز اور اختتام شعر سے ہوتا ہے۔ ذیلی عنوانات میں بھی یہی التزام رکھا گیا ہے۔ ''رودادِ قفس'' سے اردو کے بلاشبہ سیکڑوں خوبصورت اشعار کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا

لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اقبالؔ

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

مرزا غالبؔ

بس یہی دوڑ ہے اس دور کے انسانوں کی
تیری دیوار سے اونچی میری دیوار بنے

حفیظ میرٹھیؔ

ہے مشق ستم جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت موہانیؔ

دیار یار تیری جوش جنون پہ سلام
مرے وطن ترے دامان تار تار کی خیر

فیض احمد فیضؔ

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری

فیض احمد فیضؔ

''روداد قفس'' کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کی اردو آپ بیتیوں میں اپنے خوبصورت اسلوب بیان، مربوط اور عمدہ بیانیے، واقعات اور حالات کے فطری تسلسل کے باعث ایک بہترین آپ بیتی ہے۔ اس کی ابواب بندی، ذیلی ابواب کا طریق کار، ان کا نفس مضمون کے ساتھ عمدہ ارتباط اور اشاعتی معیار اس

کے ظاہری واندرونی حسن میں اضافے کا باعث ہے۔آپ کی یہ آپ بیتی کا قرینہ اور بیان فصیح ، دلکش اور پرلطف ہے، جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

وُلرکنارے:۔سید علی شاہ گیلانی کی آپ بیتی ''وُلر کنارے''۱۷۵صفحات اور ۸۹ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں مرکزی مکتبہ تحریکِ حُریت حیدر آباد، سرینگر سے اشاعت پذیر ہوئی۔مصنف کی پیدائش سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔وُلر ایشیا میں اپنے میٹھے پانی کی بدولت مشہور ہے۔گیلانی صاحب نے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں اس سے فیض اُٹھایا اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے ہی اُنہوں نے اپنی بیتی کا عنوان ''ولرکنارے'' رکھا۔ ان کی ولادت ۲۹ستمبر ۱۹۲۹ء کو تحصیل بانڈی پورہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول بوٹینگو ،سوپور سے حاصل کی۔اس کے بعد اُنہوں نے اورینٹل کالج لاہور سے عالم اور کشمیر یونیورسٹی سے فاضل اور منشی فاضل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۴۹ء میں بحیثیت استادان کا تقرر ہوا اور ۱۹۵۰ء میں ان کے والدین نے زور منزل سے سوپور ہجرت کی۔سرکاری طور پر گیلانی صاحب نے ایک ایماندار معلم کی حیثیت سے تقریباً بارہ برس تک وادی کشمیر کے مختلف تعلیمی اداروں میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔۱۹۵۳ء میں گیلانی جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہوئے اور سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر وہ اسی تنظیم کے لیے کام کرنے لگے۔۱۹۶۲ء میں پہلی بار گرفتار ہوئے اور تقریباً تیرہ مہینے کی مسلسل قید وبند میں زندگی گزارتے رہے۔''وُلر کنارے'' کئی اعتبار سے ایک اہم مرتبہ رکھتی ہے۔انسان کو حالات کے ساتھ لڑنے اور اپنی ہمت، حوصلہ اور عزم واستقلال پر قائم رہ کر ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کا حوصلہ بھی دیتی ہے۔گیلانی صاحب نے بچپن میں بہت ہی تنگ دستی کی زندگی گزاری ہے لیکن کبھی اپنے حوصلے کو پست نہیں ہونے دیا۔تعلیمی ذوق کو ہر حال میں قائم رکھا۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے خود کہا کہ میں نے بہت ہی سخت کوشش کا سامنا کیا ہے اور محنت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔غربت نے ایسا غلبہ ڈالا کہ کئی بار سرینگر کی گلیوں میں امانی مزدوری بھی کی اور پتھر بھی ڈھوئے۔کپڑے کے بنڈل اُٹھا کر پھیری بھی کی۔

خودنوشت میں گیلانی نے کئی فرشتہ صفت مسلمانوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جنہوں نے قبائلی حملے کے دوران اپنے ہمسایہ سکھ اور ہندو بھائیوں کی جان و مال کے تحفظ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ سکھ اور ہندو بیٹیوں اور بہنوں کو اپنے گھروں میں پناہ دی اور اسلمی اصول وضوابط کی پاسداری کی اور ایک سچے انسان دوست ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

کشمیر کے مشہور مورخ محمد دین فوق اگر چہ بڑے عالم تھے لیکن گیلانی صاحب کے ساتھ جو سلوک اُنہوں نے کیا اس کو وہ زندگی بھر نہیں بھول پائے۔ حصول تعلیم کے سلسلے میں جب لاہور جاتے ہیں تو فوق نے بجائے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کا موقع فراہم کرنے کے ان کو کوئی اور ہی کام سونپ دیا جو گیلانی کو اپنے گھر سے دوری اور مجبوری کے سبب کرنا پڑتا ہے اور وہ کام تھا فوق کی بیٹی کے گھر نوکر بن کر رہنا۔ حالانکہ فوق نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس لڑکے کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور خوب پڑھاؤں گا۔ گیلانی صاحب کا کہنا ہے کہ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے قول وفعل سے مکر جائیں گئے۔ اس سے گیلانی کا تڑپنا اور بے بسی کے عالم میں آنسو بہانا بھی ایک پُرسوز واقعہ ہے۔

''مرحوم فوق صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لیا...... مرحوم کے ساتھ اوڑی کے راستے سے مظفر آباد پھر راولپنڈی اور وہاں سے ریل کے ذریعے لاہور پہنچ گئے۔ دوسرے ہی دن اُنہوں نے کسی مدرسے کی طرف جانے کے بجائے اپنی بیٹی کے گھر پہنچا دیا۔ جو نزینگ میں سکونت پذیر تھی۔ اور مجھے یہ احساس ستائے جا رہا تھا کہ میں اسکول سے اُٹھائے جانے کے بعد گھریلو نوکر بنا دیا گیا ہوں۔'' ۴۶؎

''یک لخت غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد'' کے عنوان سے گیلانی نے شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی پالیسیوں پر طنز کیا ہے۔ اگر چہ اس وقت ریاست میں ڈوگرہ حکومت کا بول بالا تھا لیکن ۱۹۴۷ء میں جب ملک

تقسیم ہو گیا ہوا اور چار سو یعنی جونا گڑھ، حیدآباد اور پھر جموں وکشمیر میں خاص کر مسلم کا قتل عام ہوا ان واقعات کی سہی تصویر کشی کی گئی ہے۔

آپ بیتی عوامی زندگی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ نجی زندگی کی جھلک بھی پیش کرتی ہے۔ گیلانی صاحب ایک شفیق باپ، ایک نیک شوہر اور اپنے والدین کے تابعدار فرزند ہونے کے علاوہ اپنے بھائی بندوں، رشتہ داروں، ہمسائیوں کے حق سے بھی نا آشنا نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ہر لحاظ سے اپنے فرائض انجام دینے میں کوشاں رہتے ہیں۔

اسلوبی اعتبار سے بھی خودنوشت ایک منفرد مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔ گیلانی صاحب بہت ہی دلکش زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ اُنہوں نے جو سادہ اور حسین نثر کا طریقہ اپنایا ہے۔ وہ واقعی قابلِ داد ہے۔ متعدد واقعات کے بیانات اور مختلف اوقات عوامی خطاب کے سلسلے میں قرآن پاک اور حدیث سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ طرزِ بیان اور اسلوب کے لحاظ سے آپ بیتی اپنی مثال آپ ہے۔

مجموعی اعتبار سے خودنوشت ذاتی زندگی اور عوامی زندگی کے دُکھ درد، ظلم وستم اور جبر وتشدد کی داستان کہی جا سکتی ہے۔ ہندو پاک کے درمیان متعدد جنگوں کا آنکھوں دیکھا حال اور مسئلہ کشمیر کا عالم گیر سطح پر حل نکالنے کی تجاویز وغیرہ کا بہت ہی تفصیلی ذکر ہے۔ الغرض آپ بیتی کو یہاں ذاتی زندگی کے حالات وواقعات کی مکمل ترین عکاسی کا درجہ حاصل ہے وہیں یہ آپ بیتی ایک تاریخی اہمیت کی حامل بھی ہے جس میں کشمیر اور کشمیری عوام کے دل کی دھڑکن محسوس کی جا سکتی ہے۔ اُن کو درپیش آئے واقعات کو حقیقی آئینے میں دیکھنے کا موقع بھی یہ خودنوشت عطا کرتی ہے۔

یادوں کے لمس:۔ ''یادوں کے لمس'' پروفیسر شہاب عنایت ملک کی خودنوشت جنوری ۲۰۱۲ء میں میزان پبلشرز سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۶۵ء میں بھدرواہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں گاٹھ میں آپ کی والادت ہوئی۔ یہاں مصنف نے اپنے آبائی وطن کا نقشہ کھینچا ہے جس میں واسکی ناگ کے مندر کی اہمیت، ہر سال نکلنے والی کہلاش یاترا اور اس کے ساتھ عوامی عقیدت مندی بھی سامنے آجاتی ہے۔

آپ بیتی میں یہاں ذاتی اور نجی زندگی کو موضوع بنایا ہے وہیں کچھ ایسی معزز ہستیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جس سے آپ کو ہمیشہ تحریک ملی ہے۔ان میں پروفیسر امیتابھ مٹو سابقہ وائس چانسلر جموں یونیورسٹی، برصغیر کے نامور صحافی وید بھسین اور شیخ عبدالرحمٰن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر شہاب ملک، قدرت اللہ شہاب سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔اُنہوں نے خود لکھا ہے کہ میری شخصیت کے اندر جو بے باکی ہے وہ قدرت اللہ شہاب کی بے باک تحریروں کا نتیجہ ہے۔قدرت اللہ شہاب کے ''یا خُدا'' کے مطالعے کے بعد مصنف ان کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں وہ خود لکھتے ہیں

''یہ بے باک ناولٹ پڑھ کر میں قدرت اللہ شہاب کا شیدائی بن گیا۔آج میری شخصیت میں جو بے باکی کا عصر ہے وہ شہاب کی تحریروں کی وجہ سے ہے''۔ ۴۷؎

اس خود نوشت میں شہاب ملک نے متعدد عظیم شخصیات اور سیاسی رہنماؤں جن سے اُنہوں نے وقتاً فوقتاً فیض حاصل کیا اور ان کے حوصلہ وعزم کا بھی ذکر کیا ہے۔ان میں ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو، پرویز مشرف، اندرا گاندھی، مولانا آزاد، یاسر عرفات، کرنل قذافی اور صدام حسین وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں جن کے متعلق مصنف نے اپنے تاثر قلم بند کیے ہیں۔

''یادوں کے لمس'' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ مصنف سیرت نگاری کے فن سے بھی بخوبی واقف ہیں۔اس کتاب میں بیشتر شخصیات کا خوبی وخامی کے ساتھ مکمل ترین خاکہ پیش کیا گیا ہے۔اُنہوں نے اپنے دادا جی کی شخصیت و سیرت کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جس سے اس کو وہ وقار ہستی کا دبدبہ، شان وشوکت، اعادات واطوار اور نوابی شوق بھی سامنے آجاتے ہیں جس کی بدولت وہ اپنے علاقہ میں ایک مثالی کردار اور انفرادی حیثیت کے مالک تھے۔

''پورے گاؤں میں دادا جی کا دبدبہ تھا۔خوش لباس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پر

مذاق شخصیت کے مالک بھی تھے۔ نوابوں کی طرح حقہ پینا، گھوڑا اور کتا لے کر

شکار پر چلے جانا اُن کے پسندیدہ مشاغل تھے دادا جان کو پورے گاؤں میں ملک

دین محمد کے نام سے پکارہ جاتا تھا۔عمدہ کھانا کھانے کے بہت شوقین تھے۔گوشت

اور مچھلی ان کی پسندیدہ غذائیں تھیں۔ برف باری کے دوران اپنی بارہ بور کی

بندوق لے کر گھوڑے پر سوار ہو کر اور کتے کو ساتھ لے کر جب وہ بھدرواہ کے

جنگلات میں شکار کرنے کے لئے جاتے تھے تو ایسا لگتا تھا واقعی کوئی نواب جا رہا

ہو۔کبھی کبھی بہت دنوں کے بعد دادا جان لوٹتے تھے تو بہت سارے جنگلی مرغ

اور چکور شکار کر کے لے آتے تھے۔'' ۴۸؎

آپ کی شخصیت کا سب سے نمائندہ پہلو بے باکانہ پن ہے۔ ہمت، عزم واستقلال کی بدولت آپ اپنی مثال آپ ہیں۔خودنوشت میں ایک طرف آپ نے اپنے عزیز واقارب دوستوں اور بزرگوں کے ساتھ اپنے خلوص، محبت، ہمدردی اور عقیدت مندی کو سامنے لایا ہے تو دوسری طرف اُنہوں نے اپنے حاسد اُستاد اور اپنے رشتہ داروں اور اپنے سسرال والوں پر طنز بھی کیا ہے۔ طنز کرتے ہوئے مصنف کو کوئی ہچکی نہیں لگتی چونکہ آپ ایک بے باک انسان ہیں جو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں وہ ہی صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔اپنے استاد کی شخصیت کے کچھ پہلو آپ نے سامنے لانے کی بھر پور سعی کی ہے۔شہاب عنایت ملک نے خود لکھا ہے کہ'' میں نے انہیں اپنے والد سے بھی زیادہ عزت دی'' چونکہ ظہور صاحب مصنف کے والد کے ساتھ ہوسٹل کی زندگی گزار چکے تھے اسی مناسبت سے آپ اُنھیں والد کی جگہ رکھ کر عزّت دیتے ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اس بات کا مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ڈاکٹر ظہور الدین ہمیشہ ہر معصوم انسان کی

شرافت کا ناجائیز فایدہ اُٹھا کر اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں اُنھیں

دوسروں کا آگے بڑھنا بھی اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔۔ میں نے ان (امیتا بھ مٹو) سے وعدہ کیا کہ بہت جلد اپنی کتاب شائع کروں گا۔ خُدا کا شکر یہ ہے کہ میں نے نیا نیا وعدہ بہت جلد اسی سال پورا کیا۔ یہ بات ظہور صاحب کو اچھی نہیں لگی۔ یہ ساری باتیں مجھے ظہور کے شاگرد پہلے ہی بتا چکے تھے۔لیکن مجھے اس وقت ان باتوں کا یقین نہیں آتا تھا کہ چہرے سے سادہ لگنے والا شخص کسی کو دھوکا دے سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ جب میری کتاب قرۃ العین حیدر بحیثیت افسانہ نگار شائع ہوئی۔اس کے بعد ظہور صاحب مجھ سے خفا رہنے لگے۔ میری سلام کا جواب دینا اُنہوں نے بند کر دیا''۔ ۴۹؎

خودنوشت میں جا بجا دلچسپ واقعات بھی قلم بند کئے ہیں۔جن میں چرار شریف، این۔سی۔پی۔یو NCPU کام کرنے والی لڑکی کا واقعہ، یونی ورسٹی و ہوسٹل میں طلبہ کا احتجاج ،گلمرگ کے سفر کے دوران دھرم شالہ میں جانا اور گوجر نگر میں رہاش کے دوران اپنے ذاتی نوکر مختار کی چوری وغیرہ کو مصنف نے بڑی فنکارانہ پختگی سے بیان کیا ہے۔

ایک شرارتی اور سیکولر شہاب خودنوشت ''یادوں کے لمس'' سے اُبھر کر سامنے آتا ہیں۔جن میں بچپن کی شرارتیں،شوق اور جوانی کی اُمنگیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔کالج کی تعلیم کے دوران سال اوّل میں ہی ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جانا،اگر چہ محبت یک طرفہ تھی لڑکی نے محبت کا تحفہ قبول نہیں کیا۔آج تک شہاب صاحب کو اس کا نہایت ہی افسوس ہے اور حیرانگی بھی کہ اس لڑکی نے محبت قبول کیونکر نہیں کی۔مصنف واقعی بچپن میں بہت شرارتی تھے۔دادا جی کے صندوق سے نوٹ چوری کرنا،لوگوں کے مرغ چوری کر کے کھانا،باغات میں چوری پھل توڑ کر ہضم کر جانا بھی آپ کی شرارتوں میں شامل ہے۔

''دادا جان کو صندوق میں نوٹ رکھتے ہوئے دیکھ کر میری نیت بدل گئی جب وہ گھر سے باہر جاتے تھے تو میں اپنا ہاتھ مار لیتا تھا ۔۔۔۔۔۔۔جن دنوں میں بھدرواہ کالج میں تھا ہم دوستوں کو مرغ چرا کر کھانے کی عادت پڑ گئی۔ جب بھی ہم کسی کا مرغ چراتے تھے تو باضابطہ طور پر اس کو حلال کر کے اسے عمدہ طریقے سے پکا کر دریائے نیرو کے کنارے اسے ہضم کرتے تھے۔ہم نے ڈاکٹر عنایت اللہ کے تیتر بھی چرا کر کھائے ۔۔۔۔۔۔اس دور میں گاٹھ میں (آبائی گاؤں) کوئی ایسا باغ نہیں بچا ہوگا جہاں ہم نے چوری کر کے طرح طرح کے سیب و پھل نہ کھائے ہوں گئے۔اس زمانے میں پتنگ بازی کا شوق تھا۔اس کو میں نے بچپن میں خوب پورا کیا''۔ ؁۵۰

اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ پروفیسر شہاب ایک سیکولر کردار اور سیکولر ذہن کے مالک ہیں۔آبائی گاؤں گاٹھ واسکی ناگ مندر اور وہاں سے نکلنے والی یاترا کے ساتھ ساتھ مسجدوں میں اذان کی گونج کے امتزاج سے ہی ان کے سیکولر ذہن کا خمیر تیار ہو گیا تھا۔یونی ورسٹی کی تعلیم کے دوران سیکولر ذہن رکھنے والی شخصیات جناب وید بھسین ،امیتا بھ مٹو،ڈاکٹر مناکشی کیلم ،آنند لہر وغیرہ کی وساطت اور قربت کے فیض سے شہاب عنایت ملک ایک سیکولر شہاب بن جاتے ہیں۔اس کی ایک زندہ مثال یہ ہے کہ امتیابھ مٹو کے ساتھیوں میں بیٹھے ہوئے مصنف کو کسی قسم کی کوئی کوفت معلوم نہیں ہوتی اور نہ ہی گروجی کے ہاتھ سے ماتھے پر تلک لگانے میں کوئی وحشت ہوتی ہے اور یہاں تک کہ امتیابھ مٹو صاحب نے آپ کو ایک خاص نام دیا ہے جس کو قبول کرنے میں بھی آپ کو کوئی دشواری نہیں ہوئی وہ نام ہے''شہاب کول''۔

خودنوشت کی سب سے بڑی خوبی سچائی یعنی حقیقت گوئی ہے۔مصنف نے حقیقت گوئی کا دامن

کہیں نہیں چھوڑا۔حق گوئی اور بے باک پیرائےِ اظہار ہی کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔اس رودادِ حیات میں مصنف نے جس جگہ،علاقے اور جس مقام کا بھی تذکرہ کیا ہے اس کی ظاہری ساخت،خوبصورتی اور منظر کشی کو بھی عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہے۔مصنف کا مشاہدہ بھی کمال کا ہے شہاب صاحب نے کشمیر کے سیاسی وسماجی صورتِ حال سے پیدا ہونے والے کرب کو بڑی گہرائی سے محسوس کیا ہے۔کشمیری لوگوں کو کن حالات میں کشمیر چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی اس الم ناک حادثے کا بھی آپ نے بڑی دردمندی سے ذکر کیا ہے یہ لوگ کشمیر سے تو محروم ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی مشترکہ تہذیب،اپنے کلچر سے بھی محروم ہو گئے۔مصنف کی رہائش کا انتظام ڈھل جیل کے ہاوس بوٹ میں تھا۔یہاں موصوف نے ایک نئے نویلے شادی شدہ جوڑے کو دیکھا جونسل کے اعتبار سے کشمیری ضرور تھا لیکن اپنے کشمیری کلچر اور تہذیبی وراثت سے محروم تھا کشمیر کے آداب،رہن سہن اور کلچر سے نا آشنا تھے۔اس کی وجہ ان کی ہجرت تھی۔جس نے ان کو اپنی وراثت وشناخت سے دور کر دیا۔شہاب صاحب اس سے بہت متاثر بھی ہوئے اور اُن سے محوِ گفتگو بھی۔

> ''ایک شام میں اپنے قریبی دوست خورشید احمد کے جھیل ڈل والے ہوس بوٹ میں ٹھرا ہوا تھا۔وہاں ایک کشمیری پنڈت لڑکا بھی اپنی دلہن کے ساتھ قیام پذیر تھا۔شاید یہ جوڑا ۱۹۸۹ء کے بعد کی پیداوار تھا کیونکہ وہ کشمیر کی تاریخ،تہذیب اور ثقافت سے باہر بے خبر تھے۔اُنہوں نے بہت سی چیزوں کی جانکاری مجھ سے لی۔کتنا بڑا المیہ ہے جس کشمیر کو ان کے بزرگوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ان کی اولادیں اپنے اثاثے کو جاننے کے لئے دوسروں کا سہارا لیتے ہیں''۔۵۱

شہاب ملک نے اپنی زندگی کے اہم واقعات،احساسات ومحسوسات اور تجربات کے علاوہ اپنے عہد میں رونما ہونے والے سیاسی،سماجی،ثقافتی،اقتصادی اور خاص طور سے جموں وکشمیر کی سیاسی صورتِ حال اور بلخصوص

کشمیری قوم کو ہجرت کے سبب بے شمار مصیبتوں، دکھوں اور پریشانیوں کے ساتھ ساتھ کئی خاندانوں کو اپنی وراثت اور کلچر سے بھی دور ہونا پڑا وغیرہ کا بڑے ہی انہماک اور دردناک طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تخلیق اظہار ذات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مصنف اپنے گردونواح اور جگ بیتی کی بھی خبر رکھتے ہیں۔

اُردو انشائیہ:۔ کشمیر میں شاعری، ڈراما، تحقیق وتنقید، صحافت اور فکشن کے حوالے سے اردو کی خدمت کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن اردو انشائیہ کے میدان میں کم ہی حضرات ایسے ہیں جنھوں نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اس صنف کو تقویت بخشنے میں نہایت فراخ دلی سے کام لیا ہے، ان میں محمد زمان آزردہ، محمد شفیع اور ڈاکٹر منصور احمد منصور کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس سے قبل گزشتہ دہائیوں میں شمیم احمد شمیم، سوم ناتھ زتشی، غ۔م۔ طاؤس اور ستار شاہد وغیرہ نے بھی اُردو انشائیہ نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

پروفیسر محمد زمان آزردہ:۔ کی انشائیہ نگاری جس تنقیدی قدر شناسی کی مستحق ہے، اس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ پھر بھی محمد زماں آزردہ نہ صرف اپنی انشائیہ نگاری کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ ان کے انشائیے اپنی انفرادیت، تازگی اور شادابی احساس دلاتے رہے۔

پروفیسر آزردہ کشمیری اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے ۹ مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''غبارِ خیال'' کے عنوان سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا اور پھر یکے بعد دیگر آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور آج اکیسویں صدی میں بھی اس صنف کی آبیاری پوری آب وتاب کے ساتھ کر رہے ہیں۔

آزردؔو صاحب کے تین کشمیری انشائیے ''فکر ہنز ٹکر''، ''ننہ پوش'' اور ''ابسے'' منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اور ''ابسے'' پر اُنہیں ساہتیہ اکادمی انعام بھی ملا ہے۔ اُردو میں ''غبارِ خیال'' کے بعد ''شیرین کے خطوط''، ''غبارِ کارواں

''،'' کانٹے''،'' گلدستہ'' اورسن تو سہی'' شائع ہوئے۔'' کانٹے'' ان کے کشمیری انشائیوں کا اُردو ترجمہ ہے۔غبار کارواں اورسن تو سہی کو کلچرل اکادمی اور یو پی اُردو اکادمی نے انعامات سے نوازا ہے۔''غبارِ خیال'' کے پیش لفظ میں پروفیسر شکیل الرحمٰن ان کے انشائیوں کے بارے لکھتے ہیں۔

> ''غبارِ خیال کے انشائیوں میں جو تاثرات ہیں اور جذبوں کے آہنگ کا جس طرح اظہار ہوا ہے ان سے زماں صاحب کے داخلی ہیجان اور ذہن کی لہروں پر تیز دوڑتی ہوئی چنگاریوں کی بے تابی، ان کی منتشر کیفیتوں اور لفظوں کی صورتوں میں ان کی ''آزادی'' کو سمجھا جا سکتا ہے۔داخلی ہیجان بے تاب چنگاریوں کا انتشار اوران کی آزادی ...... اس آرٹ کی بنیادی خصوصیات ہیں۔محمد زماں کے انشائیوں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بنیادی خصوصیات سے واقف ہیں۔ان کی سوچ، محنت اور ریاضت سے یہ آرٹ ان کا اپنا آرٹ بن سکتا ہے''۔۵۲؎

پروفیسر آزردہ صاحب نے اس صنف کو باقاعدگی سے اپنا کر ایک منجھے ہوئے انشائیہ نگار کی طرح فن کی باریکیوں،نزاکتوں اور گہرائیوں کو گرفت میں لیا ہے۔ان کے آرٹ کا بنیادی وصف چراغ کو سورج دکھانا ہے۔وہ اندھیرے میں ایک چراغ روشن کرتے ہیں اور تاثرات، کیفیات اور احساسات کی آمیزش سے اس کی لو بڑھاتے ہیں۔چراغ کی لو کی تھرتھراہٹ سے مختلف اشیا اور متضاد کیفیات واضح تر ہونے لگتی ہیں کہ انشائیہ نگار چراغ کے آگے اچانک سورج لا کر رکھ دیتے ہیں۔سورج کی تیز روشنی سے چراغ کی لو سے ابھرنے والی کیفیات و تاثرات کے سائے معدوم ہو جاتے ہیں سورج کی تپش شدت سے محسوس ہوتی ہے۔یہ سورج انسان کی فطری ناہمواریوں اور تلخ

حقیقتوں کا اجالا پھیلا دیتا ہے تو چراغ کے ماتھے سے عرق الفعال کے قطرے ٹپک ٹپک کر اسے بجھا دیتے ہیں۔قاری اپنی فطرت، سرشت، مزاج اور حقیقت کے متضاد رخ دیکھ کر تلملاتا ہے۔

''بیل'' آرزدہ صاحب کا ایک اہم انشائیہ ہے۔''بیل'' ہم سب کا دیکھا بھالا جانور ہے لیکن جب انشائیہ نگار ہماری توجہ شہر کے مصروف ترین چوراہے پر پالتی مار کر بیٹھے ہوئے بیل کی طرف مبذول کرتے ہیں تو ہم اس میں نہ صرف دلچسپی لینے لگتے ہیں بلکہ اس انشائیہ سے ان کی انشائیہ نگاری کے کئی رُخ اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ انشائیہ ''بیل'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''میری اس گفتگو کے ہیرو کا شہر کے مصرف ترین چوارا ہے پر پالتی مار کے بیٹھا حیران کن ہے۔لگتا ہے غالب کی طرح یہ آج بھی دنیا کو بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔جلوت میں خلوت کے اس عالم کا تقاضہ آپ پہنچے ہوئے بزرگوں سے ہی کر سکتے ہیں۔'' ۵۳؎

اس اقتباس میں جو نکتہ آفرینی ملتی ہے وہ سوچ اور تاثرات کی لہروں پر دائرہ در دائرہ پھیلتی، بڑھتی اور بکھرتی جاتی ہے لیکن اس بکھراؤ اور انتشار کے پس پردہ تنظیم کا جو مربوط نقشہ اُبھرتا ہے وہ ہماری سماجی مجلسی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے کتنے ہی پہلوؤں کو آئینہ بنا دیتا ہے۔

زماں آرزدؔہ اپنے انشائیوں میں چھوٹے چھوٹے فقروں سے بھی فلسفیانہ انداز بیان کے ذریعے معنی کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں تازگی اور لطافت کا احساس بڑھ جاتا ہے، چند مثالیں دیکھیے۔

زندگی یا تو رسوائیوں کا مجموعہ ہے یا بجائے خود ایک رسوائی''۔ ۵۴؎

''فطرت کا قانون عجیب ہے۔ ہر پھول کے ساتھ کانٹا ہے۔ زندگی کے ساتھ موت ہے۔ دھوپ کے ساتھ سایہ''۔۵۵؎

''وقت ایک آئینہ ہے جس میں جلد یا بدیر ہر آدمی اپنا چہرہ دیکھ لیتا ہے ''۔۵۶؎

زماںؔ آزردہ کے انشائیوں میں اس طرح کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں جہاں وہ فلسفیانہ فکر کے ذریعے زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن ان کا انداز اتنا دلکش اور دلچسپ ہوتا ہے کہ ہم ان کی باتوں کو بڑی آسانی سے قبول کرتے جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر زماںؔ آزردہ کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ خوش گواری میں جب اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں اپنے خیالات کو نئے اور انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں تو نہ صرف ان کی فلسفیانہ سوچ اور خوش طبعی کے جوہر ہم پر عیاں ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے قاری کو افراد اشیا اور اوقاعت کو ایک نئے تناظر میں دکھا کر ایک لطیف وانبساطی کیفیت اور نئے وتازہ احساس سے دوچار کرتے ہیں اور غور وفکر کا ایک نیا زاویہ بھی عطا کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی اسی خصوصیت کے پیش نظر کے۔ کے نیر نے زماںؔ آزردہ کے انشائیوں کی جو تعریف کی ہے وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

''ہمارے ملک میں انشائیہ کے شیدائیوں کی تعداد زیادہ نہیں، زیادہ کیا اتنی بھی نہیں جتنی پاکستان میں ہے۔ زماں آزاردہ کا قلم غنیمت ہے، جو انشایئے کی جوت جگائے ہوئے ہیں۔ ان کے موضوعات بے حد دلچسپ ہیں وہ زندگی اور اس کے مظاہر اور اشیا کو نئے زاویے سے دیکھنے کے عادی ہیں اور وہ اپنے انوکھے تجربوں میں اپنے پڑھنے والوں کو بھی برابر شریک رکھتے ہیں وہ بے حد حساس ہیں اور اسی لیے جب بھی

ان کے لطیف احساسات خارجی ماحول سے متصادم ہوتے ہیں تو ان کے قلم میں شدید قسم کی جنبش اور ارتعاش جاگ اُٹھتا ہے۔ مجھے تو ان کے انشائیوں کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ ہی زندگی اور فرحت کا احساس ہوا ہے کہ وہ انشائیے میں ڈوب کر جی لگا کے لکھنے کے عادی ہیں اور یہی وہ رویہ ہے جسے فیضؔ نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے کا نام دیا ہے''۔۵۷؎

الغرض کہ زماں آزردہ آج بھی متواتر انشائیے لکھ رہے ہیں۔ان کے یہاں موضوعات کی رنگارنگی بھی اور تازگی بھی۔اُنہوں نے جانوروں پر بھی انشائیے لکھے اور انسانوں ں پر بھی،موسم شہر اور انسانی رشتے بھی ان کے انشائیوں کا موضوع بنتے رہتے ہیں۔

منصور احمد منصور:۔زود نویس نہیں ہیں آپ کم لکھتے ہیں لیکن جو کچھ بھی لکھتے ہیں ایک معیار اور وقار کے ساتھ لکھتے ہیں۔منصور احمد منصور کی تصنیف ''کشمیر خواب،سراب،گرداب''۲۰۰۶ء میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں خوب دادِ تحسین وصول کر چکی ہے۔دراصل یہ تصنیف منصور احمد منصور کے ایسے انشائیوں کا مجموعہ ہے جن کا مرکزی محور کشمیر ہے کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں ظلم و جبر کے لامتناہی سسکوں نے کشمیر کی زمین اور ریاست کی عوام کے ضمیر پر جو زخم لگائے ہیں ان سب کو منصور احمد منصور نے اپنے انشائیوں میں کمال مہارت کے ساتھ اپنے وجود میں سمیٹا ہے اور ادبی انداز میں ان کا اظہار کیا ہے۔''کشمیر خواب،سراب،گرداب'' کے مضامین میں کشمیر کے حالات اہل کشمیر کی نفسیات اور عروج و زوال کے اسباب کے حوالے سے بھرپور طنز کے تیر بھی ہیں اور مزاح کے شگوفے بھی دانشورانہ تبصرے بھی ہیں اور فقیرانہ بے نیازی بھی اس بات کا اندازہ ان کے درج ذیل اقتباسات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

''ہماری کہانی بالکل مختلف ہے نہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ وسط اور نہ ہی کوئی انتہا یہ کہانی نہ تو کلائمکس کو پہنچتی ہے اور نہ کسی انجام کو اس کہانی کا کوئی عنوان بھی نہیں کوئی مرکزی کردار بھی نہیں اس کے بہت سے کردار ہیں اس میں سارا معاشرہ ایک کردار کی طرح ہے لیکن نہ کسی کے منہ میں زبان ہے نہ کوئی بولتا ہے تو وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہیں کرتا کیونکہ فطرت نے ہمیں ضمیر سے معاف رکھا اس کے یہاں زبان پر جو بات آتی ہے وہ دل میں نہیں ہوتی اور جو بات دل میں ہوتی ہے وہ زبان پر نہیں آتی۔'' ۵۸؎

ایک اور اقتباس پیشِ خدمت ہے جس میں انہوں نے کشمیر کو عجائب خانے سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''بھائیو! رب کا شکر ادا کرو بہار آئے نہ آئے گُل اب بھی کھلتے ہیں اور روز نئے گل کھلائے جاتے ہیں یہ گل باغوں میں نہیں بلکہ ڈرائنگ روموں اقتدار کے ایوانوں اور محل خانوں میں کھلائے جاتے ہیں ویسے بھی گل کھلانا عجائب خانہ کی پرانی ریت ہے یہاں کی مریادا ہم نے کب گل نہیں کھلائے۔ ہم اس وقت بھی گل کھلائے جب مسلم کانفرنس کے ماتھے پر نیشنل کانفرنس کا قشقہ لگایا اور مسجد سے نمک کو دیر میں آس جمائے۔ ہم نے اس وقت بھی گُل کھلائے جب ''محاز رائے شماری'' کو حرف غلط کی طرح اس کی جگہ زعفرانی اور کیسری رنگ سے ''آوارگی'' لکھ دیا''۔ ۵۹؎

منصور احمد منصور نے اپنی تحریروں میں جموں و کشمیر کو ایک عجائب خانہ سے تعبیر کیا ہے۔ ریاست عوام کی

امیدوں، خواہشوں اور خوابوں کی لغزشوں کا عجائب خانہ، اس ریاست کی تاریخ کے ہر ورق پر ایسے خواب نظر آئیں گے جو کبھی پورے نہیں ہوئے۔ منصور احمد منصور کا یہ کہنا بجا ہے کہ۔

''ہم نے رائے شماری کا خواب دیکھا سرینگر راولپنڈی روڈ کھلنے کا خواب آزادی اور عزت و آبرو کا مقام پانے کا خواب دیکھا لیکن نتیجہ ہمیشہ ہمارے خوابوں کے برعکس ہی سامنے آیا۔ اور اپنی ناتمام اور ناآسودہ آرزوئیں ہمیں تڑپانے لگیں''۔٦٠

منصور احمد منصور نے جموں و کشمیر کی عوام کی سادہ لوحی کی بنیاد پر ریاست کو ایک عجائب خانہ قرار دیا ہے اگر دیکھا جائے تو منصور احمد نے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں کشمیریوں کو جھنجھوڑا ہے اور بیدار کرنے کی ایک بہترین کوشش کی ہے منصور احمد کے انشائیوں کو پڑھ کر ہنسی تو آتی ہے لیکن جب الفاظ اور جملوں میں چھپے ہوئے طنز کا اثر پڑھنے والے کے وجود میں آہستہ آہستہ اُترتا ہے، پھیلتا ہے تو ہنسی شرمندگی اور پچھتاوے میں بدل جاتی ہے اور یہ انشائیہ نگاری کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔

منصور احمد منصور میں بے پناہ صلاحتیں ہیں ان انشائیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے بلکہ زبان و بیان پر بھی قابل قدر قدرت حاصل ہے۔ عام طور پر سادہ اور سہل اسلوب اختیار کرتے ہیں لیکن موقع و محل کے اعتبار سے حسن بیان کا مظاہرہ بھی بڑی خوبی کے ساتھ کرتے ہیں مثلاً۔

''تو صاحبو سب جل کر راکھ ہوا۔ سرو چمن یا قرار خاطر، جسم و جاں ہو یا عزت و ناموس مکان ہو یا مکین...... سرخ جوڑے میں ملبوس آزادی کی دلہن اپنے ہاتھوں میں خون کی مہندی رچائی ہے...... یہ اسی کے ہاتھ آتی ہے جو مرد آزما اور مرد آفریں

ہواور جس کے ہاتھ میں طاوس ور باب نہیں بلکہ شمشیر وسناں ہو، جونعم وناز میں پلا ہوا

بریشم نہ ہو بلکہ فولاد سے بھی سخت ہو‘‘۔۶۱

منصور احمد منصور کے انشائیہ ’’نہ جنوں رہا نہ پری رہی‘‘ میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ طنز کی جو کاٹ ملتی ہے وہ کشمیر کے عصری حالات اور اہل کشمیر کی بے بسی بلکہ بے حسی کے حوالے سے قاری کے دل کی گہرائیوں تک اُتر جاتی ہے۔ مثلاً

’’اساتذہ کی زمین شعرا گلے نہ اگلے اپنی زمین تو صدیوں سے خون اگلتی ہے اسے ہر دور میں بہادران وطن نے خون سے سینچا ہے۔ اگر کبھی خدانخواستہ خشک سالی کی وجہ سے زمین خون اگلنا بند کر دیتی ہے تو لیڈر حضرات فوراً ترنگ میں آ کر نعرہ مستانہ بلند کرتے ہیں کہ ’’اس زمین کو خون سے سینچو‘‘ چنانچہ جو لوگ اپنی جھونپڑیوں کے ننگے فرش پر خون تھوک رہے ہوتے ہیں وہ نعرہ مستانہ سن کر دیوانہ وار جھونپڑیوں سے نکل کر سڑکوں پر آتے ہیں اور خون تھوکتے ہیں یوں زمین پھر سے لالہ زار بن جاتی ہے۔۶۲

منصور احمد نے گذشتہ کئی دہائیوں سے ’’کشمیر‘‘ کے نام پر ہونے والی بھانت بھانت کی سیاست اور تجارت کی بازیگری اور شعبدہ بازی کا صرف مشاہدہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کے اندر رہ کر ذاتی طور پر تجربہ بھی کیا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ کس طرح کشمیر خاک وخون اور وخواب سراب کے محیرالعقول حالات سے گزر کر ایک عجائب خانہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کشمیر کو عجائب خانہ سے تعبیر کرنا مصنف کی کشمیر کے ساتھ عقلی اور منطقی ہی نہیں شدید جذباتی اور قلبی وابستگی کی

بھی مثال ہے۔اس باب میں منصور احمد خود سے باہر ہو جاتے ہیں اور انتہا پسندی ان پر غالب نظر آتی ہے۔بعد غور و فکر کے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ جو قوم صدیوں سے مختلف النوع مسائل اور محرومیوں کا شکار رہی ہو اور عذابوں کے ختم نہ ہونے والے پلِ صراط پر چلتے رہنا جس کا مقدر بن چکا ہو۔اس قوم کے دانشوروں میں بھی اگر بے خوف انتہا پسندی پیدا ہو تو اسے غیر فطری نہیں کہیں گے۔

سفر نامہ:۔ جموں و کشمیر کے تعلق سے اگر سفر نامہ کا جائزہ لیا جائے تو اس میدان میں بھی انشائیہ نگاری کی طرح ابتدا سے بہت کم لوگ ملتے ہیں۔سفر نامہ کے ابتدائی نقوش پنڈت سالک رام کے یہاں ملتے ہیں اور ریاست کا پہلا سفر نامہ سالکؔ کا ''تحفۂ سالک'' تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کے بعد کئی سفر نامے لکھے گئے جن میں ''میری پاکستان یاترا''(ملک راج صراف)'' پاکستان میں دو دن''(اوم پرکاش) ''مجموعہ آئینہ''،'' پاکستان کا سفر'' (حامد یکا شمیری)''کولمبس کے دیس میں،پشکن کے دیش میں(جگن ناتھ آزاد)وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سفر نامہ''میری پاکستان یاترا''جموں کے مشہور صحافی اور دانشور ملک راج صراف کا پاکستان کا سفر نامہ ہے۔ ملک راج ۱۹۷۹ء میں پندرہ دنوں کے لئے پاکستان گئے تھے۔ان کے اس سفر کا مقصد پاکستان میں مقیم اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات اور پاکستان کی سیر تھی۔اسی دوران وہ پاکستان کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں گئے اور سفر نامہ کے ذریعے اپنے اس سفر کے تاثرات بیان کیے ہیں۔یہ سفر نامہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔

ملک راج صراف نے ایک صحافی کی نظر سے پاکستان کو دیکھا ہے اور وہاں کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات کا بنظر غائر جائزہ لیا ہے۔آپ نے اپنے سفر نامہ میں پاکستان میں ہونے والی ترقی،عوام کا خلوص، ہمدردی اور مہمان نوازی، پاکستان کے دیہی علاقوں میں ہونے والی بیداری کی لہر، پاکستان میں چھپنے والے اخبارات اور

رسائل کے عمدہ معیار اوران کے اعزاز میں ہونے والے پروگراموں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ملک صراف کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔وہ صحافی ہیں اس لئے ان کے اسلوب بیان میں صحافیانہ انداز کی جھلک نمایاں ہے۔

''پاکستان میں دو دن'' اوم پرکاش پنڈت کے دو روزہ پاکستان کی زبانی ہے۔ جو انہوں نے شیخ عبداللہ کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں کیا تھا۔شیخ عبداللہ کو ۱۹۵۳ء میں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا تھا۔گیارہ برس بعد شیخ عبدللہ کو رہا کیا گیا تو پاکستان اور ہندوستان کے مابین بڑھتی ہوئی کشیدگی کو ختم کرنے کے لئے دورہ پاکستان پر بھیجا گیا۔پنڈت جواہر لال نہرو کی منصوبہ بندی کے تحت وہ پاکستان کے دورے پر گئے۔اُن کے ہمراہ اس دورے میں اوم پرکاش بھی تھے۔

اوم پرکاش نے اپنے سفر کی کہانی دلچسپ انداز میں تحریر کی ہے۔سیاسی نوعیت کے اس سفر نامہ میں شیخ عبداللہ کے پاکستان میں استقبال اور سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ پاکستان کی روزمرہ زندگی کے بارے میں معلومات، صحافت کی صورت حال، پاکستان میں پریس، اخبارات اور دیگر حالات کو بھی بیان کیا گیا ہے:

> ''اس سفرنامے کو پڑھتے ہوئے یہ تاثر ملتا ہے کہ اگر چانک پنڈت نہرو کی موت واقع
> نہ ہوئی تو یہ دورہ کامیاب رہتا اور دونوں ملکوں کے درمیان مسئلہ کشمیر کے حوالے سے
> جو کشیدگی اب ملتی ہے باقی نہ رہتی۔''۶۳

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے قیام جموں کے دوران جموں میں جو علمی اور ادبی تصانیف منظر عام پولائیں ان میں سے ان کے تین سفرنامے ''جنوبی ہند میں دو دن''، ''پشکن کے دیس میں'' اور ''کولمبس کے دیس میں'' بھی شامل ہیں۔اس حوالے سے انھیں جموں و کشمیر میں اردو ادب کی روایت کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔جگن ناتھ آزاد

قیام جموں کے دوران مختلف علمی وادبی تقاریب، مشاعروں اور دیگر حوالوں سے مختلف مما لک کے دورہ پر گئے۔ ان مما لک کی سیر وسیاحت کے بعد لکھے گئے یہ سفر نامے اُن کے تجربات، مشاہدات کا حاصل ہیں اور علمی وادبی، معلوماتی حوالوں سے بھی اہم ہیں۔ ''پشکن کے دیس میں'' انھوں نے روس کے سفر کی کہانی لکھی ہے۔ ''کولمبس کے دیس میں'' امریکہ اور تیسرا جنوبی ہند کے روداد سفر پر مشتمل سفر نامہ ہے۔ ڈاکٹر ضیالدین ان سفر ناموں میں آپ بیتی کے نقوش کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''جگن ناتھ آزاد نے اپنے سفر کے تجربات کو نہ صرف تخلیقی عمل کا حصہ بنایا بلکہ اس تجربے کو تخلیقات کی صورت دے کر آنے والی نسلوں کے لئے بصیرت اور آگاہی کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔ اس سے اسن کی ذاتی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے جس سے ہم اُن کی شخصیت اور فکر وفن کا جائزہ لے سکتے ہیں۔''۶۴

دور میں ریاست جموں کشمیر میں اُردو سفر نامے کو فروغ دینے والوں میں پروفیسر شہاب عنایت ملک، خواجہ ثنا اللہ بٹ اور صوفی غلام محمد کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفر ناموں میں ''میری لکھنؤ یاترا'' (۲۰۱۱ء)، ''مندروں کے شہر سے گوتم بدھ کی سر زمین تک'' (۲۰۱۲ء)، ''یا ور عباس کے ساتھ پانچ دن'' (۲۰۱۳) اور ''سولن میں چار دن' (۲۰۱۳) قابل ذکر ہیں۔

ان میں سے پروفیسر موصوف کے بیشتر سفر نامے اُن کی تازہ ترین تصنیف ''عصری ادبی تفکرات'' میں شامل ہیں جو ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آئی۔ ان سفر ناموں کے مطالعے سے لکھنؤ، سولن، دربھنگہ اور جموں وکشمیر کے سیاسی،

سماجی، ثقافتی، علمی، ادبی، تہذیبی اور جغرافیائی حالات وواقعات سے آگہی ہوتی ہے۔شہاب عنایت ملک کے سفر ناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شہناز قادری لکھتی ہیں۔

''پروفیسر شہاب عنایت ملک اپنے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی بنا پر اپنے سفر ناموں میں مختلف مقامات کی مکمل تصویر کشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے دورانِ سفر ان تمام جگہوں کی ہمہ پہلو تاریخی، ثقافتی و جغرافیائی حالات کا پتہ لگا کر قارئین کے لیے معلومات کا ایک بیش بہا سرمایہ سپردِ قلم کیا ہے جس کی وجہ سے یہ سفر نامے ہر اعتبار سے بیش بہا معلومات کا منبع و سرچشمہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔'' ۶۵

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفر نامے ریاست جموں وکشمیر کے اکیسویں صدی کے غیر افسانوی ادب میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔وہ سفر نامہ کے فن پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور یہ اپنی نوعیت کے نہایت ہی منفرد اور متنوع سفر نامے ہیں۔

روزنامہ آفتاب کے مدیر خواجہ ثنا اللہ بٹ کشمیر کے ایک کہنہ مشق صحافی، ادیب اور دانشور ہیں۔اُن کا ''سفر نامہ پاکستان'' اپنے ہی اخبار ''آفتاب'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔یہ سفر نامہ بزم دوستاں کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس میں بٹ صاحب نے کئی مصلحتوں کے پسِ نظر پاکستان میں صرف اپنے حلقہ احباب سے ملاقاتوں اور مجلس آرائیوں کا ہی ذکر کیا ہے۔

''وادی کی آواز'' کے مدیر غلام نبی شیدا نے بھی چند برس قبل پاکستان کا دورہ کیا ہے۔اُنھوں نے بھی اپنے

سفر کی روداد اخبار میں بیسیوں قسطوں میں شائع کی۔شیدا کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نتائج سے بے پراہ ہوکر دل کی بات نوکِ قلم پرلاتے ہیں۔''سفرنامہ پاکستان'' بھی ان کے مزاج کےاسی پہلوکوسامنےلاتا ہے۔

اکیسوی صدی کے آغاز میں ہی موتی لال ساقی کا ایک چھوٹا سا قزاخستان کا سفرنامہ چھپا تھا۔ساقیؔ پہلی بار وسط ایشیا کے سفر پر گئے۔اس لئے اُنہیں سوویت دورِحکومت کے وسطی ایشیا کے بارے میں ذاتی اور عملی علم نہ تھا۔اب جب کہ قزاخستان باقی وسطی ریاستوں کی طرف ایک آزاد ملک ہے، وہ بھی اُن بےشمار مسائل سے دوچار ہے جن سے سوویت حکومت کے ٹوٹ جانے کے بعد پورا سابقہ سوویت یونین دوچار ہوا۔غرض کہ قزاخستان قدرتی وسائل سے سرشار ہےاس لئے وہاں باقی ریاستوں کی نسبت تعمیری اور ترقیات کے کام بڑے شدومد سے شروع کیے گئے ہیں۔ ساقیؔ صاحب کا سفرنامہ اس وقت تک بھی قزاخستان پرکسی ریاستی باشندے کا تازہ ترین سفرنامہ شمار ہوسکتا ہے۔

آخرالذکر جموں وکشمیر میں اکیسویں صدی کے غیر افسانوی ادب کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اندازہوتا ہے کہ ریاست میں یہ صنف اپنی کم سنی کے باوجود ہئیتی ،موضوعات اور تکنیکی سطح پر اعلیٰ روایات قائم کرچکی ہے۔موجودہ دور میں ریاستی سطح پر جو غیر افسانوی ادب تخلیق ہورہا ہے وہ بین الاقوامی انشائیوں اور سفرناموں کے مقابلے رکھا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ ہرگوپال کول خستہ، پنڈت: گلدستہ کشمیر، دیباچہ، ص۹، لاہور، آریہ پریس، ندارہ

۲۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔ص۹

۳۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔ص۹

۴۔ حبیب کیفوی: کشمیر میں اردو، ص۴۳۰، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۷۹ء

۵۔ محمد اجمل نیای: فوق الکشمیر محمد الدین فوق، ص۱۷، سنگ پبلیشرز لاہور، ۱۹۹۰ء

۶۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔ص، ۲۳۸

۷۔ قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ، ص۹۱، سنگ میل پبلیشرز لاہور، ۱۹۹۱ء

۸۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۹۱

۹۔ نورشاہ: نورشاہ کے تین ناولٹ، ص۸۳، سیمانت پبلیکیشنز، دہلی

۱۰۔ خواجہ احمد عباس: بحوالہ ڈاکٹر برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص۴۳، ۲۰۰۴ء

۱۱۔ برج پریمی: جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص۴۳، دیپ پبلی کیشنز، نئی پورہ، سرینگر ۱۹۵۸ء

۱۲۔ ایضاً۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۴۶

۱۳۔ اعجاز صدیقی: ماہنامہ شاعر، ناولٹ نمبر، جلد ۲۳، شمارہ ۵، ص۳۹، مئی ۱۹۶۱ء

۱۴۔ نورشاہ: نورشاہ کے تین ناولٹ، ص۸۳، سیمانت پبلیکیشنز، دہلی

۱۵۔ ایضاً۔۔۔۔ : ص۸۴۔

۱۶۔ ترنم ریاض: فریب خطِ گل مورتی، ص۸۵، امیکس بکس، سرینگر ۲۰۰۹ء

۱۷۔ آنند لہر: سرحدوں کے اس پار، ص۱۲، سیمانت پرکاش، دریا گنج، نئی دہلی ۲۰۰۱ء

۱۸۔ ایضاً: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۱۵۔

۱۹۔ ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۳۱۔

۲۰۔ آنند لہر: انحراف، ص۲۱، ۱۶، ۴۱، ۵۶، ۵۷، ملک بک ڈپو ترکمان گیٹ، دہلی۔

۲۱۔ خالد حسین: اشتیہاروں والی حویلی، ص۴۰، میزان پبلیکیشنز، سرینگر

۲۲۔ ایضاً۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۴۱۔

۲۳۔ ایضاً۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۴۸۔

۲۴۔ نصرت چودھری: شیرازہ، جموں وکشمیر میں اردو کے پچاس سال، جلد ۳۷، ص۲۴۰۔

۲۵۔ ناز نوشاد احمد خان یمنؔی: خوش دیو یمنؔی، ایک شخصیت ایک تعارف، ص۲۔

۲۶۔ مشتاق حمد وانی: میٹھا زہر، ص۸، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۸ء

۲۷۔ ڈاکٹر ظہور الدین: خوابوں کے اس پار، ص۷۔

۲۸۔ نور شاہ: جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، ص۳۳۔

۲۹۔ ایضاً۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔ص۳۶۔

۳۰۔ عبد الغنی شیخ: رسول گلدان کی خودنوشت سوانح، مشمولہ شیرازہ، جلد ۴۴، شمارہ ۴ تا ۸، جے کے کلچرل اکیڈمی سرینگر

۳۱۔ علم الدین سالک: مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ص۵۹

۳۲۔ اجمل نیازی، فوق الکشمیر محمد الدین فوق، ص۱۹، سنگ میل پبلیکیشنز اردو بازار لاہور، ۱۹۹۰ء طبع اول

۳۳۔ غلام عباس: چودھری، کشمکش، ص۱۵، راولپنڈی، فیروز سنز، ۱۹۵۴ء

۳۴۔ ایضاً۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۱۲۲

۳۵۔ عبداللہ،شیخ: آتش چنار،ص۱۳۱، گلشن بکس، ریزیڈنسی روڈ، سرینگر،۲۰۰۸ء

۳۶۔ ایضاً۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۲۳

۳۷۔ ایضاً۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۳۲

۳۸۔ ایضاً۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۳۲

۳۹۔ ایضاً۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پیش لفظ

۴۰۔ ڈی ڈی ٹھاکور: یادوں کے چراغ،ص۲۳،گلشن پبلی کیشنز، سرینگر۲۰۰۶ء

۴۱۔ ڈی ڈی ٹھاکور: یادوں کے چراغ، ص۴۵، گلشن پبلی کیشنز، سرینگر۲۰۰۶ء

۴۲۔ ڈی ڈی ٹھاکور: یادوں کے چراغ،ص۶۹،گلشن پبلی کیشنز، سرینگر۲۰۰۶ء

۴۳۔ آغا اشرف: کچھ تو لکھیے کہ لوگ کہتے ہیں، ص۴۴، شالیمار آرٹ پریس سرینگر، ۲۰۰۹ء

۴۴۔ آغا اشرف: کچھ تو لکھیے کہ لوگ کہتے ہیں، ص۲۰۱، شالیمار آرٹ پریس سرینگر، ۲۰۰۹ء

۴۵۔ سید علی شاہ گیلانی: وُلر کنارے،ص۱۵۵، مرکزی مکتبہ تحریکِ حُریت حیدر آباد،۲۰۱۰ء

۴۶۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک: یادوں کے لمس،ص۱۰۸، میزان پبلشرز، سرینگر ۲۰۱۲ء

۴۷۔ ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۹۶

۴۸۔ ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص۵۰

۴۹۔ ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص۲۸،۱۲۷

۵۰۔ ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص۹۵

۵۱۔ ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص۳۳

۵۲۔ شکیل الرحمان اعظمی، پروفیسر: بحوالہ غبار خیال، ص ۱۰۸، میزان پبلشرز، سرینگر ۱۹۷۳ء

۵۳۔ زماں آزردہ، پروفیسر: بیل، ص ۳۷

۵۴۔ زماں آزردہ، پروفیسر: پیشے کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے، غبارِ کارواں، ص ۵۱

۵۵۔ زماں آزردہ، پروفیسر: حضرات مدیر، غبارِ کارواں، ص ۷۳

۵۶۔ زماں آزردہ، پروفیسر: شادی کو سودا سمجھنے والوں کے نام، سن تو سہی، ص ۸۶۔

۵۷۔ کے کے نیر: تاثرات، مشمولہ غبار کارواں، ص ۲۰۶

۵۸۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور: کشمیر: خواب، سراب اور گرداب، صفحہ ۳۳، میزان پبلشرز، سرینگر

۵۹۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور: کشمیر: خواب، سراب اور گرداب، مضمون، کیسے کیسے گل کھلاتے ہیں لوگ، ص ۸۹، میزان پبلشرز، سرینگر

۶۰۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور: کشمیر: خواب، سراب اور گرداب، مضمون، کیسے کیسے گل کھلاتے ہیں لوگ، ص ۴۹، میزان پبلشرز، سرینگر

۶۱۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور: کشمیر: خواب، سراب اور گرداب، مضمون، نہ جنوں رہا نہ پری، ص ۴۳، میزان پبلشرز، سرینگر

۶۲۔ ایضاً۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۲۷۔

۶۳۔ ضیاالدین، ڈاکٹر: کشمیر میں سفرنامے کی روایت، ص ۲۱۰، مشمولہ ماہنامہ شیرازہ، شمارہ ۷، ۸ جلد ۳۸، سرینگر

۶۴۔ ایضاً۔۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۲۱۵

۶۵۔ ڈاکٹر شہناز قادری: اُردو کے چند مشاہیر، ادبستان پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۳ء

☆☆☆☆☆☆

باب چہارم

1950 کے بعد جموں و کشمیر میں اُردو شاعری کا تنقیدی جائزہ

1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اُردو شاعری کا تنقیدی جائزہ

شاعری فنون لطیفہ میں ایک بلند مرتبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔شاعری (poetry) کا مادہ 'شعر' ہے اس کے معانی کسی چیز کو جاننے پہچاننے اور واقفیت کے ہیں۔لیکن اصلاحاً شعرا اس کلامِ موزوں کو کہتے ہیں جو قصداً کہا جائے۔ یہ کلام موزوں جذبات اور احساسات کے طابع ہوتا ہے۔اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو شاعری اپنی حدوں سے آگے نکل کر دوسرے فنون کے دائرہ عمل میں قدم رکھتی دکھائی دیتی ہے اور یہی وہ امتیازی وصف ہے جو باقی فنون لطیفہ سے اسے ممتاز کرتا ہے۔شاعری اپنے خط وخال کو قائم رکھتے ہوئے کبھی فنِ مصوری کو اپنے مخصوص دائرے میں کھینچ لاتی ہے اور کبھی فن موسیقی کو اپنے وجود میں ضم کرنے کی کوشش کرتی ہے،شاعری کی یہ سیماب پائی رائیگاں نہیں جاتی کیوں کہ تخلیقی رچاؤ اور جمالیاتی احساس کے وہ خزانے اس کی دسترس میں ہوتے ہیں جو مصوری، موسیقی یا دیگر فنون کی نمو میں بنیادی توانائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔اچھی شاعری (بلکہ عظیم شاعری) کی تعمیر وتشکیل میں دیگر فنون لطیفہ کا رنگ وآہنگ اپنے تمام خصائص کے ساتھ شامل رہتا ہے۔اس لئے عظیم شاعری سے بہ یک وقت تمام فنون کی کرنیں پھولتی ہیں جو قلب ونگاہ میں رچ بس کر انسانی زندگی کو تجلی زار بنا دیتی ہیں۔

جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے آثار باضابطہ طور پر اس وقت سے مل رہے ہیں جب سے شمالی ہند میں اُردو شاعری کے آثار ملتے ہیں۔ بقول حافظ محمود شیرانی '' دلی میں ابھی اردو دبستان قائم ہی نہیں ہوا تھا کی یہاں کے لوگوں نے اردو مثنویاں لکھنی شروع کردی تھیں''[1]۔ ۱۸۸۹ء میں جب اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا تو جموں و

کشمیر کے فارسی شعرا بھی اردو کی طرف راغب ہوئے۔ نئے لکھنے والوں اردو میں شعر کہنے شروع کئے۔ تاریخ گواہ ہے کے ۱۹۵۰ءتک اردو ادب میں جو موضوعات جگہ پاتے رہے ان میں عشق و محبت اور خوبصورتی کے علاوہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے کھوکھلے نعروں کو بھی جگہ ملتی رہی۔ لیکن جب ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کا سانحہ واقع ہوا اور سیاسی ہلچل کا آغاز ہوا تو اس کا اثر اردو شاعری پر بھی پڑا۔ ۱۹۳۱ء کے بعد رونما ہونے والے ہر واقع کو اردو شعراء نے شعری جامعہ پہنایا اور عام رعایا کو اُن پہلوؤں سے روشناس کروا کر اُن کے دلوں میں بغاوت کا بیج بو دیا جس کا اثر کچھ ہی عرصے دکھائی بھی دینے لگا۔ ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے بیچ کی شاعری کو اردو ادب میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ غیر ملکی حکمراں سے چھٹکارا اور حب الوطنی کے ترانے اس دور میں گائے جانے لگے۔ اسی بیچ جب ترقی پسند تحریک نے دنیا کے ہر زبان کے ادب کو متاثر کیا تو اردو زبان بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ پائی۔ ترقی پسند رجحانات کو اس زبان نے بھی اپنے اندر سمو لیا۔ شعراء و ادبا حضرات کا نظریہ بدلا اور ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کے تحت ادب تخلیق کیا جانے لگا۔ اس تحریک نے بھی اردو شاعری کو ریاست میں فروغ پانے کے بہت سے موقعے فراہم کئے۔

۱۹۳۱ءتک اردو شاعری میں زیادہ تر وہی شعراء نظر آتے ہیں جو اس دور سے پہلے دور میں اپنی گراں قدر تخلیقات سے اردو کے شعری سرمائے میں اضافہ کرنے میں مشغول تھے۔ ان میں گراں قدر تخلیقات سے اردو کے شعری سرمائے میں اضافہ کرنے میں مشغول تھے۔ ان شعرا نے اردو شاعری کو تقویت بخشی اور اردو کے شعری سرمائے کو مزید بڑھاوا دیا۔ غزل، نظم، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، مثنوی، قطعہ، نعت، منقبت وغیرہ غرض ہر صنف سخن کو اپنا کر اردو کے شعری سرمائے میں اضافہ کرنے میں مصروف رہے۔ اُس دور میں ایسے بہت سے شعراء منظر عام پر آئے جنھوں نے اردو شاعری کے فروغ کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس سلسلے میں اُس دور کا سب سے اہم پہلا نام محمد دین تاثیر کا آتا ہے۔ تاثیر ۱۹۳۱ء کے بعد کے ایسے پہلے شاعر تھے جنھوں نے اردو شاعری کو ایک نئی سمت دی۔

تاثیر کا شمار اس دور کے اہم ادباء وشعرا میں ہوتا ہے۔انھوں نے ریاست میں نئے لکھنے والوں کو ایک نئی سمت دی۔ عبدالقادر سروری اُن کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

''تاثیرادب وشعر کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔اس کے ساتھ اُن کا تحقیقی اور تنقیدی شعور بھی رچا ہوا تھا۔ادب کے مقصد اور مصرف کے بارے میں وہ ترقی پرور خیالات کے حامل تھے۔اپنے صحت بخش ذوق کی بدولت تاثیر نے پنجاب اور کشمیر دونوں مقامات کے نوجوانوں ادیبوں اور شاعروں کو نئی راہیں سمجھائیں۔ خود اُن کی شاعری کا آغاز اس میں شک نہیں کہ اپنے عہد کی عام روایت کے مطابق غزل گوئی سے ہوا۔''[۲]

تاثیر اردو شاعری کا اچھا خاصا ذوق رکھتے تھے۔شروع شروع میں انھوں نے قدیم روایت کے طرز پر غزلیں کہی۔نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

حضورِ یار ہیں آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
حنائے ناخن، پا ہو کہ حلقہ سر زلف
چھپائیں بھی تو یہ جادہ نکل ہی آتے ہیں

لیکن آہستہ آہستہ تاثیراور اُن کے رفقاء نے اردو غزل کو ایک نئی سمت سے روشناس کروایا۔تاثیر نے بہت کم غزلیں کہی ہیں اور قدیم روایتی انداز سے ہٹ کر جو غزلیں تاثیر نے کہی ہیں وہ رومانی نظموں کے قریب تر معلوم ہوتی ہیں۔اُن کی روایتی غزلوں میں رومانی نظموں نظموں کا رنگ غالب نظر آتا ہے اور غزل پڑھتے وقت نظم کا گماں ہوتا ہے۔تاثیر نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم گوئی بھی کی ہے۔اُن نظموں کی تعداد بھی غزلوں ہی کی طرح کم ہے لیکن

ان کی نظموں کو تاریخی موقوف ہونے کی وجہ سے ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ان کا اصلی سرمایہ اُن کی نظمیں ہیں۔بحروں کا انتخاب ،مصرعوں کو نئے انداز میں ترتیب دینا اور موضوع کے لحاظ سے چند نئے عناصر کو شاعری میں شامل کرنے کی وجہ سے تاثیر کو اردو شاعری میں خاص مقام حاصل ہے۔اُن کی نظم ’’ید بیضا‘‘ سے چند اشعار مثال کے طور پر ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

مجھے تلاش رہی
نہیں تلاش نہیں
تلاش میں تو طلب
جستجو بھی ہوتی ہے
دبی دبی سی سہی
آرزو بھی ہوتی ہے
نہ آرزو ، نہ طلب ، نہ جستجو ، نہ تلاش
ذرا سی ایک جماعت ، زرا سی ایک خراش
میانِ قلب ونظر اک مقام ہے اس کا
مقام ؟ مرحلہ ؟ جو کچھ بھی نام ہے اس کا
جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں
نگاہ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں
وہ طور جلوہ معنی
وہ کارِگاہ خیال

تصورات کی آلائشوں سے پاک خیال
تعینات سے بے باک وارداتِ جمال
جمال تابشِ رو، گرمی خرام نہیں
ہزار ایسی ادائیں ہیں جن کا نام نہیں
یہ جھلکیاں
یہ ادائیں
یہ تیر فشاں سائے
یہ جھلملا تے
آ بھر تے
د بے ہو ئے سا ئے ۳۴

تاثیر کے ہم عصروں میں امینؔ حزیں اور عبدالسمیع پال آثرؔ بھی اردو شاعری میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے تاثیر ہی کے زمانے میں اردو شاعری کو فروغ بخشا۔ ان میں امینؔ حزیں بڑے بھائی تھے۔ امینؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن ہی میں حاصل کی اس انداز سے کی کہ ان کا شعری ذوق دن بدن نکھرنے لگا اور رفتہ رفتہ انھوں نے اپنے اس ذوق کو ایک خاص رنگ عطا کیا، جس میں روحانیت، فلسفہ اور نئے شعری اسالیب ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ حزیںؔ نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی اور اُس دور کے ادبی جریدوں میں اُن کا کلام بھی چھپنے لگا۔ حزیںؔ کی نظم کے چند شعر پیش ہیں:

نگاہ شوق کا پڑتا تھا روئے سادہ پر
ادئیں آپ سے آپ آ گئیں سنگار ہوئے

کیا نہ ہمتِ عالی نے اعتراف شکست
ہم اپنی ہٹ سے زمانے میں کامگار ہوئے
تخلیاتِ امینؔ ہیں غلاف کعبہ دل
تمہاری خیر نہیں گریہ داغ دار ہوئے

ان کے علاوہ عبدالسمیع پالؔ جو اردو دنیا میں آثرؔ صہبائی کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے بعد آنے والے مقبول ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی ولادت ۱۹۰۱ء میں سیالکوٹ میں ہوئی تھی۔ معیاری تعلیم اپنے آبائی شہر سے حاصل کی۔ شعروسخن سے انھیں بچپن سے ہی دلچسپی تھی۔ لاہور کی ادبی محفلوں میں آئے دن شامل ہوتے تھے۔ ملازمت کے دوران اپنے جموں کے قیام کے دنوں میں آثرؔ صہبائی کیفیؔ کی صحبتوں سے بھی کافی حد تک متاثر ہوئے۔ جس نے اُن کے فن کو اور زیادہ جلا بخشی اور اُن کا فن اور زیادہ نکھر گیا۔ اس سلسلے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''جموں میں قیام کے زمانے میں آثرؔ کیفی کی صحبتوں میں شریک تھے۔ فنِ شعر میں وہ اپنے بھائی امینؔ اور تاجور نجیت آبادی کے شاگرد تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ آثرؔ پر کلاسیکی شاعروں میں میرؔ اور غالبؔ کا اثر تھا لیکن وہ جدید عہد کے شاعر تھے اور اپنے عہد کی تحریکوں سے بے گانہ نہیں رہ سکتے تھے۔''[۱۴]

آثرؔ صہبائی نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی۔ اُن کی شاعری سادگی اور سلاست کی بہترین مثال مانی جاتی ہے۔ اُنھوں نے ۱۹۳۱ء کے بعد کی شاعری کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ اُنھوں نے ہر طرح کے موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اُن کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''خمستان'' کے نام

سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ''جام ظہور'' کے نام سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئے۔ اُن کے علاوہ اُن کی رباعیات کا مجموعہ ''راحت کدہ'' کے نام سے بھی شائع ہوا۔ اُن کی رباعیوں میں فلسفیانہ انداز فکر کی بھرمار ملتی ہے۔ مثال کے طور اُن کی ایک رباعی ذیل میں نقل کی جا رہی ہے:

آزادِ طلسم رنگ و بو ہی نہ ہوا

نیرنگِ جہاں کا راز جو ہی نہ ہوا

دنیا سے عبث رہی شکایت تجھ کو

افسوس کہ اپنا دوست تو ہی نہ ہوا

آثر نے یوں تو ہر صنف کو اپنایا لیکن اپنے بھائی امین کی طرح اُنھوں نے زیادہ زور نظم پر دیا۔ ان کی نظمیں سادگی اور سلاست کی اچھی مثال مانی جاتی ہیں۔ آپ کی مشہور نظم ''پھول اور ستارہ'' سے یہ اشعار پیش ہیں:

میں لالہ وصحرا ہوں   تو عرش کا تارا ہے

چاہوں کہ پہنچ جاؤں

اُڑ کر تیری محفل میں

پھر میری تگ و دو کیا

کچھ دور ذرا اُڑ کر

پھر خاک پہ گر جاؤں

گرتے ہی فنا ہو جاؤں

میں لالہ وصحرا ہوں   تو عرش کا تارا ہے

اس کے علاوہ آثر نے قطعات بھی کہے ہیں۔ اُن کے قطعات میں ستھری رومانیت کی جھلک ملتی ہے۔ اُن

کے قطعات رومانی طرز کے ہیں۔اُن کے ایک قطعہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے:

تیرا حسن بہار آرا گلستان پہ چھایا ہے
تیرے جلووَں نے دامانِ بیاباں کو بسایا ہے
نہاں رہتی ہے جیسے برگِ گل میں بوئے جاں پرور
تیرا سوزِ محبت میری رگ رگ میں سمایا ہے

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ بھی اس دور کا ایک اہم نام ہے جو برہمن خاندان سے تھے اور انیس سال قبل دہلی منتقل ہوگئے تھے۔جموں وکشمیر میں کیفی کا قیام ملازمت کی وجہ سے رہا اور بہت سے نوجوان شعرا نے اُن کی صحبت سے فائدہ اُٹھایا۔کیفی ۱۹۲۰ء کے بعد شعرا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔کیفیؔ عشق و عاشقی کے پرستار تھے۔اُن کی شاعری میں بھی رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔اُنھوں نے ایک نظم ''روپ چالیسا یا حسنِ فطرت'' عنوان سے لکھی تھی،جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

بزمِ حسن کیا بے خودی کی دنیا ہے
ذرہ ذرہ شاعر ہے قطرہ صہبا ہے
غور سے اگر دیکھو کائنات کا عالم
حسن کا ہے اک طوفان جو ازل سے برپا ہے

اس کے علاوہ کیفیؔ نے دوسری نظمیں ''طلوعِ سحر''،''کیف بہار''،برسات کی بہاریں'' وغیرہ میں بھی فطرت کے حسن کی تفسیریں بیان کی گئیں ہیں۔کشمیر کی خوب صورتی کو بھیہ کیفیؔ نے اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔یہاں کے چشموں،سر بفلک پہاڑوں،جھیلوں اور ندیوں وغیرہ کا حسن کیفیؔ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے:

ہے مہللک کشمیر کی کہنا اسے جنت نظیر

سامنے آنکھوں کے یہ بس دل اصرار میں

اس خوبصورتی کی کیفی اہل دنیا پر اس طرح عیاں کرتے ہیں:

تم نہ پاوگے کہیں جو ہے یہاں جوش بہار

پھوٹتی کونپل ہے چوبِ دستہ نجار میں

ہے آب ایک گلشن اور ہے ایک زیر آب

ڈل بھی لاثانی ہے دنیا کے دیارِ امصار میں

مارتا ہے کیا سفیدہ آب در کو ٹھوکریں

روندے جاتے ہیں گوہر، اس بزم گوہر بار میں

ریاست میں شاعری کو جلوت بخشنے والوں میں مقامی شعراء کے بجائے غیر مقامی سخنوروں کا اہم رول رہا ہے۔ ''بہار گلشن کشمیر'' میں ۱۸۸۰ء سے پہلے دو ہندو شاعروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جن کے نام پنڈت شیو نارائن بھان عاجز اور دینا ناتھ چکن مست کشمیری ہیں۔ مست کشمیری کی نظم ''کسی کے گیسو'' ایک خوبصورت نظم ہے جو شاعر کی افتاد طبع اور زبان و بیان پر گرفت کا پتہ دیتی ہے۔

یہ شک ریز گیسو یہ عطر بیز گیسو

ابرِ بہار گیسو

کالے ہیں یہ بلا کے پھندے ہیں یہ قضا کے

مارِ خموش گیسو

مجنوں کی ان سے دہشت لیلیٰ کی ان میں رنگت

ہیں عشق زار گیسو۔ ۵

جن شعراء نے جموں وکشمیر کی ادبی فضاؤں کو فروغ دیا اور ان کی جڑوں کو اپنے خون جگر سے سینچا ان میں اول سہرا میر کمال الدین حسین اندرابی رسؔوا کے سر جاتا ہے۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروریؔ۔

''رسؔوا دہلی میں رہتے تھے جہاں ان کے فن کی قدر ہوئی اور شہزادا اکبر شاہ کی سرکار میں وہ ملازم رہے لیکن معظم نے اکبر شاہ کو شکست دی تو وہ کشمیر لوٹ آئے اور یہاں اپنے فن کی خدمت اور نوجوانوں کی اس فن میں تربیت کرتے ہوئے زندگی گزار دی چنانچہ اس فن سے ان کے بہت سے تلامذہ ہوئے۔ ایک شاگرد مچھی رام نے ان کے رقعات کو ان کے فارسی اور اردو کلام کے ساتھ ایک مجموعے کی صورت میں اکٹھا کر کے ''رقعات خاتم الکمال'' کے نام سے موسوم کیا ہے اس کے مخطوطے محکمہ تحقیقات سری نگر کے کتب خانے میں موجود ہیں''۔ ۶

رسؔوا اورنگزیب کے آخر عہد کے کشمیر کے انشا پردازوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ کم وبیش شمالی ہند کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں افضلؔ، فضلی اور جعفر زٹلی کے معاصر تھے۔ رسؔوا دہلی کے رہنے والے تھے، جہاں ان کے فن کی قدر ہوئی اور شہزادہ اکبر شاہ کی سرکار میں ملازم رہے۔ لیکن جب اکبر شاہ کو شکست دی تو رسؔوا کشمیر لوٹ آئے اور یہاں اپنے فن میں نوجوانوں کی خدمت اور تربیت کرتے ہوئے زندگی گزاری۔ ان کے بہت سے تلامذہ ہوئے۔ ایک شاگرد مچھی رام نے ان رقعات کو ان کے فارسی اور اردو کلام، ریختہ، نظموں اور غزلوں کی شکل میں ملتا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں:

دل وجان اس لٹک او پر فدا ہے
ستم گر بے وفا یہ کیا ادا ہے
بیک نظارہ دل دادیم از دست

وفا دشمن جفا ہو، بلا ہے

غزل خوانی کا یہ انداز ان کے بعض معاصرین دہلی، اورنگ آباد اور خاص کر بعد کے شعرا، یک رنگ، ناجی وغیرہ کے ہاں ملتا ہے۔نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

با غیر الفت تا کجا از یار وحشت تا بکی
سب سوں وفا ہم سوں جفا اے بے وفا کیا ڈھنگ ہے
کو باش اصدر عاشقاں مجھ سا بلا گرداں ہے
ہر چند از عشق چومن تجھ بے وفا کو ننگ ہے

رسوا کا یہ دور سترھویں اور آٹھارویں عیسوی صدی کا دور تھا۔ چنانچہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں ریاست میں علمی وادبی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا اور اُردو سرکاری زبان کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ ایک ادبی انجمن ''بزم سخن'' کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔اس انجمن کے بانیوں میں غلام حیدر چشتی، قاضی شمس الدین، مرزا مبارک بیگ اور عبدالحکیم شامل تھے۔اس انجمن نے پہلی مرتبہ جموں میں طرحی مشاعروں کی بنیاد رکھی اور اس کے بعد باقاعدہ مشاعرں کا اہتمام ہونے لگا۔ان مشاعروں میں ممتاز شعراء رچھپال سنگھ، خوشی محمد ناظر، کیفی دہلوی، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی، یاس یگانہ چنگیزی، حفیظ جالندھری، روش صدیقی، جگر مراد آبادی، اختر شیرانی، موہن لال ساحر، میر عابد علی عابد، عندلیب شادابی، سید عبدالحمید عدم، صوفی تبسم، احسان دانس اور فیض احمد فیض وغیرہ شرکت کرتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ ریاست میں سب سے پہلا مشاعرہ ۱۹۶۴ء میں رچھپال سنگھ شیدا کی صدارت میں ہوا اور نظامت کے فرائض کیفی دہلوی نے سرانجام دیئے۔اس انجمن کی دیکھا دیکھی میں ایک اور ادبی انجمن ''بزم مشاعرہ'' کے نام سے قائم ہوئی۔ریاست میں ایسی ادبی تنظیموں کے قیام اور ہندوستان کے نامور شعراء کی مشاعروں میں شرکت نے ریاست میں ایک خاص علمی وادبی ذوق کو جنم دیا۔اس دور کے شعراء میں عبدالغنی بیگ مقبولؔ، زینت

بی بی محجوب اپنے شعری مجموعہ ''گلبن نعت'' ۱۸۷۷ء کی وجہ سے اُنچا مقام رکھتی ہیں۔ پیرزادہ محمد حسین عارفؔ، منشی امیرالدین امیرؔ، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ، قیس شیروانیؔ، ہرگوپال خستہؔ، سالگ رام سالک، مرزا سعدالدین سعد، نندلعل کول طالبؔ، محمدالدین فوقؔ، طالب کاشمیری، کشپ بندھو، رسا جاویدانی، عبدالاحد آزاد، پریم ناتھ بزاز، ملک راج صراف، پریم ناتھ پردیسی، میر غلام رسول نازکی، شہ زور کاشمیری، قیصر قلندر، حبیب کیفوی، کشمیری لال ذاکر، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، عابد مناوری، حکیم منظور اور مظفر ایرج وغیرہ نے اس ادبی گلشن کی آبیاری میں کوئی دقیقہ فراگذاشت نہیں کیا۔

عبدالغنی بیگ مقبول کشمیر کے اساتذہ فارسی میں شمار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جو دور عبدالغنی بیگ مقبولؔ کا تھا وہ اردو ادب میں ایہام گوئی کا دور تھا اور اس ادبی فضا کا اثر مقبولؔ پر بھی پڑا۔ دوسری بات یہ کہ جس طرح شمالی ہند میں شعراء نے ابتدا میں اپنی شاعری کے لئے فارسی زبان کو ہی ترجیح دی اور کبھی کبھی اپنے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایک ادھ شعر اردو زبان میں بھی کہتے تھے۔ اس طرح مقبولؔ نے بھی زیادہ شاعری فارسی زبان میں کی بلکہ مقبولؔ فارسی شاعری کے استاد تسلیم کئے جاسکتے ہیں۔ اردو زبان میں ان کا ایک شعر ذیل میں درج ہے:

دل یوں خیالِ زلف سے پھرتا ہے نعرہ زن

تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے

ان کے علاوہ بھی اُس دور کے ایسے بہت سے فارسی شعرا تھے جنھوں نے اردو میں طبع آزمائی کی اور اس ابتدائی دور میں اس کی آبیاری کرتے رہے لیکن یہ شعرا کوئی خاص کارنامہ انجام نہ دے پائے مگر پھر بھی ابتدائی دور کے شعرا ہونے کی حیثیت سے انھیں مقبولیت حاصل ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور کے سب سے اہم شاعر ہرگوپال کول خستہؔ گزرے ہیں۔ اُنھوں نے مہاراجہ کے دربار سے منسلک رہ کر اردو شاعری میں طبع آزمائی کی۔ غلام نبی خیالؔ اُن کے متعلق اپنے ایک مضمون لکھتے ہیں کہ:

''اگرچہ اردو سرکاری زبان کا درجہ نہ پاسکی مگر قبولیت حاصل کرنے میں آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ اُس زمانے میں پہلا اردو پریس قائم ہوا اور اُسی زمانے کے ادیبوں میں ہر گوپال کول خستہؔ کا نام بھی سرِ فہرست ہے۔ یہ شبلیؔ اور حالیؔ کے ہم عصر تھے اور لاہور میں قیام پذیر تھے اور کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ رہے اور کئی بڑے ماہرین تعلیم سے بھی ملتے تھے اور نئے جذبات و خیالات سے آگاہی پاتے تھے۔ اردو کا مزاج رکھنے والے خستہؔ اعلیٰ پائے کے شاعر اور نثر نگار تھے۔ وہ ۱۸۷۶ء میں کشمیر آئے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔۔۔۔ اُنھوں نے اردو میں بہت کچھ لکھا اور اس طرح اردو شاعری کے لئے ایک ذرخیز میدان تیار ہوگیا۔''[۷]

ریاست میں باقاعدہ طور پر اردو شاعری کا آغاز خستہؔ سے ہوتا ہے۔ خستہؔ نے باقاعدہ طور پر ریاست میں اردو شاعری کی بنیاد رکھی۔ خستہؔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں خستہؔ لاہور سے کشمیر آئے اور مہاراجہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ اُنھوں نے اردو میں بہت کچھ لکھا اور اس طرح اردو شاعری کے لئے ایک ذرخیز میدان تیار ہوگیا۔ خستہؔ نے بہت سی مثنویاں اور نظمیں اردو زبان میں کہی، اس کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ خستہؔ کی ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں:

کیا بھروسہ ہے دم کا اے آدم
دم تو ہر دم گیا ہوا دیکھا
صحبت پیر زال دُنیا میں
آشناؤں کو ڈوبتا دیکھا
خوب ڈھونڈا جہاں میں اے خستہؔ

خستگی کو نا آ شنا د یکھا

اس کے علاوہ اس کی مثنوی کے چند اشعار مثال کے طور پر دیکھئے جن میں آپ نے اپنے قلعہ باہو میں قید کئے جانے کا احوال لکھا ہے:

سپاہی ہوئے پھر ہمراہ مرے
کچھ ادھر اودھر، کچھ درے کچھ پرے
کوئی ہاتھ میں لے کے تیغ دو دم
کوئی کر کے سنگین بندوق خم
چلا تھا نہ راہی جو فرسنگ بھی
تو چلنے میں گھبرا اُٹھا اس کا جی

خستہ کی اس سعی میں ان کے بھائی سالگ رام سالک بھی پیش پیش تھے۔ سالک خستہ سے دو برس چھوٹے تھے۔ وہ اچھے شاعر، نثر نویس اور قانونی کتابوں کے مصنف مانے جاتے تھے۔ اُن کے یہاں بعض اچھے شعری نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شاعری کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں:

کسی نے کیا تیرے کانوں میں اے جانِ جہاں پھونکا
کہ مجھ کو دیکھ کر گلشن میں تو نے گلستان پھونکا

☆

دھرتا ہے دیا قبر پر میری کہ جلوں میں
اللہ رے کینہ میرے مکار صنم کا

☆

بے وجہ نہیں کارِ زباں آنکھ سے لیتے

خالی کوئی علت سے اشارہ نہیں ہوتا

☆

کعبہ دل میں میرے گھر بتوں کا سالکؔ

بت ہے کعبہ میں میرے، کعبہ ہے بت خانے میں

غزلیات کے علاوہ سالکؔ نے مثنویاں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ اُن کی مثنوی ''سندر بن'' کا شمار کشمیر کی کلاسیکی مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ''سسی پُنوں'' ان کی ایک اور اہم مثنوی ہے۔ اس طرح ان دونوں بھائیوں نے مل کر کشمیر میں اردو شاعری کی بنیاد رکھی جس پر بعد کے آنے شعرا نے اینٹ پر اینٹ رکھ کر اردو شاعری کا ایک حسین و دل فریب محل تعمیر کیا جو آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہوا کھڑا ہے۔ عبدالقادر سرورؔی نے ان دونوں بھائیوں کو ''کشمیر کے دو ادیب بھائی'' کے نام سے بھی یاد کیا ہے اور ایک معیاری کتاب لکھی ہے۔

برصغیر میں جب ترقی پسند تحریک ۱۹۳۵ء اور حلقہ ارباب ذوق کی سرگرمیون کے مقبولیت حاصل کی تو اُن کی اثرات بھی اس خطے پر مرتب ہوئے اور یہاں کے ادباء وشعرا نے اس سے بامعنی استفادہ کرتے ہوئے ادب تخلیق کیا۔ اس طرح یہ ادبی سرگرمیاں بھی ریاست میں شاعری کے لئے پرمعنی ثابت ہوئیں اور شاعری میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ اس سلسلے میں جن لوگوں کی خدمت کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے اُن میں نسیمؔ، شوقؔ، غافلؔ، مہجورؔ، طالبؔ، رسا جاودانیؔ، جعفر ابن رسا، میکش کاشمیری، نشاط کشتواڑی، عشرت کاشمیری، دینا ناتھ رفیقؔ، کشمیری لعل ذاکر، ویدراہی، نرسنگھ داس نرگسؔ، چراغ حسن حسرت، نشاطؔ وغیرہ اہم ہیں۔ جنھوں نے اس تحریک کے زیر اثر ریاست میں شاعری کو وسعت دی۔ شاعری کی چند مثالیں دیکھئے:

میری شاعری، میری ساحری، ہے خیالِ اُلفت سے بھری
نہیں یہ رجز کی نسوں گری مگر آتشی کا پیام ہے

(رسا جاودانی)

☆

دل اپنا جب دل ہی نہیں ہے دل ہے اک بت خانہ بھی
غمِ دوراں بھی اس کو حاصل، ساتھ غمِ جانانہ بھی

(رسا جاودانیؔ)

☆

دل اپنا جب ہی نہیں ہے دل ہے اک بت خانہ بھی
غمِ دوراں بھی اس کو حاصل، ساتھ غمِ جاناں نہ بھی

(چودھری دینا ناتھ رفیقؔ)

☆

کیا وہ نہ آئیں بیٹھو بھی ہے جذبِ دل وہ چیز
محمل سے لیلیٰ ناقہ سے محمل اُتار دیں

(نند لعل کول طالبؔ)

☆

اُن کے رخ پہ نقاب کیا کہیے
ابر میں ماہتاب کیا کہیے

(عشرت کاشمیری)

ان شعرا کے کلام میں ادبی تحریکوں کے ساتھ ساتھ اُس عہد کی عوام کے غم واندوہ اور مشکلات کی بھی واضح عکاسی ملتی ہے۔ اُن کی شعری تخلیقات کا مرکزی خیال نا انصافی، رشوت اور سماجی نابرابری جیسی بُری عادتوں کے خلاف ایک کھلا جہاد دکھائی دیتا تھا۔ اس سلسلے میں طالبؔ نے ایک نظم ''رشوت خوروں سے خطاب'' کے عنوان سے لکھی۔ اُس نظم میں طالبؔ رشوت خوروں سے یوں یوں ہم کلام ہوتے ہیں:

آہ! اے رسوائے عالم، آہ! اے رشوت ستاں
کتنی عبرت خیز ہے بدبخت تیزی داستاں
ہے تیرا طرزِ عمل صدق وصفا سے بے نیاز
ہے فقط اہل غرض راشی سے سار باز

فاروق نازکیؔ کی ایک نظم ''کفِ خاکستر'' کا پہلا شعر دیکھئے:

آج اور کل مسافت مٹانے والو
کیا کبھی یوں زمانے کی گرہ کھلتی ہے

اس عہد میں ریاست کے شعرا شعری فکر کی نمایاں تبدیلیوں سے بھی متاثر ہوئے۔ شعری تبدیلی کے اس عصری تاثر کے نتیجے میں اس خطے کے بعض شعرا نظم گوئی کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور نظم گوئی کو ریاست میں فروغ بخشا۔ کئی شعرا نے آزاد نظم، نظم معریٰ اور نثری نظموں میں طبع آزمائی کی۔ اُس دور کے چند اہم نظم شعرا میں نرسنگھ داس نرگسؔ، امر چند ولی، قمر قمرازی، نندلعل کول طالبؔ، میر کمال الدین، خلیل انور وغیرہ اہم ہیں۔ اس دور میں ریاست میں بہت بہت سے خوش فکر شعرا منظر عام پر آئے جنھوں نے شاعری کو خاص طور پر فروغ بخشا۔ ان میں اندر جیت شرما، غلام جیلانی اختر، میر غلام رسول آزادؔ، حکیم دوار کا ناتھؔ، دینا ناتھ رفیقؔ، خموش سرحدی، عشرت

کشتواڑی ، شہہ زور کاشمیری ، غ ، م ، طاؤس ، شیخ غلام علی بُلبُل ، گردھاری لعل آنند تمنّا، تنہا انصاری ، غلام رسول کامگار، غلام احمد فاضل کاشمیری، عبدالحق برقؔ ،سید اکبر ہاشمؔی ،سیف الدین سیفؔی محمد امین کاملؔ ، اندر جیت لطفؔ ، شوریدہ کاشمیری،میکشؔ کاشمیری وغیرہ اہم ہیں۔

پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ اگست ۱۸۸۷ء میں پلوامہ میں پیدا ہوئے۔آپ کا تعلق رشد و ہدایت کے ایک خاندان سے تھا اور اُن کے اسلاف میں کئی عالم و فاضل بھی تھے۔مہجورؔ کے والد پیرزادہ عبداللہ شاہ فارسی وعربی کے بہت بڑے عالم تھے۔مہجورؔ نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی پھر حضرت علی گنائی عاشق کے مکتب میں شریک ہوئے۔ عاشق چونکہ فارسی کے اچھے شاعر تھے اس لئے مہجور بھی فارسی شاعری کی طرف راغب ہوئے۔۱۹۰۵ء میں مہجورؔ نے پنجاب کا سفر کیا اور امرتسر اور قادیان میں کچھ عرصہ گزارا جہاں اُن کا تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا اور مولانا بسملؔ کی صحبتوں سے فیضاب ہوتے رہے۔اس طرح اُن کا شعری ذوق پروان چڑھتا رہا اور اعلیٰ پائے کی شاعری کرتے رہے۔

مہجور فارسی اور عربی کا اچھا خاصا ذوق رکھتے تھے۔اس کے علاوہ مقامی بولی کشمیری پر بھی دسترس حاصل تھی۔ فارسی وکشمیری کے اچھے شاعر مانے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ فارسی کے شاعر مانے جاتے ہیں لیکن انھیں شہرت و دوام کشمیری شاعری سے حاصل ہوئی۔لیکن یہ بات کشمیری شاعری کے مورخین نے بھی لکھی ہے کہ فارسی سے کشمیری تک کے سفر کے دوران مہجورؔ نے اردو شاعری میں طبع آزمائی کی۔اس سلسلے میں عبدالاحد آزاد نے اپنے شہرآفاق تصنیف ’’کشمیری زبان اور شاعری‘‘ میں لکھا ہے کہ:

> ’’۱۹۱۲ء میں مہجور کو محسوس ہوا کہ اب فارسی کا مذاق ملک میں روز بروز ختم ہوتا جا رہا ہے اور اُس کی جگہ اردو لے رہی ہے تو آپ نے بھی اردو میں شعر کہنے شروع کیے۔ جس کی ابتدایوں ہوتی ہے کہ ۱۹۱۲ء کے آغاز میں لداخ کی ملازمت کے بعد مہجور

موسم سرما میں پنجاب گئے۔ وہاں امرتسر سے لدھیانہ جانا پڑا۔ ان دنوں لدھیانہ میں ایک انجمن ''بزم ادب'' کے نام سے حضرت لدھیانوی کی سر پرستی میں قائم ہوئی تھی۔ جس کے تحت پندرہ روز مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ مہجورؔ کو بھی شمولیت کی دعوت ملی۔ آپ نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ میں فارسی کا شاعر ہوں، لیکن آفت صاحب کے اسرار سے ایک غزل کہنا پڑی مصرح طرح یہ تھا:

ع: طائر دل کو پھنسانے کو یہ دام اچھا ہے۔

مہجور نے مشاعرے میں نو اشعار کی اردو غزل سنائی حاضرین نہایت محظوظ ہوئے۔ خصوصاً اس شعر کی آفت صاحب نے بہت داد دی۔

ے اجڑے غاروں میں رہا کرتے ہیں رہزن چھپ کر

دل مضطر ہی میں دل بر کا قیام اچھا ہے

اس واقعے کے بعد مہجور صاحب کی جھجک دور ہوئی اور آپ نے بارہ سال یعنی ۱۹۲۴ء تک اردو زبان کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا''۔[۸]

مہجورؔ اردو میں قدیم انداز میں غزل کہتے تھے۔ کچھ نظمیں اور ایک ادھ قصیدہ بھی اُن کی یادگار ہے۔ اُن کی شعری دلچسپیاں بیس پچیس برس تک جاری رہیں۔ اُن کی غزلوں کے کچھ اشعار مثال کے طور پر ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

باغِ شالامار کا سودا مرے سر میں نہیں

جس چمن میں ہے میرا گل وہ گلستان اور ہے

☆

دل درد آشنا میرا کسی سے ہم زباں کیوں ہو
عیاں انجام ہو جس کا وہ میری داستاں کیوں ہو
بدل دی رُخ کی زردی غازۂ مغرب کی سرخی نے
قدیمی وضع کا پابند اب ہندوستاں کیوں ہو
رہ کوئے صنم گوشہ نشیں زاہد بتائے کیا
جو منزل سے ہو ناواقف وہ میرا کارواں کیوں ہو

مہجور کا فطری رجحان قومی اور اخلاقی شاعری کی طرف تھا۔ چنانچہ ان موضوعات پر اُنھوں نے جو شاعری کی ہے۔ اس میں جذبات کا خلوص اور روانی قابل توجہ ہے۔ ان کی ایک نظم ''خطاب بہ مسلم'' کے عنوان سے ''اخبار کشمیر'' میں شائع ہوئی تھی۔ نظم کے چند اشعار پیش ہیں:

بتا مسلم کشمیر کبھی سوچا بھی ہے تو نے
تو ہے کسی گلشن رنگین کا برگِ شاخ عریانی
ترے اسلاف تھے وہ جن کے علم و فضل کے آگے
ادب سے جھکتے تھے دانشوران ہند وایرانی
شہنشاہِ معظم زین العابدین بڈشاہ
کیا اکبر نے جس سے کسبِ آئین جہاں بانی
بخوبی یاد ہے اب تک سخن سنجان عالم کو
غنی کی نکتہ سنجی ، شیخ صرفی کی سخن دانی
غرض بے مثل تھے الاف تیرے حسن وخوبی میں

مگر اب قابلِ ماتم ہے تیری خانہ ویرانی

عید کے موقع پر مہجور نے ایک نظم کہی تھی اُس کے چند اشعار دیکھئے:

بام گردوں پر نظر آتے ہیں آثارِ ہلال!
عید کا پیغام لاتا ہے سدا کارِ ہلال
ہے دلیل کامیابی جید وسعی روز وشب
ہم کو یہ زریں سبق دیتی ہے رفتارِ ہلال

دینا ناتھ رفیق بھی اس دور کا ایک اہم نام ہے جنھوں نے ۱۹۱۳ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے بیچ کی شاعری کو فروغ دیا۔ ریاست کہ کہنہ مشق شعرا و ادبا میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ دینا ناتھ رفیق کے متعلق عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''رفیق کو اوائل عمر سے ہی شعر وسخن سے دلچسپی رہی۔ اُس وقت پونچھ کے شعرا میں اُنھیں اُستادی کا مرتبہ حاصل ہو چکا تھا۔ اردو کے علاوہ پنجابی، کشمیری، ہندی حتیٰ کہ انگریزی میں بھی آسانی سے شعر کہہ لیتے تھے۔ ۱۹۴۷ء تک ان کے کلام کی مکمل بیاض تیار ہو چکی تھی، جو فسادات کے دوران ضائع ہوگئی۔ جو کلام بچ رہا یا فسادات کے بعد سرانجام پایا۔ اس کو مجموعے کی صورت میں ''سنبل وریحان'' کا نام سے مرتب کیا ہے اس میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ غزل میں اُن کا انداز منجھا ہوا ہے شعر کی تکنیک پر اُنھیں اتنی دست رس ہے کہ وہ طویل بحروں۔ مختصر بحروں، طویل ردیفوں غرض ہر نوکی تکنیک کے ساتھ آسانی اور روانی کے ساتھ کہہ سکتے تھے'' [9]

رفیق نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ قومی، مذہبی، ملی، معاشرتی وغیرہ موضوعات اُن کی شاعری میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں ایک اخلاقی رجحان مضمر ہوتا ہے، جو کبھی کبھی سطح پر اُبھر آتا ہے۔

ہمت ہار کے بیٹھ نہ جاؤ اُٹھو اور پتوار سنبھالو

آئی ہے گرداب میں کشتی بچنے کی کوئی راہ نکالو

اپنے عہد کے حالات کا ردعمل بھی اُن کی شاعری میں نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔اس کے علاوہ مشاہیر عہد پر بھی اُنھوں نے چند نظمیں کہی ہیں۔اُن میں سری کرشن، گوتم بدھ، گرو گوبند سنگھ، پنڈت جواہر لال نہرو، سردور ولبھ بھائی پٹیل اور لال بہادر شاستری جیسی عظیم شخصیات پر اچھی نظمیں کہی ہیں۔''بھگوان رام'' رفیق کی طویل نظموں میں سے ایک ہے۔اس طرح رفیق نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھا کر اردو کے شعری سرمائے میں اضافہ کیا اور اُس دور کی اردو شاعری کو فروغ بخشا۔

اس عہد کے اکثر شعراء نے غلامی اور محکومی جیسے موضوعات پر کھل کر لکھا۔نظم ونثر دونوں اصناف پر یہی موضوعات چھائے رہے۔اس دور کے زیادہ تر شعرا میں انھیں موضوعات کی بھرمار ملتی ہے۔ پنڈت نند لال کو طالبؔ بھی اس دور کے اہم شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔جو اس عہد میں اردو شاعری پر رحمت بن کر چھائے۔طالبؔ نے اردو شاعری کو کافی حد تک فروغ دیا۔اور شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔اُن کے کلام کے دو مجموعے بھی منظر عام پر آئے۔عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''پنڈت نند لال کول طالبؔ کشمیر کے اردو شعرا میں اساتذہ کا مقام رکھتے ہیں اور ہم سے قریب تر عہد میں وہ شعر وادب کی فضا پر چھائے رہے، اور بہت سے نو عمر سخن سنجوں کو راہ دکھائی۔تعلیم کے زمانے میں منشی امیر الدین نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پا کر اُن کی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ کوئی گیارہ برس کی عمر سے وہ شعر کہنے لگے تھے۔بعد میں جب پنڈت کیفی کشمیر سے منسلک ہوئے تو طالبؔ نے بھی اُن سے رجوع کیا۔اور اس فن کے رموز سے آشنائی حاصل کی۔''[10]

طالبؔ کا خاص میدان نظم ہی رہا۔نظم سے اُن کو دلی لگاؤ تھا اور اُن کے مجموعے کلام میں شامل نظمیں اُن کے دور کے فکر کی اچھی نمائندگی کرتی ہیں۔اس کے علاوہ کشمیر کی خوب صورتی و دل کشی بھی اُنھیں متاثر کرتی رہی اور کشمیر کے حسن کو وہ نظم میں پروتے رہے۔نظم کے چند اشعار مثال کے طور پر پیش ہیں:

شکست آرزو تھی لطف بہار دیکھوں

کاشانہ چمن کے نقش و نگار دیکھوں

باغ نشاط میں ہو دل کو نشاط حاصل

تازہ نسیم ڈل ہو اور شالا مار دیکھوں

طالبؔ نے مذہبی اور قومی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں۔اُن کی مذہبی شاعری کو ریاست میں کافی اہمیت حاصل ہے:

کس قدر روشن ہے اپنی آج شامِ زندگی

لائی ہے شیوراتری تازہ پیام زندگی

رسا جاودانی بھی اس دور کا ایک اہم نام ہے جنھوں نے خون دل سے ریاست میں اردو شاعری کی آبیاری کی۔رساؔ کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔اس لئے کم عمری میں ہی شاعری کی آبیاری کی۔رساؔ کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔اس لئے کم عمری میں ہی مشاعروں اور ادبی محفلوں میں حصہ لیتے تھے۔رساؔ مشاعروں میں سامعین کو اپنا کلام سنا کر محظوظ بھی کرتے تھے۔اُس دور کے مجلّات اور دیگر روزناموں میں اُن کا کلام آئے دن چھپتا رہتا تھا۔

غزل سے رساؔ کو گہرا شغف تھا۔اس لئے زیادہ زور غزل پر ہی دیا۔اُنھوں نے غزل گوئی میں چھوٹی بحروں کا استعمال کیا۔رساؔ کا کلام نہایت ہی سادہ اور آسان زبان میں ہوتا ہے۔اُن کی شاعری میں غور وفکر کی پرچھائیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔رومانی عنصر بھی اُن کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے مگر اُس رومانیت میں بھی غور وفکر کے عناصر شامل نظر آتے ہیں۔رساؔ نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں بہت ہی فکر آمیز شاعری کی ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار:

بے یقینی ہے سستی ایماں
ضعف اوہام کا سہارا ہے
تیری فرقت میں تجھ سے ملنے تک
تیری پیغام کا سہارا ہے

☆

ہر چند ہے غزل دل درد آشنا کی بات
اس پہ چل پڑی ہے شکم اور غذا کی بات
مہمل ہے اس زمانے میں صدق وصفا کی بات
البتہ سمجھی جاتی ہے مکر وریا کی بات
ہوا تنہا پہ عشق تو چھائی ہے بے خودی
ذکر فراقِ وصل تو ہے ابتدا کی بات

رسؔا کا خاص میدان غزل ہی رہا لیکن اُن کی زیادہ تر غزلوں میں نظم کا سا انداز پایا جاتا ہے۔اس سلسلے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''اُن کی بعض غزلوں میں نظموں کا تسلسل پایا جاتا ہے لیکن اُنھوں نے کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اُن میں '' بیتے دنوں کی یاد'' اور '' ساون'' پاکیزہ نمونے ہیں۔ '' ساون'' کے دو بند ذیل میں درج ہیں۔ جس میں اپنے عہد کی نظم نگاری کی جھلک موجود ہے۔''[۱۱]

رسؔا کا پہلا مجموعہ کلام ''لالہ صحرا'' کے نام سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا جس میں اُن کا ۱۹۴۶ء سے پہلے کا کہا

ہوا تمام تر کلام موجود ہے۔ رسؔا کے اس کارنامے نے ۱۹۳۱ء کے بعد کی شاعری کو کافی حد تک فروغ بخشا۔ ''لالہ صحرا'' کے علاوہ بھی رسؔا کے چند اور مجموعات منظر عام پر آئے جو ۱۹۴۷ء کے بعد کی شاعری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جن میں ''نظم ثریا'' اہم ہے۔

رسؔا کا ابتدائی کلام بے معنی تھا لیکن بعد میں با قاعدہ ریاضت سے اُن کی شاعری میں لغویت، معنویت اور پختگی آ گئی۔ اُن کی شاعری میں حقیقت اور رومان کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ غلام رسول میرؔ کے بعد کشمیر کے سب سے بڑے رومانی غزل گو شاعر رسؔا مانے جاتے ہیں۔ رسؔا نے معلم کا پیشہ اختیار کیا اور سبکدوش ہونے تک روحِ انسانی کی تعمیر کرتے رہے۔ اردو اور فارسی پر دسترس رکھنے والے رسؔا صاحب نے اردو شاعری میں اپنا لوہا منوایا اور ساتھ ہی ساتھ کشمیری شاعری میں بھی اہم نام کمایا ہے۔ رسؔا کا کلام اپنی ترنم ریزی، لطافت اور روانی کے لحاظ سے کافی جاذب توجہ ہے، اس میں رندی اور رنگینی کا عنصر بھی شامل ہے اور یہی بات اُن کو رسول میر سے مشابہ کرتی ہے۔ رسؔا نے بہت سے مشاعروں میں شرکت کی۔ آل انڈیا مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ مشاعروں کے بارے میں رسؔا ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''جی ہاں! میں دہلی، لاہور، امرتسر وغیرہ گیا ہوں میں نے اردو کے اُس پہلے مشاعرے میں حصہ لیا ہے جو جموں میں ہوا اور جس میں برج موہن دتا تریہ کیفی، روش صدیقی وغیرہ شامل تھے۔ اُس کے بعد جو بھی مشاعرے ہوئے میں اُن میں شرکت کرتا رہا اور اردو کے تقریباً سبھی شعراء سے ملاقات کا موقع نکلتا رہا۔''[۱۲]

رسؔا کا کلام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کشمیری کے علاوہ آپ کو اردو میں شعر کہنے میں مہارت حاصل تھی۔ مثال کے طور پر چند اشعار:

تو نقاب اُلٹ دے تو ہو سحر، تیری زلف بکھرے تو نیم شب

یہی اپنے لیل و نہار ہیں یہی صبح ہے یہی شام ہے

☆

جہاں تیرا نقش قدم ملا، وہیں سر بسجدہ پڑے رہے

یہاں عاشقوں کی نماز میں نہ رکوع ہے نہ قیام

☆

وہ رشک قمر آج سرِ شام نہ آیا

شب بھر کسی پہلو مجھے آرام نہ آیا

☆

تڑپا جو کیے ہم تو بڑھا اُن کا تغافل

اے جذبِ دروں تو بھی کسی کام نہ آیا

ہم بن کے تماشا تو گئے اُس کی گلی میں

وہ بہر تماشا بھی لبِ بام نہ آیا

☆

جو اچاٹ ہو طبعیت تو چمن بھی اک زنداں

لگے صید کا اگر دل ہے قفس بھی آشیاں

☆

کبھی اے رسؔا کرم سے میرے گھر وہ اگر آئیں

کرے ناز بخت پر پھر یہ میرا غرب خانہ

رسؔا کا کشمیری مجموعہ ''نیرنگ خیال'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ آپ کلچرل اکادمی کی مرکزی کمیٹی اور جنرل کونسل کے ممبر بھی رہے ہیں۔ کلچرل اکادمی نے انھیں خلعت فاخرہ سے بھی نوازا۔ ریاستی رسائل و جرائد میں اُن کا کلام سر فہرست رہا ہے۔ رسؔا نے مترنم، رواں اور شگفتہ زمینوں میں شعر کہہ کر ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔ وہ نفاست پسند بھی تھے اور صاحبِ ذوق بھی، اور یہ چیزیں اُن کی شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔

۱۹۳۷ء میں بھدرواہ میں ایک طوفان آیا جس سے متاثر ہوکر رسؔا جاویدانی نے ''لالہ صحرا'' کے نام سے نظم لکھی۔ جس کے دو اشعار پیش ہیں:

بدشت و در نظر ہا خواستم من

بصحرائے چمن آراستم من

رسید آخر بمن صاحبِ گفتار ہے

چہ غم از لالہ صحرا استم من

آپ کی ایک نظم ''صحرائی پھول'' ذیل میں درج ہے

لے لو یہ صحرائی پھول

لے لو یہ صحرائی پھول

توڑ کے ان کو لائی بن سے　　　دور ہیں یہ مہجور وطن سے

ان پہ پڑی غربت کی دھول

لے لو یہ صحرائی کے پھول

سرسید کے مشہور مضمون ''عمر رفتہ'' سے متاثر ہوکر ''صبح زندگی'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ جس کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں:.

ایک بچے نے خواب کیا دیکھا
کہ وہ بچے سے ہو گیا بوڑھا
زندگانی کے سب مراحل سے
ایک حصے سے رات میں گزرا

☆

لو وہ اتنے میں خواب سے چونکا
اب اُسے کتنی شادمانی
شامِ پیری جسے سمجھتا تھا
وہ ابھی صبحِ زندگانی ہے

رسا کا دوسرا مجموعہ کلام ''نظمِ ثریا'' ۱۹۶۲ء میں چھپا۔ جس کے اشعار بے ساختہ اور جاندار ہیں۔ تغزل آپ کے کلام کی جان ہے۔ مثلاً:

بس تیرے نام کا سہارا ہے
یہ بڑے کام کا سہارا ہے
جو سہارا ہے ماسوا الٰہی
وہ فقط نام کا سہارا ہے
بے یقینی ہے سستی ایمان
ضعف اد بام کا سہارا
تیرے فرقت میں تجھ سے ملنے تک

تیرے پیغام کا سہارا ہے

میکشوں کو فلک کی گردش میں

گردش جام کا سہارا ہے

زُلف میکش سے رُخ کی زینت ہے

کفر اسلام کا سہارا ہے

قید گیسو میں دل رہا خورسند

صید کو دام کا سہارا ہے

ہوں خطا کار میں رسؔا لیکن

بخشش عام کا سہارا ہے

☆

کسی کا نام کیوں ہو جائے بدنام

چلو ہم کو قضا نے مار ڈالا

☆

کسی کا نام کیوں ہو جائے بدنام

چلو ہم کو قضا نے مار ڈالا

☆

کہنے کو رسؔا سب کہتے ہیں اُن تک تو رسائی ہو نہ سکی

کیا نام سکندر رکھنے سے جب بخت سکندر ہو نہ سکی

☆

نہ قدر پہنچائی دوستوں نے رؔسا کی کچھ اُس کی زندگانی میں

بنائیں گے خاک کا وہ سرمہ مگر وہ خاک مزار ہوگا

☆

رؔسا کے کلام میں ہجر ووصال کی کسک ملتی ہے۔جس میں پرصاحب دل اپنی دل کی دھڑکن محسوس کرتا ہے۔

بے وفا کے عہد کا اعتبار کیا کروں

اعتماد ہی نہیں انتظار کیا کروں

☆

کیا کروں اُن سے رؔسا میں بھول جانے کا گلہ

درحقیقت میں ہی اُن کی یاد کے قابل نہ تھا

☆

مجھے تیری تصویر کی جستجو ہے

کوئی جینے کا آسرا چاہتا ہوں

☆

تجھ سے ملنے کی جو دعائیں کیں

ایک بھی اُن میں مستجاب نہیں

چراغ حسن حسرت کا تعلق ضلع پونچھ سے تھا جو قدیم دور میں علم وادب کا گہوارہ مانا تھا اور آج کے دور میں بھی

بہت شعرا وادبا کا تعلق اس زمین سے ہے۔حسرتؔ ایک اچھے قلم کی پیدائش ضلع پونچھ کے قریب ایک گاؤں میں ۱۹۰۴ء میں ہوئی۔آپ کے نانا اور دادا دونوں فارسی اور عربی کے عالم مانے جاتے تھے۔ چراغ حسن حسرتؔ کے نانا شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔محمد دین فوق لکھے ہیں:

’’آپ کا ذوقِ شعروشاعری درحقیقت اُنہی کے فیضان کا نتیجہ ہے‘‘۔۱۳؎

چراغ حسن حسرتؔ کا اصل میدان صحافت تھا۔اس لگن کے باعث آپ نے ۱۹۲۵ء میں کلکتہ کا سفر کیا اور صحافت پیشے سے منسلک ہوگئے۔۱۹۵۱ء تک یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر اس خدمت کر ترک کر کے کراچی چلے گئے اور ریڈیو پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی۔۱۹۵۵ء میں اُن کی طبعیت اچانک بگڑ گئی اور جون ۱۹۵۵ء کو لاہور میں اُنھوں نے اس جہاںِ فانی سے کوچ فرمایا۔

چراغ حسن حسرتؔ کو بچپن سے ہی ادبی ماحول ملا جس نے آپ کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔آپ جس قدر اچھے، کامیات اور غیر جانبدار صحافی تھے اسی قدر ایک اچھے نثر نگار اور شاعر بھی تھے۔شعری اصناف میں سے غزل اور نظم ان کی محبوب اصناف تھیں۔قومی اور وطنی شاعری کے ساتھ ساتھ سیاسی مسائل وغیرہ آپ کے خاص موضوع رہے۔اس کے علاوہ رباعی کہنے میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔مثال کے طور پر:

اُمید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ ہی کیا ہوتا
غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

حسرتؔ کا اندازِ بیاں میر سے مماثل تھا۔اُن کی شاعری کے متعلق خوش دیو مینیؔ ’’ہمارادب‘‘ کے ایک شمارے

میں یوں رقم طراز ہیں:

''مولانا حسرت بہترین صحافی اور مانے ہوئے ادیب ہیں نہیں بلکہ شہر آفاق شاعر بھی تھے۔اُن کی غزلوں میں عاشقانہ پن کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔وہ جس بھی مشاعرے میں شرکت کرتے اپنی شاعری کا سکہ منوا کر ہی اُٹھتے تھے۔حسرتؔ نے بہت سی نظمیں اور غزلیں لکھیں لیکن کلام کا بیشتر حصہ یا تو ناپید ہوگیا یا پھر منتشر حالات میں ہے۔''[۱۴۱]

چراغ حسن حسرتؔ کا شمار ریاست کے اعلیٰ پائے کے شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں:

اب کے برسات میں بھی پی نہ سکے
ہم پہ روتی ہوئی برسات گئی

☆

زندگی تو ہی مختصر ہو جا
شبِ غم مختصر نہیں ہوتی

☆

ڈرتا ہوں کہ اس چشمِ فسوں ساز کی گردش
احساسِ تمنا کو تمنا نہ بنا دے

☆

حسرتؔ کے لیے تو آئے تری بزم ناز میں

کم بخت رونہ دے کہیں محفل کے سامنے

☆

شمعیں بجھنے لگیں کہرام ہے پروانوں میں
رخ روشن سے عیاں نورِ سحر ہے کہ نہیں

☆

غم آرزو کو نہ زندہ کر دل بے خبر یہ وہ آگ ہے
جو سلگ اُٹھی تو سلگ اُٹھی، جو دبی رہی تو دبی رہی

☆

جوانی مٹ گئی لیکن خلش درد محبت
جہاں معلوم ہوتی وہیں معلوم ہوتی ہے

میر غلام رسول نازکی کا تعلق بزرگِ سادات میر نازک قادری کے واسطے سے ہے جو شیخ حمزہ کے زمانے کے کچھ بعد کشمیر آئے۔ نازکیؔ کے والد صاحب انہیں کی اولاد میں سے تھے اور عربی و فارسی کے سر برآوردہ عالم تھے۔ اپنے والد کی سر پرستی میں نازکی کو علم و ادب سے لگاؤ پیدا ہوا اور بچپن سے ہی شعر و شاعری کی طرف راغب ہوئے اور ابتدا میں اپنا کلام اخبارات وغیرہ میں غنی کاشمیری کے قلمی نام سے شائع کرواتے تھے۔ عبدالقادر سروری اُن کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''غلام رسول نازکیؔ وادی کے کہنہ مشق شاعروں میں سے ہیں اور اردو زبان میں اظہاری نزاکتوں کے شعورِ بیان کے انداز پر قدرت نے انھیں اساتذہ کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ اساتذہ اردو کی روایت کے وہ وفا شعار پابند ہیں۔ اسی لئے غزل کی

صنف زیادہ تر اُن کی فکر کا محور رہی ہے۔لیکن اُن کی غزل نئے عہد کی نئی غزل ہے،
جس میں ہمارے اپنے عہد کی فکر کا شعور موجود ہے۔میرؔ کی سادہ بیانی کا پرتو اگر کشمیر
کے کسی سخن کے کلام میں نظر آتا ہے تو وہ نازکیؔ ہیں۔''۱۵؎

نازکیؔ نے اپنے دور کے تمام تحریکات اور رجحانات کا اثر قبول کیا اور نہ صرف ریاست کے طول وعرض میں اردو شاعر کی حیثیت سے مقبول ہوئے بلکہ بیرون ریاست میں بھی اپنی انفرادیت کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوئے۔اس طرح نازکیؔ نے ریاستی شعرا میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔نشاطؔ انصاری اپنے ایک مقالے میں نازکیؔ کی انفرادیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس مینو سواد وادی کے سخن وروں میں مشکل سے دو تین ہی مطالع مند صاحب قلم
ایسے نکل آئیں گے جن کے شب و روز ماضی میں نہ سہی پر آج کل آسودہ حالی کے
اپسراؤں کے درمیان ضرور گزرے ہیں۔اس مختصر جماعت میں میرے ایک کرم فرما
اور بزرگ دوست سرفہرست ہیں۔جو ایک نام ہی نہیں بلکہ ایک مکتبہ فکر ایک دور اور
فکر وفن کا دبستان ہے۔چمنستان کشمیر کا یہ سبد گُل یہاں کا کہنہ مشق شاعرِ براڈ کاسٹر،
منجھا ہوا مقرر، زبان و بیان کی خوبیوں و خامیوں اور فنی باریکیوں کا صبح پارکھ میر غلام
رسول نازکیؔ ہے۔''۱۶؎

میر غلام رسول نازکیؔ نے متعدد شعرا اور اُس عہد کی شعری روایات خاص کر کلاسیکی شاعری سے استفادہ کرنے کے باوجود اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات سے استفادہ کیا۔نازکیؔ نے اپنی ذات کو منتشر ہونے سے بچایا اور بہت ہی احتیاط سے کام لے کر نئی راہ نکالی۔بقول حامدی کاشمیری:

''نازکی صاحب کی شاعری میں اُن کی زندگی کے واردات و مشاہدات کی جلوہ گری

ملتی ہے۔ وہ تخیل آرائی، خیال طرازی یا لسانی تزئین کاری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے۔ اردو کے اکثر و بشتر شعراء اس کا شکار رہے ہیں۔ نازکی صاحب کی شخصیت میں جذبات ی کارفرمائی ملتی ہے۔ مگر جذبات کا وفور نہیں۔ وہ عقلی قوتوں سے کام لے کر اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہیں اور اپنی شاعری کو جذباتیت سے آلودہ نہیں ہونے دیتے، وہ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے مختلف حقائق سے متصادم ہو کر اپنے داخلی ردِعمل کو لفظوں کا نامہ پہناتے ہیں۔ اس طرح سے اُن کی شاعری زندگی کے دکھ درد کا احساس پیدا کرتی ہے۔'' ۱۷

پروفیسر ظہورالدین اپنے ایک مضمون میں نازکی کے متعلق لکھتے ہیں:

''غلام رسول نازکی وادی کے اُن معدودے چند شاعروں میں سے تھے جنھیں ایک طرف اگر فن شاعری کے جملہ لوازم کا بھرپور شعور تھا تو دوسری طرف رموز سے بھی کماحقہ آشنا تھے۔ زبان و بیان پر اس قدرت کی وجہ سے اساتذہ میں شمار کئے جاتے رہے۔'' ۱۸

آپ نے اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کا بہترین ذریعہ رُباعی و قطعات کو بنایا۔ اُن کے قطعات کے چند نمونے ذیل میں درج ہیں:

دل سے اُٹھی لب پر آئی لڑکھڑا کر گر پڑی
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا مآل التجا
حسن بے پرواہ نظر آتا ہے مغرور و فتین
ملتجی کو جب نہیں رہتی مجالِ التجا

☆

میں اُس غریب کی مانند دل سے لڑتا ہوں

جو بے کسی میں الجھتا ہے قرض خواہوں سے

جو نا اُمید ہو لڑنے کے بعد اور دیکھئے

متاعِ خانہ کو حسرت بھری نگاہوں سے

آپ کی شاعری کلاسیکی انداز کی شاعری ہے اور فکر و جذبہ کی آمیزش سے مملو ہے۔ جہاں ریاست کے اردو شعرا میں نازکی کے مقام اور مرتبہ کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنے بارے میں خود کہا ہے:

کشمیر کا رہنے والا ہوں اردو معلیٰ لکھتا ہوں

اس دیش میں مجھ سا کوئی بھی اردو کا سخن ور ہو نہ سکا

ریاست جموں وکشمیر میں نازکی ایک ایسے دبستان کے شاعر تھے جو خود ان ہی کا بنایا ہوا تھا۔

کوئی حادثہ ہی ہوگا جو انھیں ملا کے رکھ دے

ترا حسن عرش سیما، میرا عشق پا پیادہ

☆

مجھے اب پتا چلا کہ وہ مائل کرم تھے

مجھے بزم میں جو دیکھا تو بدل گیا ارادہ

☆

کربلا آج بھی ہے دیکھ اُدھر خونِ حسین

وہ محمد کی نواسی ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ

☆

نہ محفل ہے نہ مے خانہ، نہ ساقی ہے نہ پیمانہ

جو تو آئے تو مے آئے جو مے آئے تو جام آئے

نشاط کشتواڑی اصلی نام غلام رسول ۱۹۰۹ء میں کشتواڑ میں پیدا ہوئے۔ گھریلو حالات اچھے نہ ہونے کے عوض اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔ کتب بینی کا جذبہ بچپن سے ہی تھا۔ اردو ادب، تاریخ اور مذہبی کتابوں کے مطالعے میں ہمہ وقت محو رہے۔ ادبی لگن اور ذوق کی وجہ سے شوق مطالعہ نکھرتا گیا اور اردو زبان و ادب کے دل دادہ بن گئے اور تمام عمر اردو شاعری کی آبیاری کرنے میں مشغول رہے۔ اسیر کشتواڑی ان کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''یوں تو نشاط کشتواڑی کو شعر و شاعری کا شوق بچپن سے موجود تھا۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں اچانک وفورِ جذبات نے دم توڑ دیا اور شاعری کی ابتدا اپنے اُستاد محترم مولانا پونچھی مرحوم کی مدح میں لکھے ہوئے ایک اردو قصیدہ سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ غزل اور دیگر اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی۔''[19]

آپ نے ۱۹۴۱ء میں سیماب اکبر آبادی کی شاگردی اختیار کی اور تقریباً تمام اصناف میں کہنہ مشق کی۔ ریاستی و بیرون ریاست میں بھی آپ کا کلام شائع ہوتا رہا۔

اس طرح چراغ سے چراغ جلتے رہے اور آج جموں و کشمیر کے تینوں حصّوں میں اردو کے کم و بیش سینکڑوں شاعر کمال فن کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ دراصل میں نے اپنے موضوع کے مطالعے کو ان ہی شعرا تک محدود رکھا ہے۔

موجودہ دور میں اگر دیکھا جائے تو ریاستی شعراء کے شعری مجموعے آئے دن وقتاً فوقتاً منظرِ عام پر آتے رہے ہیں۔ جن میں سے بعض کو نہ صرف ریاستی سطح پر سراہا گیا ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔ جموں و کشمیر کے موجودہ دور کے وہ شعراء جنہوں نے اپنے اسلوبِ بیان، منفرد حسیت، جمالیاتی ذوق اور

متنوع موضوعات سے اُردو شاعری کو ہم کنار کیا ان شعرا میں حامدی کاشمیریؔ، پرتپال سنگھ بیتابؔ، ودیا رتن عاصیؔ، مظفر ایرجؔ، محمد زماں آزردہؔ، رفیق رازؔ، ہمدم کاشمیریؔ، خالد بشیر احمدؔ، ایاز رسول نازکیؔ، اقبال عظیم چودھری، رخسانہ جبینؔ، ترنم ریاضؔ، فرید پربتیؔ، شفیق سوپوری، نذیر آزادؔ، طاہر مضطرؔ، احمد شناسؔ، نصرتؔ چودھری، فاروق آفاقؔ، شبنم عشائی، بلراجؔ بخشی، فداؔ راجوروی، کے ڈی مینیؔ، امینؔ بانہالی، جان محمد آزادؔ، پریمیؔ رومانی، رفیق انجمؔ، سجادؔ پونچھی، رفیق ہمرازؔ، نکہت فاروق نظرؔ، لیاقتؔ جعفری، پرویز مانوسؔ، اشرف عادلؔ، خورشیدؔ کاظمی، عشاقؔ کشتواڑی، شام طالبؔ، مجید عاصمیؔ، فریدہؔ کول، بشیر احمد بشیرؔ، غلام نبی غافلؔ، سہیلؔ مہدی، فاروق فداؔ، غنفر علی شہبازؔ، سید لیاقت نیرؔ، یاسین سمبلی، محتشم احتشام اور عبدالغنی جاگل وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ یہ تمام شاعر اپنے فنی کمال اور ندرت کے باعث اکیسویں صدی میں ریاست کا سرمایہ اور اثاثہ ہیں۔ چنانچہ ان شعرا کے فنی محاسن کا اجمالی جائزہ حسب ذیل ہے۔

عصر حاضر میں ریاست کے شعر و ادب کی آبیاری کرنے والوں میں کئی نام ایسے ہیں جو اپنے فکر و نظر کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں ان میں حامدی کاشمیری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ریاستی سطح پر ہی نہیں بلکہ قومی سطح پر بھی جتنی توجہ کے مرکز آپ ہیں اور جتنی شہرت آپ کو نصیب ہوئی وہ اظہر من الشّمس ہے۔

حامدی کاشمیری (۱۹۳۶ء) ایک ایسی شخصیت ہیں جو اردو زبان و ادب کے معماروں میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی زیادہ شہرت تو بحیثیت نقاد کے ہے اور آپ کا نام جدید تنقید کے عالمی شہرت یافتہ نقادوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمان فاروقی کے بعد پروفیسر حامدی کاشمیری نے اپنے طبع زاد تر و تازہ اکتشافی تنقیدی رجحان کو اختراع کر کے جدید اُردو تنقید کی دُنیا میں اپنا تشخص قائم و دائم کر لیا ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری افسانہ نویس، ڈرامہ نویس، بہترین انشا پرداز، ممتاز شاعر، اور معتبر نقاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہر صنف میں منفرد اور دنیائے اردو کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے والی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے ادبی فن پاروں کا مطالعہ کر کے اپنی رائے قائم کرنے کے لئے ایک کتاب درکار رہے۔ میرا مقصود صرف

ان کی اردو شاعری کو اجمالاً زیر بحث لانا ہے۔ کیونکہ شاعری حامدی کاشمیری کی پہلی محبت ہے اور آپ خود کو تنقید نگار نہیں شاعر کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بقولِ پروفیسر مجید مضمر۔

''حالانکہ حامدی کاشمیری خود کو بنیادی طور پر شاعر کہلانا پسند کرتے ہیں''۔ ۲۰

مظہر امام اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں۔

''میرے نزدیک حامدی کاشمیری کی پہلی شناخت ایک تنقید نگار کی ہے لیکن خود اُن کی رائے اس سے مختلف ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ پہلے شاعر ہیں پھر تنقید نگار۔ بہر حال اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ وہ بحثیت ناقد بھی انفرادیت اختیار رکھتے ہیں اور بحثیت شاعر بھی''۔ ۲۱

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ حامدی کاشمیری کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے اس طرح دیتے ہی۔

۔۔۔(حامدی کاشمیری) کشمیر کے جدید اردو ادب کی رنگا رنگ شخصیت ہیں۔ وہ افسانہ نگار سے بڑھ کر شاعر اور شاعر سے بڑھ کر افسانہ نگار''۔ ۲۲

حامدی کاشمیری نے اپنی ادبی سرگرمیوں کے ان دونوں پہلو کو یکساں اہمیت دی ہے۔ اور دونوں میں انہوں نے تازہ کاری کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ ملک میں سب سے زیادہ چھپنے والے اور اعلیٰ معیار کے تقریباً سبھی رسائل میں اُن کے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور شعری تخلیقات وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کے اب تک سات شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ جو حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ عروس تمنا

۲۔ نایافت

۳۔ لاحرف

۴۔ شاخِ زعفران

۵۔ وادیِ امکان

۶۔ خوابِ رواں

۷۔ یک شہرِ گماں

ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ حامدی کاشمیری اپنے منفرد اسلوب و آہنگ کی بنا پر جدید اور ما بعد جدید اردو شاعری میں اعلیٰ وارفع مقام پر فائز ہیں۔ آپ اظہاریت کے فطری اصولوں کے تحت تجربات کی تجسیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عصری آگہی کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ملتا ہے۔ عصری آگہی، قدروں کی شکست وریخت اور زندگی کی لایعنیت ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ برف، پرندے، نوا، خون، سنگ، وادی، شجر، شعلہ، دشت، چنار، ایسے لفظ پیکر ہیں جن سے عموماً آپ نے اپنی شاعری کو تراشا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ہیں۔

موجِ انفاس آتشیں ہی نہیں
برف پگھلے گی یہ یقین ہی نہیں

☆

برف سے ڈھک جائیں گے ساتوں پہاڑ
وادی وادی آتشیں ہو جائیگی

☆

گرِ گیا خون بے گناہوں کا
بڑھ گئی اشتہا زمینوں کی

خون رخشندہ کو اُچھلنا تھا

ہر حقیقت کو خواب کرنا تھا

☆

یہ زمین دیکھنے میں سبز نظر آتی ہے

دو قدم اور چلو سوختہ پائی دے گی

حامدی کاشمیری کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ابتداء سے آج تک تازہ کاری اور نادر کاری کو برقرار رکھا ہے۔ آج کا انسان جس غیر محفوظیت، وحشت اور خوف کا شکار ہے اس کا ذکر تو عصری شاعری میں عام ہے اور حامدی کاشمیری کے ہاں بھی یہ موضوعات ہیں لیکن ان کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ یہ موضوعات تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ جن موضوعات کا انتخاب آپ کرتے ہیں ان سے قاری صدیوں سے واقف ہوتا ہے مثلاً برف باری، موسم برگ و ثمر، موت و حیات، خوشی و غم، ظلم و جبر اور سیاست وغیرہ۔ لیکن جب قاری شاعری کا مطالعہ کرتا ہے تو نئے پن اور تازے پن سے دوچار ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار۔

روکو نہ میرا راستہ سرسبز جنگلو!

میں دست و پا شکستہ ہوں، پیچھے غنیم ہے

☆

میرے محافظو! خنجر بکف رہو شب بھر

سنا نہیں، وہی آئی باہر سے

☆

سبھوں نے بند کئے اُن پر اپنے دروازے
خبر یہ سب کو تھی، لوٹ آئے تھے سمندر سے

ان کی ایک غزل کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے۔

یہ وقوعے تو آسماں کے ہیں
سانحے اور جسم وجاں کے ہیں
آج انھیں پہلی بار دیکھا ہے
کون ہیں یہ بھلا کہاں کے ہیں
دونوں پاتال میں مقید ہیں
دوہی کردار داستاں کے ہیں
سایہ سایہ ہے اژدھا صورت
کیا یہ آثار اِسی جہاں کے ہیں؟

اس غزل کی زبان صاف وسادہ ہے لیکن زبان میں داخلی ساخت دیکھئے اور کس طرح اشعار تہہ در تہہ معنویت لئے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لفظ اور خیال کا وہی رشتہ ہے جو لباس اور جسم کا، اگر یوں کہا جائے کہ جسم اور روح کا تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ اس کا خیال حامدی صاحب کی شاعری میں ہمیں اکثر ملتا ہے۔ انہوں نے الفاظ کو مہارت اور فنکارانہ سلیقے سے استعمال کر کے اپنے حسیات وتخیلات ، ولولوں اور امنگوں ، محرومیوں ، تجربات و مشاہداتِ زندگی کو تخلیقی عمل کی صورت میں پیش کیا ہے۔

وادیوں سے پھول رخصت ہوگئے
پھر وہی ایام بے تابی کے ہیں

☆

گونجی دستک کی صدا میں نے دریچہ کھولا
سامنے تکتا ہوا راہ گزر تھا کوئی

☆

یہ کوہ نما رات بھلا طے ہو تو کیونکر
اب صبح فروزی کا سہارا ہی نہیں ہے

☆

میں کہیں تھک ہار کے بیٹھا نہیں
دیکھ اے دشت طلب میری طرف

☆

ہاں اس لمحے میں ہوتا ہے ستاروں کا نزول
شہر خوابیدہ میں کوئی دل بیدار ہے کیا؟

☆

تم نے آنے میں دیر کرلی ہے
ہر نفس کا حساب کرنا تھا

☆

حامدی کاشمیری کی شاعری میں مقامی رنگ، ظلم و جبر، معاشرتی زندگی، سیاسی اور معاشی حالات کا کھل کر اظہار ملتا ہے۔ شاعر ہو یا پھر فکشن نگار کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ذاتی زندگی، سماج، عہد اور ماحول میں

پیش آنے والے حالات کو باریک بینی سے دیکھے اور زودِ قلم کرے۔ حامدی کاشمیری بھی ان ہی حالات سے متاثر نظر آتے ہیں مثلاً۔

سیاہ دشت میں نور قمر کہاں تک ہے
یہ ناشناس توقف سفر کہاں تک ہے

☆

بھٹکتے پھرتے سیاہی کے دہشت وحشت میں
چراغ راہ گذر ہے یقین نہیں آتا

☆

ہوا آ رہی ہے بُو لہو کی
ضرورکوئی اس بستی میں مقتل رہے ہیں

☆

جو سمت نما ہو وہ ستارہ ہی نہیں ہے
ظلمت کے سمندر میں کنارہ ہی نہیں ہے

☆

سراب و دشت کی ظلمت کا کوئی انت نہیں
بتاؤ روشنی چشم تر کہاں تک ہے

☆

سب کو آشفتہ کار ہونا تھا
دشت کو بے کنار ہونا تھا

☆

دشت کی دھوپ سے پگھلتے رہے
ابر کو سایہ دار کرنا تھا

☆

یہ کیسی آگ میری خاک میں ہے
فروغ شعلگئی افلاک میں ہے

☆

ہے سارا شہر گرد تیرہ میں گم
میں تنہا ہالہ مہتاب میں ہوں

☆

فراغت سے عدو بیٹھے ہوئے ہیں
میں اپنے حلقہ احباب میں ہوں

☆

مرے سینے میں سب پرندے چھپے
شجر در شجر برف گرتی رہی

☆

اس میں شک نہیں کے حامدی کاشمیری کی شاعری پر ترقی پسندانہ طرز فکر بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

ابھی نہ دے مجھے اے دوست! دعوت عشرت
سلگ رہی ہے میرے دل میں آتشِ آلام

☆

اُفق پہ چھائی ہوئی تیرگی کے دامن سے
مجھے یقین تھا اُبھرے گی تابناک سحر

☆

اور آج ہم جسے سمجھے ہیں صبح نَو اے دوست!
یہ صبحِ نو ہے حقیقت میں اِک فریبِ نظر

☆

لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد انہوں نے اجتماعیت کے بجائے وجودیت پر زور دیا۔ اور ان کی شاعری میں باطن شناسی کا عمل نمایاں ہے۔ ان ہی کی زبان میں ملاحظہ کیجئے۔

''(۱۹۶۰ء کے بعد)۔۔۔۔۔ میرے رویوں میں بنیادی تبدیلی آنے لگی۔ میں نظریات کی ملمع کاری کو محسوس کر کے وجودی خیالات کی اصلیت کے قریب آنے لگا اور مکاشفانہ آگہی سے حقائق کا ادراک کرنے لگا۔۔۔'' ۲۳

شاخ زعفران میں انہوں نے بجا طور پر لکھا ہے۔

''میں شاعری کے ابتدائی دور ہی سے ایک بے نام اور نا قابلِ تسخیر جذبے کے تحت خارجی دنیا سے باطن رجوع کرنے پر مائل رہا ہوں۔ داخلیت پسندی

کے اس رویئے کے نتیجے میں رفتہ رفتہ میرے وجود کے حجابات اُٹھتے گئے اور میں تخلیق شعر کے عمل کے دوران میں خود پر منکشف ہونے کے معجزاتی عمل سے دوچار ہونے لگا''۔ ۲۴

پروفیسر مظہر امام یوں کہتے ہیں۔

''ان کی شاعری تحیر و تجسس اور خوف و حراس کے جو مناظر پیش کرتی ہے اس کی نوعیت تخلیقی ہے اور باطن کے اضطراب کی پروردہ ہے''۔ ۲۵

ان کی شاعری کلاسکی رکھ رکھاو کے ساتھ ساتھ جدید حسیت اور عصری آگہی اور وسعتِ مشاہدہ، فکری تنوع اور جدت اسلوب سے مزین ہے۔ان کی زبان، تراکیب، علامات اور استعارات کا جدید استعمال ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد گر یہ کہا جائے کہ ان کی شاعری میں وطن سے محبت کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔لیکن حامدی صاحب کو صرف ریاست تک محدود رکھنا بے انصافی ہوگی کیوں کہ ان کی شاعری جس طلسمی دُنیا کی سیاحت پر آمادہ کرتی ہے وہاں مقامیت کی حدیں منہدم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کشمیر کے صوفی شاعروں کے شعری ورثہ کے علاوہ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور پھر یورپی اثرات سے متعلق تحقیق کی سعی ثابت قدم ہے۔اس طرح حامدی صاحب کے ہزار رنگ ہیں جن کو چھیڑنا نا انصافی کے مترادف ہوگا اور جن کا احاطہ اس مختصر تعارفی خاکے میں نہیں ہوسکتا۔ بالآخر میں اپنے اس طائرانہ جائزہ کا خاتمہ ان اقوال کے ساتھ کرتا ہوں۔

''وہ عصری حقیقتوں کو جذب کرنے کے باوجود انسان کی بنیادی جبلتوں اور عناصر کی آمیزشوں کے شاعر ہیں۔فطرت کو اس کے ان گنت رنگوں میں لکھتے ہیں اور بصری، حسی تجربوں میں سے گذرتے ہوئے لفظ و معنی کے ماورائی آفاق تلاش کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔'' ۲۶

''حامدی کاشمیری کی شاعرانہ شخصیت حساس، سنجیدہ اور مفکرانہ ہے''۔ ۲۷

''حامدی اپنے نظریات کے باعث اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ان کے مداح اور معترض دونوں حلقے موجود ہیں۔لیکن نئی نسل سے تعلق رکھنے والوں میں وہ قدر و احترام سے دیکھے جاتے ہیں''۔ ۲۸

رفیق راز:۔حامدی کاشمیری اور حکیم منظور کے بعد آج کی تاریخ میں رفیق راز ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کی معیاری شاعری کی پہچان بن چکے ہیں۔رفیق راز کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ جتنی عمدہ غزلیں اور نظمیں اُردو زبان میں لکھ رہے ہیں ویسی ہی شاعری کشمیری زبان میں بھی کر رہے ہیں۔اُردو میں اب تک ان کے دو شعری مجموعے''انہار''(۱۹۹۸ء)اور''مشراق''(۲۰۰۶ء) کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔اسکے علاوہ ان کے کشمیری میں دو شعری مجموعے''نَے چھے نالان''اور''دستاویز''منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

رفیقؔ راز گذشتہ کئی دہائیوں سے شاعری کر رہے ہیں اور جدیدیت کے راستے سے آج مابعد جدیدیت تک آئے ہیں۔رفیقؔ راز کو کشمیر کا مابعد جدید شاعر کہا جا سکتا ہے۔ثبوت کے طور پر ان کے درج ذیل اشعار سامنے رکھے جا سکتے ہیں۔

جسم کے دشت میں ویرانی جاں بولتی ہے
فرق یہ ہے کہ کوئی اور زباں بولتی ہے
یہ کرشمہ تری تصویر کا ہی لگتا ہے
ورنہ دیوار کسی گھر کی کہاں بولتی ہے

رفیقؔ راز کی غزلوں اور نظموں میں کشمیر کے شناختی امتیازات، تنہائی، ذات کا انتشار وجود کی شکستگی، زندگی کے بے معنی ہونے کا کرب، زمانے کی بے رُخی وغیرہ کا اظہار سکہ بند جدید شاعروں کی طرح فیشن کے

انداز میں نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ سارے عناصر رفیق راز کی غزلوں میں سچے تحقیقی تجربے، جذباتی وحسیاتی شعور اور تہذیب یافتہ کیفیت کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رفیق راز اپنے سامنے کی زندگی اور زمانہ سے اپنی غزلوں کے لیے تار و پود حاصل کرتے ہیں لیکن ان کا اظہار اپنی ذات کی گہرائیوں میں موجود منفرد لسانی ،فکری ،اور اسلوبیاتی رنگ و روش کے ساتھ کرتے ہیں ۔اسی لیے رفیقؔ راز کی غزلوں کی فضا، عام طور پر داستانی، اساطیری اور صوفیانہ نظر آتی ہے۔

ساتھ اب کے کچھ نہیں زادِ سفر بس ہاتھ ہیں
سات سو سالہ پرانا نقشہ تبریز ہے
ملبۂ بغداد سے کرتا ہے تعمیر سخن
تیرے اندر کا بھی شاعر فطرتاً چنگیز ہے
اپنا ہی کوئی درپئے آزاد مجھ میں ہے
مجھ سے ہی کوئی برسرِ پیکار مجھ میں ہے
لوگ مجھ کو دیکھ کر اتنے ہیں کیوں حیران سے
جیسے ناقہ پر میں ہوں ابھی کنعان سے
سر تو لائے ہو بچا کر اے مرے غازی مگر
سر اُٹھا کر چل نہ پاؤ گے یہاں تم شان سے

مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقیؔ نے بھی رفیقؔ راز کی غزلوں کے مجموعے ''انہار'' کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔

''رفیق راز کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں پہلو اس کا فکری آہنگ ہے۔غزل کے

بارے میں مدت تک یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں رہی کہ اسے سادہ اور اسلوب ہی درکار ہے بعض لوگوں نے تو غزل میں استعارے کو بھی ناپسند کیا ہے بعض لوگوں نے غزل سے تقاضا کیا کہ اس میں صرف آپ بیتی اور ذاتی داخلی وار داتوں پر مبنی مضامین ہوں۔ رفیق راز ان شعرا میں نمایاں ہیں جنھوں نے غزل کے اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں رفیق راز کی عمر ابھی زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے لہجے اور افکار دونوں میں تمکین اور پختگی کے آثار نمایاں ہیں گرد و پیش کی زندگی اور شاعر کے احساس اور ذات کا اس سے محاسبہ رفیق راز کی غزل کا خاص موضوع ہے۔ لیکن گرد و پیش کی زندگی کو سیاہ چادر کی طرح اپنے اوپر اوڑھتے نہیں اور نہ وہ اپنے محاربے کو جھنڈے کی طرح اُٹھائے اُٹھائے پھرتے ہیں انھیں اپنے محسوسات اور مشاہدات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے میں کوئی مشکل اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ شعر کے تقاضوں کو باقی تمام چیزوں پر مقدم جانتے ہیں ان کے شعر کا آہنگ انفعالیت اور بے چارگی کے احساس سے عاری ہے۔ زبان کے ساتھ بھی ان کا رویہ غیر رسمی اور تخلیقی ہے''۔ ۲۹

شمس الرحمٰن فاروقی نے رفیق راز کی غزلوں کے بارے میں عمومی رائے کا اظہار کیا ہے اور ان کی باتوں کا حاصل اتنا ہی ہے کہ رفیق راز جدید تر شاعروں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ مشہور نقاد حامدی کاشمیری نے بھی رفیق راز کی انفرادیت کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''۱۹۸۰ء کے بعد ریاستی اور ملکی سطح پر اُبھرنے والے نئے شعرا میں رفیق راز نے بہت جلد اپنی انفرادیت منوانے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ ان معدودے چند نئے

شعرا میں نمایاں، امتیازی اور مستحکم حیثیت رکھتے ہیں جو تخلیق شعر میں دو بنیادی لوازم کو عزیز رکھتے ہیں۔ جو شعر میں کسی منصوبہ بندی سے اپنے کسی خیال یا نظریے کو ڈھالنے کے بجائے لفظوں اور پیکروں کو اپنے بل بوتے پر ترکیبی صورت میں ڈھلنے اور نادر کار شعری تجربے میں مقلب ہونے پر اصرار کرتیہیں۔ دوسرے جو روایت کے گہرے شعور کے ساتھ جدت کاری سے کام لیتے ہیں، رفیق راز خارجی زندگی کے خونچکاں واقعات، سانحات اور تضادات کا سامنا کرتے ہوئے ذہنی وار دات سے گذرتے ہیں اور گہرے زبان، خوف، اجنبیت اور دِل گرفتگی سے آشنا ہوتے ہیں تاہم وہ مابعد جدیدیت رویّے کے تحت خواب بینی سے دست بردار نہیں ہوتے ہر چند کہ وہ لحہ بہ لحہ ''شکست خواب'' کے المیے کا سامنا کرتے ہیں''۔۳۰

رفیق راز اپنی شاعری میں ڈکشن، ہیئت اور آہنگ کے اعتبار سے کچھ نیا اور انوکھا کرنے کی قوت اپنی لسانی تشکیل میں رکھتے ہیں۔ رفیق راز نے عربی، فارسی، اور اردو کی روایتی شاعری کے ساتھ ساتھ صوفیانہ شاعری سے بھی بہت گہرا فائدہ اُٹھایا ہے۔ لیکن اپنے مشاہدے اور ادب میں لسانی سطح پر ہو رہی تبدیلیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جس جرأت مندی سے انہوں نے شاعری کے مروجہ روایتی پیکروں میں تبدیلی کا سراغ لگانے کی سعی کی ہے جس کی وجہ سے آنے والی نسلوں کے لیے ایک نئی روشنی کی راہ بیدار ہوتی ہے۔

پانی سرابِ فکر کی موجوں سے دستیاب
سایہ کیسے ہوئے ہے مسافر پہ گردِ راہ

ردیف اور قافیہ کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو شعر کی داخلی اور صوتی تبدیلیوں پر بھی خاصی توجہ کی ہے۔ جس کی مثال ان کے مجموعہ کلام ''انہار'' کی آخری ۲۳ غزلوں میں دیکھا جا سکتا ہے رفیق راز نے اپنی نظموں

میں خارج سے داخل کی طرف رُخ کرتے ہوئے فرد سے کائنات کے رشتے کی دریافت کے سلسلے میں شخص اور جذباتی سطحوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

غرض کہ رفیق راز نے اپنی شاعری میں زمانے کے بدلتے تقاضوں اور شعری روایتوں کی ضرورت اور اہمیت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اُن کی شاعری موجودہ اور آنے والے عہد کے لیے نئے شعری اُفق کی جستجو کے زاویے فراہم کرتی ہے۔اس سلسلے میں اُن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہمارے خون کی خوشبو جاگ اٹھے گی
معطر اس سے یہ اکیسویں صدی ہوگی

☆

ڈوب ہی جاؤں گا یہ سوچا نہ تھا
یہ سمندر اس قدر گہرا نہ تھا

☆

میں ہی تھا اور میرے خواب تھے
چار سو تیرا دھواں پھیلا نہ تھا

پرتپال سنگھ بیتاب:۔جموں وکشمیر کے جدید شاعروں میں پرتپال سنگھ بیتاب ان معنوں میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۸۰ء کے آس پاس کیا لیکن آج تک اُن کی غزلیں اور نظمیں متواتر برصغیر ہندوپاک کے رسائل وجرائد میں شائع ہورہی ہیں۔ان کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ''پیش خیمہ'' ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا، جسے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔اسکے بعد بیتاب کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے مثلاً'' سراب دوسرا'' (۱۹۸۴ء) ''خود رنگ'' (۱۹۹۵ء) ''موج رنگ'' (۲۰۰۳ء) بیتاب کی نظموں کا مجموعہ ''نظم

اکیسویں صدی کی‘‘(۲۰۰۸ء) میں شائع ہوئی غزلوں کا ایک مجموعہ’’شہرِ غزل‘‘ کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری کا اندازہ ان کے درج ذیل غزلیہ اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

مجھے معلوم تھا میں اور سنور جاؤں گا
گھر سے نکلوں گا تو ہر سمت بکھر جاؤں گا
راز موجوں کے سمندر نے بتائے ہیں مجھے
یہاں ڈوبوں گا کہیں اور اُبھر جاؤنگا

☆

کچھ تو ہیں پتھر پریشان آذروں کے درمیان
اور کچھ آزر پریشان پیکروں کے درمیان
جائے حیرت اس نئی تہذیب میں موجود ہے
اک پرانا سا کھنڈر اونچے گھروں کے درمیان

جموں و کشمیر میں اکیسویں صدی کے دوسرے شاعروں کی طرح پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری میں بھی مقامیت، وجود کے دوہرے پن اور مایوس و پژمردگی کے احساسات ملتے ہیں لیکن ان کا اظہار جدید استعاروں کے ساتھ ہوا ہے، مثلاً ان کے یہ اشعار۔

کتنے یگوں کی برف ہے اس کوہسار پر
باطن میں اس کے اب کوئی لاوا نہیں رہا

☆

کھودی تھیں ہم نے اپنی روایات کے لیے
یہ کیا ہوا کہ ہم انہی قبروں میں گر گئے

☆

وہ قتل کرتا ہے ایک ایک دن میں سو سو بار
کبھی کبھی تو مجھے خوں بہا بھی دیتا ہے

پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑتی، وہ شدتِ احساس کے شاعر ہیں۔ان کے اشعار میں ذاتی، ناکامی، فلسفہ، سیاست کی ناکامی، تہذیب وثقافت کی ناکامی کی شکل جگہ جگہ اُبھرتی ہے۔

پڑھتے رہے ہمیشہ پرانی کتاب ہم
اور ڈھونڈتے رہے ہیں نیا کوئی باب ہم

☆

ہم بس گئے وہاں مگر آباد ہو نہ پائے
کچھ وہ جدید تھا کچھ ہم قدیم تھے

ایسی ہی شاعری کی وجہ سے پرتپال سنگھ بیتاب اکیسوی صدی کے شعراء کی فہرست میں صف اول کے شاعر مانے جاتے ہیں۔انہوں نے سچی اور کھری شاعری کے خزانے میں اضافہ کیا ہے۔

قریہ قریہ ضابطوں کی حکمرانی دیکھنا
پھر ہوا میں چار سو اک بدگمانی دیکھنا
کس طرف سے آیا ہوں رُخ ہے اب کدھر میرا
راستوں کے جنگل میں کھو گیا سفر میرا

بیتاؔب کی شاعری میں جدید رنگ کے ساتھ ساتھ شعری روایات سے رشتہ بھی موجود ہے۔اس کے علاوہ ایک اور چیز بیتاؔب صاحب کی شاعری کو جدید شعراء میں امتیاز عطا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مخصوص علامتوں کو ان مخصوص معنوں میں ہی استعمال نہیں کرتے جو اکثر جدید شعراء نے فرض کر لیے ہیں۔ بلکہ انہیں نئے جدید معنی بھی دیتے ہیں۔ان کے یہاں سمندر، ہوا، آسمان، سایہ، شاخ، شجر وغیرہ جیسے الفاظ اُس قسم کی فضا اور کیفیت کی نوعیت سے الگ نظر آتے ہیں۔جس طرح کی فضا اور کیفیت بیتاب صاحب سے بیس پچیس سال پہلے کے جدید شعراء کے کلام میں نظر آتی ہے۔

بلاتی ہیں ہوائیں ہم کو بیتاؔب
مگر ہم تو غبارِ رفت گاں ہیں

☆

نہ دے اونچائی میرے قد کو بے شک
میری ہر شاخ کو لیکن ثمر دے

☆

پرندے ہیں دور بہت آسماں پر
زمین پر تو فقط پرچھائیاں ہیں

غرض یہ کہ جموں وکشمیر میں اکیسویں صدی کی شاعری کو بلندیوں پر پہنچانے والے جدید شعراء میں پرتپال سنگھ بیتاب بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

رفیق راز کے بعد ایاؔز رسول نازکی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ایاؔز رسول نازکی کی شاعری کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ ایک طویل عرصے سے مشقِ سخن کر رہے ہوں۔لیکن انھوں نے چھپنے چھپوانے پر کم توجہ دی ہے۔اسی

لیے اب تک ایاز رسول نازکی کے صرف دو مجموعے ہی منظرِ عام پر آئے ہیں ''خودرو'' اور ''شام سے پہلے''۔ ''خودرو'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ بہ مشکل سو صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں ہیں۔ دوسرے مجموعے ''شام سے پہلے'' میں بھی ایاز نازکی نے ڈیڑھ سو کے قریب غزلیں شائع کی ہیں یہ مجموعہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا اور بلاشبہ اس مجموعہ کی غزلیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ ایاز رسول نازکی صرف جموں و کشمیر کے ہی نہیں بلکہ پوری اُردو دنیا کے حوالے سے چند نمائندہ اکیسوی صدی کے شاعروں میں شمار کئے جانے کا پورا حق رکھتے ہیں۔

ایاؔز نازکی نے اُردو کے ناقدین اور دانشوروں کی توجہ اس وقت اپنی جانب مبذول کی تھی جب ان کی ایک غزل شمس الرحمٰن فاروقی کی نگرانی میں شائع ہونے والے معروف رسالے ''شب خون'' میں شائع ہوئی۔ اس غزل کی لسانی ساخت، فکری نظام اور فنی دروبست نے لوگوں کو چونکایا۔ اس غزل کے چند اشعار اس طرح ہیں۔

میں سپیدے کا پیڑ ہوں لیکن
برف نے میری ٹہنیاں توڑیں

☆

اس کے پردے ہوا ہلاتی ہے
میرے کمرے کی کھڑکیاں توڑیں

☆

میرے بچپن میں ایک بوڑھا تھا
اس کے بیٹوں نے لکڑیاں توڑیں

☆

وہ اُترنے سے خوف کھاتا تھا
اس نے چڑھتے ہی سیڑھیاں توڑیں

☆

اس حویلی کے لوگ سوئے تھے
ہم نے دستک میں انگلیاں توڑیں

☆

اسپ تازی نے رات بھر شاید
اپنی مضبوط رسیاں توڑیں

اُردو کے مشہور شاعر اور دانشور فاروق نازکی نے جو اتفاق سے ایاز رسول نازکی کے بڑے بھائی ہیں ایاز رسول نازکی کے مجموعے ''خودرو'' میں ایاز رسول نازکی کا تعارف کرواتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ۔

''ایاز رسول فطرتاً کم گو ہے۔شعر کہنے میں بخل کی ایک اور وجہ اپنے پیشے سے والہانہ محبت بھی رہی ہے۔ میں اس کی گوئی سے بہت خوش ہوں۔کم کہنا بہر حال بسیار مگر بے ہودہ گوئی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔کم کہتا ہے خوب کہتا ہے''۔ [۱۴]

ایاز رسول نازکی کی شاعری میں خوب کی یہ صفت اس لیے بھی پیدا ہوئی ہے کہ وہ دیگر معاصر شاعروں سے الگ انداز میں ذات، زندگی اور زمانہ کو دیکھتے ہیں اور جو کچھ ان کے تجربہ اور مشاہدہ میں آتا ہے اسے وہ الگ الگ زاویوں سے جدید تر زبان اور رویوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔انھیں خود بھی اس کا احساس ہے۔

لیکن ایاز رسول نازکی کے یہاں بھی ایسی دلکش اور سنجیدہ غزلیں اور نظمیں ملتی ہیں جن میں فنی اور جمالیاتی تقاضوں کو بڑی مہارت سے برتتے ہوئے جدید تر افکار وخیالات کا اظہار کیا گیا ہے، مثلاً

پہلے جیتے تھے نفرتوں کے بغیر
اب بھی جیتے ہیں چاہتوں کے بغیر
تم پہ ایسا کبھی سماں گذرا
سانس لینا بھی جب گراں گذرا

☆

قول کرتا ہے تو دستور نبھانا ہوگا
سر ہمارا تجھے نیزے پہ اُٹھانا ہوگا
اس کا تابوت اُٹھا پایا نہ بیٹا لیکن
باپ کے قرض کا بوجھ تو اُٹھانا ہوگا

☆

ایک جنگل آج بھی ہے میرے خوابوں میں کہیں
سایہ سبب ہے کیا ؟ چشم آہو دیکھنا

☆

ان کے جذبے سیاستوں کی طرح
پیار کرتے عداوتوں کی طرح

☆

اب تو صدیاں گذرتی جاتی ہیں
غیر محسوس ساعتوں کی طرح

دراصل ایاز رسول نازکی کی غزلوں میں راست بیانی اور سادہ گفتاری کی ہی خوبیاں ہیں جو ان کی غزلوں کو جدید سے آگے مابعد جدید غزل بناتی ہیں۔مشہور ناقد سید محمد عقیل رضوی نے پروفیسر قمر رئیس کی مرتب کردہ کتاب ''معاصر اُردو غزل'' میں لکھا ہے۔

''جدید سے جدید تر غزلیں جنھیں اب پوسٹ ماڈرنزم کی تخلیق سمجھنا چاہئے۔ان میں بھی یہ راست اظہاری کی کیفیت پھر سے پیدا ہو رہی ہے۔شاید غزل کے ابہام سے چھٹنے کے بعد اظہاریت کی تیز لے کا یہ اثر ہوسکتا ہے۔ یہ سبب ابہام کے مسترد ہونے کا بھی ہوسکتا ہے''۔ ۳۱؎

جموں وکشمیر کے اکیسویں صدی کے شاعروں نے اپنی غزلوں میں موضوع ، زبان اور اسلوب کے حوالے سے ساری توجہ صرف اور صرف جدید کاری پر ہی مرکوز رکھی ہے۔ بلکہ مابعد جدید شاعروں کے یہاں مضموں آفرینی اور معنی آفرینی کی خوبیاں غزل کی شعریات کے مطابق بھی نظر آتی ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ نے ایاز نازکی کی غزل کے امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''....ان کی زبان اور لہجے کے علاوہ ان کی برجستہ رمزیت فوراً متوجہ کرتی ہے۔اس بات میں شک و شبے کی گنجائش کم رہتی ہے۔کہ یہ صرف سخنوری کا نتیجہ نہیں اور نہ خیال آرائی کی متقت کے ترجمان۔ان میں خالص شعر کے ارتعاش موجود ہیں اور اس لیے اپنی صداقت کا قائل کر دیتے ہیں ....مجھے اس مجموعے (شام سے پہلے) کے شاعر کی سہل بیانی نے بھی بہت متاثر کیا ہے ....ایاز نازکی کا صاف وشفاف اسلوب دِل کو بہت لبھاتا ہے لیکن اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لہجے کی عوام نوازی کے باوجود احساس اور تصور کی خواص پسندی کو قربان نہیں کیا ہے۔'' ۳۲؎

مجموعی طور پر ایاز رسول نازکی کی حالیہ غزلوں اور نظموں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں اکیسویں صدی کا مابعد جدید رنگ و آہنگ تو ہے ہی بحیثیت مجموعی تغزل کی بھی کمی نہیں۔

احمد شناس:۔احمد شناس کا اپنا ایک خاص مقام ہے رفیق رازؔ اور ایاز رسول نازکی وغیرہ کی طرح احمد شناس گذشتہ ایک دو دہائیوں سے شاعری میں زور آزمائی کر رہے ہیں لیکن پھر بدلتے ہوئے ثقافتی منظر نامے کے سبب جدیدیت سے دور اور مابعد جدیدیت سے قریب ہوتے چلے گئے ان کا شعری مجموعہ ''پس آشکار'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔

''پس آشکار'' بنیادی طور نظموں اور غزلوں دونوں کا مجموعہ ہے۔لیکن اس میں شامل بعض غزلوں کو جدید غزل بھی کہہ سکتے ہیں لیکن چونکہ احمد شناس کی اکثر و بیشتر غزلوں میں جدیدیت کی شناختی خوبیوں سے انحراف ملتا ہے ساتھ ہی ان کی غزلیں آٹھویں دہائی کے بعد سے ہی منظر عام پر آ رہی ہیں اس لیے احمد شناس کو ریاست کے مابعد جدید شعرا کی صف میں ہی رکھا جانا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ جدیدیت سے احمد شناس کے انحراف پر روشنی ڈالتے ہوئے جاوید انور نے لکھا ہے۔

> ''احمد شناس نے جدید تہذیب کے اُن عناصر کو اپنی تخلیقات کا محور و مرکز نہیں بنایا ہے جو متروکیت (Obsole) کو راہ دیتے ہیں بلکہ تہذیب کے ان عناصر پر توجہ کی ہے جو بڑی غور و فکر اور مشاہدے کے بعد وجود میں آئے اور جدید تہذیب کا حصہ بنے ہیں۔''بشر دوستی'' اور روشن فکری (Enlightenment کو بھی احمد شناس نے اپنے اشعار میں جگہ دی ہے''۔ ۳۳

اس سلسلے میں احمد شناس کے درج ذیل اشعار قابل غور ہیں۔

یہ کیسا پیاس کا موسم ہے احمد
سمندر دیدہ تر نہ پہنچا

غرق کرتا ہے نہ دیتا ہے کنارہ ہی مجھے
اس نے میری ذات میں کیسا سمندر رکھ دیا

احمد شناس نے اپنی نظموں میں تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی اور تہذیبی حالات کو اپنی ذاتی فکر اور احساس کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بستیوں میں جا بجا دیکھی ہے فصل تشنگی
پھول شاہد ہوں وہاں میرا جہاں سایہ نہ تھا

☆

زمانہ لوٹ کر ڈھونڈے گا خود کو ان خرابوں میں
امانت کی طرح محفوظ رکھنا یاد لمحوں کی

☆

باقی ہر رشتہ ہماری زندگی کا ہے اٹوٹ
ایک سانس کا تعلق ہے کہ بس کمزور ہے

☆

ہمیں جغرافیہ پڑھنا تھا احمد
مگر تاریخ کا غم لگ گیا ہے

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ احمد شناس کی شاعری میں ''ذات'' یا فرد کا تصور محدود نہیں بلکہ ذات یا فرد ایک آفاقی استعارے کے طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے جو جدیدیت کی شعریات کے منافی اور مابعد جدیدیت کے موافق ہے۔ احمد شناس کے یہاں معاشرتی اور ثقافتی اقدار ہی نہیں مذہبی عقائد اور روایات تک کی بھی

پاسداری ملتی ہے لیکن کسی بھی طرح کے کٹر پن Dogmatism کے بجائے آزاد ادرک اور محاکاتی جذباتی و احساساتی آمد کے ساتھ ملتا ہے۔

لفظ جب اُترا مری آنکھیں منوّر ہوگئیں
لفظ احمد زندگی سے رابطے کی ڈور ہے

☆

میں سامنے ہوں، وہ میرے اندر چھپا ہوا ہے
میں اس کی تخلیق ہوں وہ میرے خیال

☆

اس زمین پر ایک پرچھائی لئے پھرتا ہوں میں
کیا خبر اس نے کہاں مجھ کو بنا کر رکھ دیا

☆

سنا تھا تجھ سے اپنا نام تو ''شہ کار'' میں نے
زمیں کا بوجھ لکھا خود کو آخر کار میں نے

دراصل احمد شناس کی شاعری روایتی کلاسیکی ترقی پسند یا جدید شاعری کی طرح پہلی قرات یا سماعت میں مسرت یا بصیرت سے سرشار کر دینے والی شاعری نہیں ہے بلکہ ایسی شاعری ہے جو قاری کو لفظ لفظ کھول کر دیکھنا ہوتا ہے مثلاً

پس خیال ہوں کتنا ظہور کتنا ہوں
خبر نہیں کہ ابھی خود سے دور کتنا ہوں

یہی سطور ہیں میری کہ حرف باقی بھی

میں واہمہ ہوں کہاں تک ضرور کتنا ہوں

احمد شناس نے ''پس آشکار'' میں اپنی شاعری اور اپنے شاعرانہ وجود سے متعلق جو چند باتیں اپنے وضاحتی، بیانات میں کھولی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''پس آشکار'' کی تخلیق کے پس پردہ احمد شناس کی وہ بصیرتیں بھی کارفرما ہیں جو انھوں نے قران مجید، سیرت رسولؐ کے علاوہ، کلام اقبال اور مولانا وحید خان کی تحریروں سے حاصل کی تھیں۔ اور یہ تو پتہ ہے کہ احمد شناس کی شخصیت اور شاعری کا خمیر کشمیر (ریاست) سے ہی اُٹھا ہے لہٰذا گذشتہ دو ڈھائی دہائیوں سے کشمیر جس بحران سے گذر رہا ہے، احمد شناس نے اپنی شاعری میں اس کرب کو بڑی مہارت کے ساتھ سمیٹا ہے۔ محمد یوسف ٹینگ نے پس آشکار کے پیش کلام میں دُرست لکھا ہے کہ۔

> ''شاعر (احمد شناس) کشمیر کی مٹی کو مٹھی میں لے کر بوباس کو شعر کے رگ و ریشے میں INJECT کرتا ہے تو اس میں انفرادی دُکھ درد کے ساتھ انسانی کرب کی لہریں مچلتی ہیں۔ ایسے اشعار کے اندر کشمیر کے زخم لو دیتے ہیں۔ لیکن انھیں ان قدروں اور بڑے تناظر کے ساتھ جوڑنے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ اس وقت دنیا میں نرم جذبات، اچھی قدروں اور بڑے آدرشوں کی جو شکست و ریخت ہو رہی ہے وہ جیسے روحانی سطح پر ایک ''سونامی'' کی گرج کا سراغ دے رہے ہیں''۔۳۴

محمد یوسف ٹینگ کے علاوہ پروفیسر حامدی کشمیری اور پرتپال سنگھ بیتاب نے بھی احمد شناس کی شاعری کے بارے میں اپنے حوصلہ بخش تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ویسے تو ''پش آشکار'' میں چند ایک نظمیں اور متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر پس آشکار غزلوں کا مجموعہ ہے اور احمد شناس کے شاعرانہ انفراد کو ثابت کرتا ہے۔ لیکن آج کی تاریخ میں کسی بھی جنیوین غزل گو جیسے کہ احمد شناس ہیں، دو اور دو چار کی طرح مقام اور مرتبہ کے تعین کا عمل

عمدہ غزل کی تخلیق کے عمل سے زیادہ دُشوار ہو گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ احمد شناس جیسے منفرد سوچ اور اسلوب کے پُر گو شاعر کے تخلیقی شعور میں غزل کی روایات اور انحراف رسومات اور اجتہادات تک بہت کچھ سرگرم اور متحرک رہتا ہے جو انھیں ایک الگ زاویئے سے تخلیق شعر کی تحریک دیتا رہتا ہے لیکن یہ اتنا آسان نہیں۔ چنانچہ ایماندارانہ طور پر دیکھیں تو غزل کے بڑے شاعروں، ولیؔ۔ میرؔ، غالبؔ، اور اقبالؔ سے لے کر فراقؔ، جگرؔ اور شادؔ عظیم آبادی تک نے غزل کو فنی، لسانی موضوعاتی اور جمالیاتی اعتبار سے جن بلندیوں تک پہنچایا تھا آج کا کوئی بھی شاعر کسی بھی پہلو سے اُن کے آس پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ البتہ کبھی کسی نے میرؔ کے تتبع کو اپنی شاعری کی معراج سمجھ لیا تو کبھی کسی نے دوستوں کے اس مذاق کو سچ سمجھ لیا کہ اس کی شاعری غالبؔ سے بڑی شاعری ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں غزل گوئی کے حوالے سے شہرت تو کئی شاعروں کو ملی لیکن خود غزل کے ایوان میں امکانات کے نئے چراغ کم ہی روشن ہو سکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُردو غزل کی زمین بنجر ہو چکی ہے یقینی طور پر مظہر امام، ناصر کاظمی، باؔنی احمد فراز، ظفر اقبال، شہریار اور پروین شاکر کے بعد کے شاعروں میں اسعد بدایونی، عبدالاحد ساز، رفیق راز، ایاز نازکی وغیرہ کے ساتھ ساتھ احمد شناس بھی اکیسویں صدی کے ثقافتی صورت حال میں غزل اور نظم کو نئی جہات سے روشناس کروانے میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ''پس آشکار'' کی غزلیں اور نظمیں اس کی گواہ ہیں۔

پروفیسر نصرت چوہدری:۔ نصرتؔ آرا چودھری جموں و کشمیر کی ایک ذہین شاعرہ ہیں۔ کم لکھنا اور اچھا لکھنا ان کا طریقہ رہا ہے۔ نصرتؔ چودھری یوں تو کئی دہائیوں سے لکھ رہی ہیں۔ لیکن اب تک ان کا صرف ایک ہی شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' کے نام سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی غزلیں اور آزاد نظمیں شامل ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ غزل کی اچھی شاعرہ ہیں یا نظم کی۔ لیکن یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کی غزلوں میں جدید رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ مابعد جدید شاعری کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو بڑی سچائی کے ساتھ غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ نصرتؔ چودھری صاحبہ نے

اپنے شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' کے دیباچے میں خود لکھا ہے۔

''جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے، ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ ضرورت سے زیادہ داخلی نظر آئے۔ لیکن ایک بات جس پر میں بجا طور پر فخر کرسکتی ہوں وہ ہے۔ میری شاعری کی سچائی۔ اس میں کوئی بناوٹ نہیں۔ کوئی چھل کپٹ یا ریا کاری نہیں۔ میں نے ہر احساس اور جذبے کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اور جو محسوس کیا ہے۔ اپنے محدود الفاظ کا سہارا لے کر انہیں پیش کر دیا ہے۔ میرے سبھی تجربات میں چاہیئے آپ کو کوئی تنوع نظر نہ آئے۔ لیکن ان کی بے ساختگی اور اظہار رائے کی آزادی یقیناً آپ کو متاثر کرے گی۔''......۳۵؎

مذکورہ بالا اقتباس میں انہوں نے اپنی شاعری کے امتیازت کی نشاندہی خود کی ہے۔ اوران کی شاعری کے مطالعے سے ثابت بھی ہوتا ہے کہ اپنی شاعری سے متعلق ان کی وضاحتیں یا دعوے غلط بھی نہیں ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

جو لوگ کسی شے کی تمنا نہیں کرتے
خوابوں کے دریچے سے وہ جھانکا نہیں کرتے

☆

جب مجھ سے ہم کلام میری خامشی ہوئی
بکھرے ہوئے وجود سے شرمندگی ہوئی

☆

دُکھ دیتے دیتے اہلِ جہاں مجھ کو تھک گئے

اپنے غموں پہ اس لیے ہنستی رہی ہوں میں

نصرتؔ آرا نے ایک عورت ہونے کے ناطے عورت کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو سمجھا۔ جس میں اس کا کرب بھی ہے، رنج بھی، اور نا اُمیدی بھی، دُکھ کے لمحوں میں بھی وہ نا اُمید نہیں ہونے دیتی بلکہ جینے کی اُمنگ پیدا کرتی ہیں۔ انسان چاہیے زندگی کے کسی بھی مقام پر کیوں نہ پہنچ جائے اُس کے احساسات، جذبات ،اور تجربات ہمیشہ اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ اور انھیں استعمال کرنے کا طریقہ بھی اُس کا اپنا ہوتا ہے۔ جس طرح ہر انسان کے ہاتھوں کی لکیروں کے نشان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اُن کے اظہار کرنے کا طریقہ بھی الگ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اظہار کا طریقہ تو بدل سکتا ہے مگر اس کا سلسلہ جاری وساری رہتا ہے۔

نصرتؔ چودھری نے جس طرح اپنی غزلوں میں رشتوں کو مدِ نظر رکھا اور اُن میں رونما ہونے والے واقعات کو بیان کیا اور عورت ذات کا استحصال، اس کی بے راہ روی، دردمندی، ذلت اور رسوائی کو اپنی غزلوں میں جس طرح بروئے کار لایا۔ ریاست کے حوالے سے بہت کم خواتین شاعرات نے اس بات کو مدِ نظر رکھا ہے حالاتِ حاضرہ پر نصرتؔ چودھری کی نظر کافی گہری ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ آئے دن اس زمین پر انسان کا خون کس طرح بڑی بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ ان حادثات اور واقعات کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہیں زندگی کے غموں کو سہتے سہتے جب اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ ؎

جن پہ لکھے ہیں نام رشتوں کے

میرے سینے میں ایسے خنجر ہیں

روزِ محشر سے کیا ڈراتے ہو

میرے آنگن میں سارے محشر ہیں

اُن کے چہرے کو جب سے دیکھا ہے
آسماں چپ بُجھے سے اختر ہیں
جانے کیسے سفر میں ہوں نصرتؔ
سارے منظر اُداس منظر ہیں

نصرتؔ چودھری نے اگر چہ اپنی غزلوں میں موضوعات کے حوالے سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے اور اُسے اپنی غزلوں میں برتا بھی ہے۔جسکی وجہ سے اُن کا شمار ریاست میں اہمیت کا حامل ہے غزلوں کی طرف ان کا رجحان اگر چہ کم رہا ہے لیکن اس کے باوجود اُن کا شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' قابلِ اعتماد ہے۔نصرتؔ چوہدری کے یہاں عصرِ حاضر کے شناختی امتیازات، تنہائی، ذات کا انتشار وجود کی شکستگی، زندگی کے بے معنی ہونے کا کرب، زمانے کی بے رُخی وغیرہ کا اظہار سکہ بند جدید شاعروں کی طرح فیشن کے انداز میں نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ سارے عناصر نصرتؔ چوہدری کی غزلوں میں سچے تحقیقی تجربے، جذباتی وحسیاتی شعور اور تہذیب یافتہ کیفیت کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نصرتؔ چوہدری کشمیر کی عصری سماجی وثقافتی صورتِ حال سے بھی اپنی غزلوں کے لیے تاروپود حاصل کرتی ہیں لیکن ان کا اظہار اپنی ذات کی گہرائیوں میں موجودہ منفرد لسانی ،فکری ،اوراسلوبیاتی رنگ وروش کے ساتھ کرتی ہیں۔اسی لیے نصرتؔ چوہدری کی غزلوں کی فضا، عام طور پر رومانی اور نسوانی نظر آتی ہے۔لیکن ان اشعار کی گہرائی میں جاکر غور کریں تو ان میں کشمیر کی ظاہری فضا اور عصری حالات اور رسائل کی عکاسی بھی نظر آئے گی۔جس کی چند مثالیں درجہ ذیل ہیں۔

اپنی ہی گرمی سے جل کر اس طرح سوکھا چنار
دیکھتے ہی دیکھتے پھر ہو گیا تنہا چنار
جس کے سائے میں کسی نے پیار کا رستہ چنار

یاد آئے گا مجھے برسوں وہی اونچا چنار
لوگ دنیا کے عجائب دیکھ کر آئے تو ہیں
کس نے کیا دیکھا اگر اب تک نہیں دیکھا چنار
دھوپ کی مسموم شدت سے وہ اندھا ہوگیا
جاگتی آنکھوں سے جس نے کٹتے دیکھا تھا چنار

نصرتؔ چودھری نے زیادہ تر آزاد نظم کی ہئیت میں نظمیں لکھی ہیں۔ نصرتؔ چودھری کے شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' میں کُل ستائیس نظمیں شامل ہیں جن میں زیادہ تر آزاد نظم کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔ جن میں ''ہتھیلی کا چاند''، ''پاگل خواب''، ''زندگی''، ''زنجیر''، ''خودفریبی''، ''وفا''، ''دستک''، ''عید کا دن''، ''سِل''، ''آرزو''، ''قیدی''، ''سفر آئینہ کا''، ''گروقت ملے تو میں''، ''برہن''، ''قیدی لمحے''، ''اللہ والی''، ''غم''، ''تم سچے تھے''، ''وہ لمحہ''، ''یاد کا چاند''، ''سچی کہانی''، ''چپ کے مکانوں کے قیدی''، ''قیدی''، ''پھر کہو''، اور ''خالی کلائی'' قابلِ ذکر ہیں۔

نصرتؔ چودھری نے اپنی نظموں کو آزاد نظم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ جس سے اُن کی نظموں کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے نئی نظم نگار خواتین میں ان کا مقام اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ نصرتؔ آرا نے اپنی نظموں میں محرمیوں، ناکامیوں، اندیشوں اور حسرتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں مشکل الفاظ کا استعمال نہیں کرتی بلکہ عام بول چال کی سادہ زبان میں اتنی مٹھاس کا رس بھر دیتی ہیں کہ ہر دل عزیز کی زبان بن جاتی ہے۔ اُن کی نظموں میں ایک عورت کی ذاتی زندگی کے تجربات اور مشاہدات جلوہ گر ہیں۔ جس میں عورت کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔

اس دور میں عورت پر ہو رہے ظلم وستم اور عورت کے ذاتی مسائل پر اُن کی گہری نظر ہے یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ انہوں نے عورت کے مسائل کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

نصرتؔ کی ان نظموں میں چند ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن کو پڑھنے کے بعد درازوں سے ایک آہٹ دل میں اُتر کر خاموش اُداس چہرے سے یہ کہہ رہی ہوگی کے اگر وقت کی اس اندھی دوڑ میں فرصت ملے تو میری بھی سنو۔

ان نظموں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ قاری سے ہم کلام ہوتی ہیں اور زندگی کے نگار خانے کی سیر کراتی ہیں۔ازدواجی رشتے دونوں فریقین کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے تو اُن کی زندگی کس طرح اجیرن بن جاتی ہے۔اس کے علاوہ بہت سی نظموں میں نسوانی کردار کی شکست وریخت کو نظمایا گیا ہے۔

اس طرح سے مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نصرتؔ آرا جموں وکشمیر کے اکیسویں صدی کے شاعروں میں بلند مقام رکھتی ہیں۔خصوصاً صوبہ جموں کی خواتین شاعرات میں اُن کا اہم نام ہے۔جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عورتوں کے احساسات وجذبات کو پیش کیا ہے۔نصرتؔ کی شاعری میں بغاوت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔لیکن وہ نعرے بازی کے انداز میں نہیں بلکہ پُر امن طریقے سے عورت کو بغاوت کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔اس لئے نصرتؔ چودھری کا جدید دور کے بلند پایہ کے شاعروں اور نقادوں میں شمار ہوتا ہے۔

رخسانہ جبیں:۔ جموں وکشمیر میں اکیسویں صدی کی اُردو شاعری میں جو نئے نام نمایاں ہوئے ان میں ایک نام رخسانہ جبیں کا بھی ہے۔رخسانہ جبیں غزلیں بھی لکھتی ہیں اور نظمیں بھی۔چونکہ رخسانہ جبیں بھی ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں اور ساتھ ہی ریڈیو کی ملازمت کی وجہ سے ریاستی،ملکی اور بین الاقوامی حالات کی بھی معلومات رکھتی ہیں۔لہٰذا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ زبان،لب ولہجہ اور فکر وخیال کے اعتبار سے ان کی غزلوں کو مابعد جدید غزل کا نام دیا جا سکتا ہے۔رخسانہ جبیں کا ابھی تک کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا ہے لیکن ان کی غزلیں اور نظمیں ادبی رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں۔

کشمیر کی اکیسویں صدی کی شاعرات کی شاعری کا رنگ وآہنگ ان سے ملتا جلتا ہے۔لیکن کشمیر کی مابعد جدید شاعرات فیشن کے طور پر اپنے عورت ہونے کی بنا پر مظلوم ہونے کے احساس کو ہر وقت لادے نہیں رہتیں۔ان کی

اکثر و بیشتر غزلیں ایسی ہیں جو انھوں نے ایک آزاد، باشعور اور حساس ''ذات'' کے طور پر لکھی ہیں۔ نصرت چودھری کے بعد اس کی عمدہ مثالیں رخسانہ جبیں کے یہاں ملتی ہیں مثلاً۔

ہمارے شہر پہ اب کس کی حکمرانی ہے
کہ آفتاب فسانہ ، کرن کہانی ہے
ہمارے زخم نہ آنسو ہی دیکھے جاتے ہیں
وہ مہرباں ہے تو کیوں حکمِ بے زبانی ہے

☆

بدلی رُت کے تقاضوں سے تو پریشاں ہے
میں مطمئین ہوں خدا نے مزاج سادہ دیا

رخسانہ جبیں کی شاعری کی بنیادی خوبی ان کی سادگی ہی ہے۔ عام طور پر وہ پیچیدہ اور مبہم علامتوں اور استعاروں کے استعمال سے پرہیز کرتی ہیں اور جو علامتیں وہ لاتی ہیں ان کا سماجی اور تہذیبی پس منظر قاری کی سمجھ میں آتا ہے۔ اس اعتبار سے رُخسانہ جبیں کی غزلیں اور نظمیں موجودہ عہد کی غزل کی سادگی اور سہل بیانی کی عمدہ مثال کہی جاسکتی ہیں۔ رُخسانہ جبیں نے اپنی ذات کے حوالے سے محسوسات کا اظہار تو کیا ہی ہے ان محسوسات کے پردے میں زندگی اور زمانہ کی بے وفائی کا شکوہ بھی کیا ہے رُخسانہ جبیں کا انداز بیان وہی ہے جو کشمیر کے دوسرے موجودہ عہد کے شعراء کا ہے لیکن رخسانہ جبیں نے چونکہ اپنی غزلوں میں تانیثی سوچ اور فکر کے عناصر بھی محسوس یا نامحسوسانہ طور پر شامل کیے ہیں اس لیے رُخسانہ کی شاعری میں ایک ندرت پیدا ہوگئی ہے مثلاً ؎

یہ احوال پُرسی زباں کھینچ کر
نہ رکھ دے کہیں میری جاں کھینچ کر

☆

کچھ ایسی اُس نے اب اپنے دِل میں ٹھانی ہے
ہمیں بھی درد کی دنیا الگ بسانی ہے

☆

ہمارے شہر پہ اب کس کی حکمرانی ہے
کہ آفتاب فسانہ کرن کہانی ہے

☆

جدا ہوئے تو ملاقات بھی نہیں ہوگی
گذرتے وقت کے دریا میں وہ روانی ہے

رخسانہ جبین کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد فرید پربتی اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں۔

''ان کی شاعری میں فنی ارتکاز اور فکری تجدد کے ساتھ ساتھ عصری آگہی کے عمدہ نمونے بھی ملتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو اعترافی رویوں تک ہی محدود نہیں رکھتی ہیں بلکہ دیگر تجربات سے بھی اپنی شعری کائنات مزین کرتی ہیں۔ [۲۰]

خالد بشیر:۔ بلاشبہ ریاست کے ان ادباء کی فہرست میں شمار کیے جاسکتے ہیں جنہیں نظم ونثر پر یکساں دسترس حاصل ہے۔ خالد بشیر نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں اور تخلیقی کاوشوں سے اُردو شعروادب کے سرمائے میں جو اضافہ کیا ہے وہ قابلِ قدر بھی ہے اور لائق تحسین بھی۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اگرچہ افسانہ نگاری سے کیا لیکن بہت جلد وہ شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے ''صدائے نیم شب'' اور ''خواب پارہ'' شائع ہو

کرداد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔

خالد بشیر احمد کا پہلا شعری مجموعہ ''صدائے نیم شب'' مارچ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔اس کی دوسری اشاعت مارچ ۲۰۰۹ء میں عمل میں لائی گئی ہے۔اس کا ناشر بک مین پبلشرز،۲۹۴ نرسنگھ گڑھ، سرینگر ہے۔ ۸۸صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے کے اولین آٹھ صفحات اندرونی سرورق اور مختصر سے انتساب کی نذر ہوئے ہیں۔مجموعے کے صفحہ ۹ سے ۱۳ تک پروفیسر حامدیؔ کاشمیری کا لکھا ہوا فکر انگیز مقدمہ ہے۔صفحہ ۱۴ پر شاعر نے اپنے اس مجموعے کے بارے میں ''ایک بات'' عنوان کے تحت اظہارِ خیال کیا ہے۔اس کتاب کی کمپیوٹر کمپوزنگ اور سرورق کو احمد اور فیاض نے انجام دیا ہے۔

''صدائے نیم شب'' کے صفحہ ۱۵ پر مختصر سا پیش لفظ ہے جو کہ نہایت ہی دلچسپ اور معنی خیز ہے۔دراصل یہ پیش لفظ ایک آزاد نظم ہے جو شاعر کے خیالات اور جذبات کی ان الفاظ میں ترجمانی کرتی ہے۔

میں ازل سے
ایک ایسی زمین کی تلاش میں تھا
جہاں سورج کی سُلگتی ہوئی تمازت سے بچنے کے لیے
میں ایک شجر سایہ دار اُگا لیتا
میرے اس سفر میں
میرے ہمراہ
صرف ایک بے سردھڑ کا شخص تھا
جس کا بدن خوشبو
ورجس کا لمس احساس تھا

یہ شخص مجھے ایک اا یسے جزیرے تک لے آیا

جہاں کی زمین بڑی حساس اور نم تھی

زیر بحث شعری مجموعے کا صفحہ ۱۶ خالی ہے۔صفحہ ۱۷ سے ۶۵ تک ۴۹ غزلیں موجود ہیں جن میں ۲۶ پانچ اشعار کی، ۱۵ چار اشعار کی اور آٹھ غزلیں صرف تین اشعار کی ہیں صفحہ ۶۶ سے ۶۸ تک گیارہ متفرق اشعار ہیں اور صفحہ ۶۹ سے ۸۷ تک گیارہ آزاد اور نثری نظمیں ہیں۔صفحہ ۸۸ پر شاعر کی مختصر سی سوانح درج ہے۔صدائے نیم شب کو جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز کی طرف سے ۱۹۸۳ء میں سال کی بہترین اُردو کتاب کا ایوارڈ حاصل ہوا ہے۔

''خواب پارہ'' خالد بشیر احمد کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔اس مجموعے کی طباعت جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد دہلی کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔اس کا ناشر بھی بک مین پبلیشرز ۲۹۴، نر سنگھ گڑھ، سرینگر ہے۔اس کتاب کی کمپوٹر کموزنگ اور سرورق فیاض، ساجد اور زُہیب کے مرہونِ منت ہے۔

خالد بشیر کا یہ مجموعہ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔شروع کے سات صفحات اندرونی سرورق اور انتساب پر مشتمل ہیں۔خواب پارہ کا صفحہ آٹھ خالی ہے۔صفحہ ۹ اور ۱۰ پر دو حمد ہیں جس کے اشعار عشقِ الٰہی کے جذبات سے سرشار ہیں۔نموناً یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ پیاس دیتا ہے تو اس کے بعد پانی بھی

اسی یقین پر ہے میری خوش گمانی بھی

نہیں ہے اُس کے سوا لائقِ سجود کوئی

وہ لاشریک بھی، واحد بھی، غیر فانی بھی

☆

فرشِ زمین تا عالم بالا اللہ تعالیٰ آپ کا نام

سب سے ارفع سب سے اعلیٰ اللہ تعالیٰ آپ کا نام

صبح ازل سے شام ابد تک رہنے والی آپ کی ذات

اُس کے بعد بھی رہنے والا اللہ تعالیٰ آپ کا نام

خواب پارہ کے صفحہ ۱۱/ اور ۱۲/ پر دو نعتیں شامل اشاعت ہیں، ان میں سے ایک نعت کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

صورتِ حال ہے غم ناک، رسولِ عربیؐ

دامنِ صبر بھی صد چاک رسولِ عربی

داورِ حشر بھی بخشے تو سفارش پہ تیری

میرے اعمال شرمناک، رسولِ عربیؐ

خواب پارہ میں صفحہ ۱۳/ سے ۹۵ تک ۸۳ غزلیں ہیں جن میں سے ۳۶ کے پانچ، ۲۶ کے چار اور ۲۱ کے تین اشعار ہیں۔ صفحہ ۹۶ تا ۱۰۶ پانچ نظمیں ہیں اور صفحہ ۱۰۷ سے ۱۲۰ تک متفرق اشعار شامل ہیں۔ خالد کے دونوں مجموعوں میں ایک بھی شعر مقطع کا نہیں ہے۔

جہاں تک خالد بشیر کے ان شعری مجموعوں ''صدائے نیم شب'' اور ''خواب پارہ'' کا تعلق ہے، ان کے گہرے مطالعے کے بعد قاری اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ خالد بشیر ریاست جموں و کشمیر کے شعراء میں جدید حسیت اور عصری آگہی کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں عصر حاضر کے انسان کی نامرادیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ ساتھ جدید حسیت کا شدید احساس ملتا ہے اور احساس کی یہ شدت ان کی ذات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خالد نہ صرف اپنے عصری حالات سے پوری طرح آگہی رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنے عہد کی زندگی کے ایک ایک پہلو پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو

محسوس ہوتا ہے کہ وہ گردوپیش کی دنیا کا مشاہدہ اور نظارہ کر رہا ہے کیونکہ خالد بشیر نے اپنے عہد کے انسان کے درد و کرب کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ انہوں نے انسان کو طرح طرح کے مصائب اور مسائل سے نبرد آزما ہوتے دیکھا ہے۔ وہ خود جس سماج اور ماحول کا حصہ ہیں، اس کی اونچ نیچ، طبقاتی کشمکش اور سماجی نابرابری کا انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری ان کے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی غماز ہے۔ انہوں نے اس دنیا میں جس بات، واقعے اور حادثے کو، جس طرح محسوس کیا ہے، اسے شعری پیکر عطا کر کے من وعن پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

خالد بشیر کا پہلا شعری مجموعہ ''صدائے نیم شب'' اُن کے ابتدائی اڑھائی برس کی شاعری کا انتخاب ہے۔ یہ مجموعہ اگرچہ ان کے دورِ شباب کا ہے لیکن بقولِ پورن سنگھ ہنرؔ۔

> ''اس میں عشوہ وغمزہ و ادا، جبین و سنگ در، عارض و رُخسار، کاکل، شب رنگ، گیسوئے عنبریں، ہجر و وصال، قلق و اضطراب، حسرت وحرماں کا تذکرہ عنقاء و معدوم ہے۔'' ۳۷

''صدائے نیم وشب'' کے ہر صفحہ پر حسی تجربات کی ایسی انوکھی اور اچھوتی مثالیں موجود ہیں، جو خالد بشیر کے انفرادی رنگ وآہنگ کی غمازی کرتی ہیں۔

خالد بشیر کا دوسرا شعری مجموعہ ''خواب پارہ'' ان کی پچیس سال سے زائد کی زندگی کا ثمرہ ہے۔ زندگی کے ان پچیس برسوں میں شاعر جن کٹھنائیوں، مصیبتوں، ناکامیوں اور مشکلات سے روبرو ہوا ہے اس مجموعے میں ان کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ زندگی کی تلخیوں کے علاوہ اس میں گردونواح کی بے بسی اور بے کسی کے ماحول کی منہ بولتی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔

خالد بشیر کی شاعری جہاں ان کی عصری آگہی اور جہاں بینی کی عکاس وترجمان ہے وہاں وہ ان کے گہرے

اور مسلسل مشاہدات اور تجربات کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ حمد و نعت اور مناجات وغیرہ لکھ کر اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے کہ انہیں مذہب سے بھی گہرا شغف ہے، وہ خدا اور اس کے رسولؐ سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں اور ان کا دل عشق الٰہی اور عشق رسولؐ سے سرشار ہے۔ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام ''خواب پارہ'' کا آغاز ہی اس خوبصورت حمد سے ہوا ہے۔

وہ پیاس دیتا ہے تو اس کے بعد پانی بھی
اسی یقین پر ہے میری خوش گمانی بھی
اُسی کے حکم سے چلتی ہے جنگلوں میں ہوا
وہی جو دیتا ہے دریاؤں کو روانی بھی
یہ رنگ سارے اسی کے زمیں پر بکھرے ہیں
ہرا بھی، لال بھی، دھانی بھی، ارغوانی بھی
اسی کے نام سے کھلتے ہیں باب ذہنوں کے
اسی کی بخششیں الفاظ بھی، معانی بھی

خالد بشیر کے شعری مجموعے ''صدائے نیم شب'' اور ''خواب پارہ'' کے مطالعے کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جموں وکشمیر میں خالد بشیر کی شعری خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے کلام میں بے پناہ تازگی ہے۔ بقول فرید پربتی:

''خالد بشیر نئے فکر واحساس کے شاعر ہیں۔ ان کے لہجے، زبان اور طرزِ فکر میں زبردست تازہ کاری موجود ہے۔ ان کا لہجہ، زبان اور اسلوب اپنا ہے اور پہاڑی ندی کی طرح خالص اُنہوں نے عصری حقائق کو ذات کے حوالے سے منفرد پیرائے

میں بیان کیا ہے‘‘۔ ۳۸؎

انہوں نے اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لئے عمومی لب و لہجے سے ہٹ کر ایک ایسا لب ولہجہ اختیار کیا ہے، جو انہیں دوسرے شعراء سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ان کی شاعری کے کئی پہلو اور جہات ہیں۔ان کی شاعری میں بیان کی سچائی، زبان کی سادگی و شیرینی، جذبے کا خلوص، چونکا دینے والا اسلوب، معصوم سرگوشی کا انداز، اثر آفرینی، درد وکسک، شائستہ اور نکھرا ہوا شعور اور روایت اور جدت کا ایک حسین امتزاج ہے۔اردو ادب میں بالعموم اور ریاست کے حوالے سے بالخصوص ان کی شاعرانہ خدمات قابل ذکر ہیں۔ جموں وکشمیر کے حوالے سے جب بھی کوئی شعر وادب کی تاریخ تحریر کرے گا،اس کا مصنف خالد بشیر کی ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔خالد بشیر نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اُردو ادب کے سرمائے میں جو اضافہ کیا ہے،اس کے لئے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ترنم ریاض:۔ترنم ریاض کی پیدائش ۹ اگست ۱۹۶۳ء کو سری نگر میں ہوئی۔ان کے والد کا نام چودھری محمد اختر تھا۔کشمیر میں پیدائش ہونے کے سبب ان کی مادری زبان بھی کشمیری ہے۔اِس کے علاوہ اُردو، انگریزی، پنجابی اور پٹھانی پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۵ء میں ہوا، تب سے لے کر آج تک وہ مسلسل لکھ رہی ہیں۔وہ نہ صرف ایک شاعرہ ہیں بلکہ ایک اچھی افسانہ نگار، محقق، اور نقاد بھی ہیں۔ان کے شریکِ حیات پروفیسر ریاض پنجابی سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی، ایک باکمال عالم، مفکّر اور افسانہ نگار ہیں، جن کے افسانے وقتاً فوقتاً ماہنامہ شب خون (الہ آباد) سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ترنم ریاض نے جموں وکشمیر میں اکیسوی صدی میں اُردو فکشن کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کو بھی فروغ بخشا ہے۔

ترنم ریاض کی شاعری کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ ایک معتبر اور سنجیدہ دل کی آواز ہیں۔اپنے دل کے اندر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں جس میں نہ تصنع اور نہ اکہرا پن پایا جاتا ہے۔بلکہ نسوانی پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔انسانی جذبات واحسات کو ترنم ریاض نے غزلوں اور نظموں میں لطافت اور

شگفتگی کے ساتھ برتا ہے۔زندگی کی تمام پریشانیوں کو دیکھتی اور محسوس بھی کرتی ہیں اور اپنے جذبات واحساسات کوتمام طریقوں سے جانچتی بھی ہیں۔

ترنّم ریاض نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی چند نظمیں ''گھر''،''منظر''، ''بچپن''،''سمی الدّ عا''،اور''وجود''ہیں،جن میں وہ بڑے خوبصورت انداز سے اپنے خیالات قلم بند کرتی ہیں۔

ترنّم ریاض کی نظم'گھر'میں جس طرح کا انداز اپنایا گیا ہے اس سے گھر کی پوری حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔اس نظم میں گھر کے آنگن کا پورا ماحول آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ہر مرد و زن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوشی اور پیار و محبت سے زندگی بسر کرے۔ترنّم کا گھر اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے جس میں ایک طرف بلبلیں نغمہ خواں ہیں تو دوسری طرف پھولوں کی کیاریاں شادابی،شبنم کے قطرے ٹھنڈک اور ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔گویا شاعرہ نے جس گھر کا نقشہ تیار کیا ہے وہ عملی صورت میں اپنے تمام جمالیاتی پیکر لئے ایک حسین منظر کی صورت اس کے سامنے ہے جس میں رہتے ہوئے وہ کافی مطمئن نظر آتی ہیں۔

جہاں تک ترنّم ریاض نے عصری حالات میں منہدم ہوتی انسانی اقدار اور سفاکانہ قوتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے تو وہیں فطری طاقتوں کے آگے انسان کی بے بسی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اسے اپنی زندگی کی یادیں تڑپانے لگتی ہیں۔ترنّم نے ایک نظم''بچپن''میں سحر جگایا ہے۔نظم کا بند ملاحظہ ہو۔

چلا آ!

اے میرے بچپن

آجا لوٹ کر

باہوں میں میرے

لے کر وہ میری گڑیا

ہرانسان کی زندگی کے ساتھ بچپن کی کچھ یادیں ہمیشہ کے لئے جڑی ہوتی ہیں جنھیں وہ بار بار یاد کر کے اپنے بیتے ہوئے لمحوں کو یاد کرتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا وہ اسٹیج ہوتا ہے جسے بے فکری اور مستانگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان اگر لاکھ کوشش کرے وہ اپنے بچپن کے گزرے ہوئے دنوں کو بھلائے نہیں بھول سکتا۔ ترنم ریاض کی نظم بچپن ان کے لئے ایک تلخ یاد بن کر رہ گئی ہے۔ وہ بچپن کی طرف لوٹ جانے کی حسرت کرتی ہیں مگر زندگی کے کچھ ایسے اصول بھی ہیں کہ اگر کچھ چیزیں ایک بار چلی جائیں تو وہ لوٹ کر واپس نہیں آتیں چاہے اس کے لئے انسان لاکھ کوشش ہی کیوں نہ کرے۔ انسان دنیا میں تمناؤں اور آرزؤں کے سہارے زندگی گذارتا ہے۔ وہ اپنی آرزؤں کی تکمیل کی خاطر ہر ممکن کوشش کرتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان کی آرزوئیں پوری ہوں۔ کافی حد تک انسان کی اس جبلی خواہش میں اس کی امیدوں کا بھی دخل ضروری ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ ہر وقت حرکت میں رہتا ہے۔ ترنم ریاض کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ کبھی وہ ماضی کی حسین وادیوں میں کھونا چاہتی ہیں تاکہ پل بھر کے لئے سکون حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''منظر'' کے چند بند ملاحظہ ہوں کیجیے۔

نرم کمبل میں سمٹی

میں لیٹی رہوں

شب کا اک پہر

بند پلکوں پہ منظر کو دیکھا کروں

ترنم ریاض کی شاعری میں عورت کی زندگی کے کئی مسائل نظر آتے ہیں۔ وہ عورت ذات کی ہر وقت نمائندگی کرتی نظر آتی ہیں انھیں عورتوں کی عظمت اور خوبیوں کا احساس ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترنم ریاض نے جو بھی شاعری کی ۔اُس میں ایک عورت کے درد و کرب اور اضطراب کی شاعری کا عکس ملتا ہے۔ ان کی لکھی گئی اکثر غزلوں میں مایوس کُن حالات کی

عکاسی ملتی ہے اُن کی غزل کا ایک شعر دیکھئے۔

روح سے ٹپکے لہو آنکھ سے پانی برسے

میں نے سوچا ہی نہ تھا جاتے ہیں بچے گھر سے

شبنم عشائی:۔موجودہ دور میں ریاست جموں وکشمیر کی نمائندہ شاعرہ میں شبنم عشائی کا شمار بھی ہوتا ہے۔شبنم عشائی کی پیدائش کشمیر کے ایک قصبہ تاپرپٹن میں ایک جاگیردارانہ گھرانے میں ۱۲اپریل ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔شبنم عشائی بچپن سے ہی کافی ذہین تھیں آس پاس کے ماحول کے ساتھ ساتھ اپنے اردگِرد کے ماحول پر نظر دوڑائی تو پتہ چلا کہ زندگی تو کچھ بھی نہیں ہے۔اورسماج میں عورت ذات کو کس مقام پہ رکھا گیا ہے اس موضوع کے حوالے سے اُنھوں نے ''بیگانگی کے وجودی نظریہ'' پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اُن کا اوّلین شعری مجموعہ ''اکیلی'' جو ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔اور ۲۰۰۰ء میں اُن کی نظموں کا انتخاب ''میں سوچتی ہوں'' شائع ہوا ۲۰۰۲ء میں ان کی اردو ہندی رسم الخط میں نظمیں ''من مانی'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔اور جنوری ۲۰۰۸ء میں اُن کی نظموں کا ایک اور مجموعہ ''کتھارسس'' کے نام سے شائع ہوا۔شبنم عشائی کی شاعری میں کافی حدتک عارفہ کی شاعری کے عکس نظر آتے ہیں۔عورت ذات پر ظلم،اُس کی سسکیاں،دردوکرب کے عالم میں ہورہے تشدّد کے بارے میں شبنم عشائی نے جس طرح پیش کیا ہے۔اس طرح کا انداز ریاست کی شاعرات میں بہت کم ملتا ہے۔

شبنم کی شاعری ایک ایسی خاتون کی شاعری ہے جونسوانی جذبات واحساسات،دردوکرب،اورزندگی کے نشیب وفراز کا گہرا شعور رکھتی ہیں۔حسن وعشق اور زندگی کے اس سلسلے میں کیا کچھ باقی رہتا ہے اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں ہے اس سانحے کوانھوں نے اپنی نظموں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں اُن کی یہ نظمیں ملاخط کیجئے:۔

آدھی رات

کوئی میری زمین پر اُترتا ہے

روشنیاں بکھرتا ہے

جھلتی دھوپ میں

....

تجھے

دیکھ کے

یوں لگتا ہے

جیسے

چاند اُترا ہو

....

تمہاری

باہوں کے چھوٹے سے حصار میں

....

مجموعی طور پر شبنم عشائی نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنی پرُشکوہ لہجے میں کہیں تو مرد معاشرے کے مسائل کو پیش کیا ہے تو کہیں عورت ذات کو شعور اور آگہی کا درس بھی دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

پرویز مانوس:۔ نوجوان شعراء میں پرویز مانوس کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ پرویز مانوس کی شاعری میں زیادہ تر رومانی عشق و محبت اور محبوب جو کہ جیتا جاگتا وجود رکھتا ہے کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ یقیناً اس میں پرویز مانوس کی شاعرانہ طبیعت کے مختلف پہلوؤں کا دخل ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جدید پرستی جس میں سائنس سے وابستگی

اوراس کے ذریعے ترقی کے باوجود انسانی قدروں کی پامالی کا ذکر کیا گیا ہے۔ان کے خیال میں آج کے دور میں زیادہ ترتوجہ ترقی کی طرف ہے جبکہ زیادہ ترتوجہ معاشرے کی تہہ میں چھپے ہوئے مسائل کی طرف ہونی چاہیے۔

لٹتے ارمانوں کا مٹھی میں لیے مال ومتاع

ہم جہاں پھرتے ہیں، بازار لیے پھرتے ہیں

اُن کے اشعار میں معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات کے جذباتی تقاضوں پر سماجی تقاضوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔یہ احتجاج کہیں نرم لہجہ میں اور کہیں سخت انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔معاشرے میں زندگی بسر کر رہے افراد کی مصیبتوں،تکلیفوں اور رنجشوں سے بخوبی واقف ہیں۔اوراُن کے نفسیاتی پہلوؤں کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔

بہت غرور پروں پر ہے جس پرندے کو

تم اس کے سامنے اونچی اُڑان رکھ دینا

☆

چاند کو چھونے کی ضد نے بدنام کیا

ہم نے تیرے نقش بنائے شاخوں پر

اقبال فہیم جموں وکشمیر کے موجودہ دور کے ایک اور معروف شاعر ہیں،غزل اور نظم دونوں پر عبور رکھتے ہیں۔

عبدالقیوم ساغرؔ اقبال فہیم کے ہمعصر شاعر ہیں۔وہ بڑے خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں چند اشعار پیش ہیں۔

کوئی رومی کوئی حجازی ہے

اورکوئی مردِ غازی ہے

تو نے اغیار سے بھی پیار کیا

کیا تیری شانِ دل نوازی ہے

فرید پربتی:۔فرید پربتی نے بہت کم مدت میں اُردو شاعری میں اعلیٰ مقام پیدا کرلیا ہے۔اُن کے شعری مجموعے ''آب نسیاں''، ''فرید نامہ'' ۲۰۰۳ء، ''گفتگو چاند سے'' ۲۰۰۵ء، ''انتقاد و اصلاح'' ۲۰۰۵ء، ''ہزار امکان'' ۲۰۰۶ء، ''خبرِ تحیر''، ۲۰۰۷ء، ''ہجوم آئینہ'' ۲۰۱۰ء، اور ''ہزار امکاں'' ۲۰۱۱ء، (کلیات) جدید حیثیت اور عصری آگہی کے مظہر ہیں۔

فرید پربتی کی شعری جمالیات کا محور کشمیر سے محبت ہے۔شاعر ایک حساس فرد ہوتا ہے جو سماج کے شاد و ناشاد اور دُکھ درد کو محسوس کر کے ان کا برملا اظہار کرتا ہے بلکہ اپنے عہد کی پوری تاریخ اپنے فن پارے میں سمو دیتا ہے۔فرید پربتی نے بھی لوگوں کی بے چارگی، داماندگی اور خودغرض عناصر کا استحصال، اذیت اور جبر وتشدد کو بڑے قریب سے دیکھا جس کی وجہ سے ان کے ضمیر نے انھیں لب بستہ نہیں رہنے دیا۔انہوں نے ان تمام حالات و کوائف اور بدامنی کی زندگی کی مختلف کیفیتوں کو اپنے تجربے اور مشاہدے کی بھٹی میں تپا کر شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ان کی شاعری میں وجودی کا کرب یا اظہارِ ذات کا رشتہ ہی نہیں بلکہ ان کا رشتہ قوم کے مستقبل سے جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔فرید پربتی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے بڑی متوازن رائے کا اظہار کیا ہے۔

> ''فرید پربتی ہمارے اُن شاعروں میں ہیں جو شعری روایت سے نہ صرف واقفیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ہماری کلاسیکی شاعری اور بوطیقا سے حسب توفیق استفادہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ سراسر روایت ہرستی ہے اور نہ روایت گذیدگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جمالیاتی شعری آگہی کے ساتھ اُنہوں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ملک کی عام تہذیبی، روحانی اور انسانی روایات واقدار کا بھی گہرا عرفان حاصل کیا ہے''۔۳۹

فرید پربتی کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد پروفیسر محمد نورالدین اس طرح رقمطراز ہیں۔

> ''ان کی شاعری میں ایک خاص دروبست، جماؤ اور رچاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ جس کے پس پردہ طبیعت کی خداداد موزونیت کے علاوہ برسوں کی مشق و مزاولت اور محنت و ریاضت کارفرما ہے۔ فرید پربتی ایک خوش فکر، خوش گو اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ انھیں شاعری کی مختلف اصناف مثلاً غزل، نظم، رباعی، قطعات وغیرہ کی تخلیق میں استادانہ مہارت حاصل ہے''۔[۴۰]

مذکورہ بالا آراء سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فرید پربتی ایک حساس اور دیدہ ور شاعر تھے۔ اُن کی شاعری اپنے معاصرین کی شاعری سے اپنے شعور و احساس، فکری زاویے، لسانی رویے، سماجی سیاق اور خارجی پسِ منظر کے حوالے سے ندرت و انفرادیت کی حامل ہے۔ ان کے چیدہ چیدہ اشعار درج ذیل ہیں۔

؎ رونق یہ میرے شہر کی اب لے گیا ہے کون ؟
ایک اک سڑک خموش ہے ایک اک دکان بند

☆

؎ اس درجہ گھٹ گیا ہے مکینوں میں اعتماد
کرتے ہیں شام ہونے سے پہلے مکان بند

☆

؎ اب اسی شہر میں کرتا ہوں طلب جائے اماں
لوگ جس شہر سے جان اپنی بچا کر نکلے

☆

ؔاس درجہ بڑھے نقلِ مکانی کے یہاں شغل
تعمیر کہیں پر بھی مکاں کر نہیں پائے

☆

ؔتاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرقد کا دیا بن کے میں جلتا ہوں اکیلا

☆

ؔدوش ہوا پہ کاغذِ آتش زدہ ہوں میں
خاشاکِ صبح وشام پہ رقصاں نہ رکھ مجھے

☆

ؔتنہا ہوں چار سمت ہے یلغارِ تیرگی
میں اِک چراغ ہوں تہہِ داماں نہ رکھ مجھے

☆

ؔ گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا مجھ سا دکھی ہے گھر میں کون
چھت پر چڑھ کر میں نے دیکھا لگی ہوئی گھر گھر آگ

☆

ؔپہلے پوچھا جو نہیں تھا وہی سب پوچھتی ہے
زندگی رات سے جینے کا سبب پوچھتی ہے

☆

؎قدم قدم پہ بکھرتا ہوں ٹوٹ جاتا ہوں
نہ راس آتا ہے مجھ کو ذرا یہ دور نیا

☆

؎اُداسیوں کے پرندے مُنڈیر پر رکھ کر
خموشیوں کے شجر صحن میں اڑا کے گیا

☆

؎تجھ کو کیا دوں گا نہ خوشبو ہے نہ شبنم ہے نہ رنگ
میرے دامن میں بجز موجِ ہوا کچھ بھی نہیں

فرؔید پربتی نے جہاں غزل میں مہارت حاصل کی وہیں رباعی کے فن میں بھی کمال دیکھایا ہے بقول یوسف ٹینگ :

''رباعی اُن کے مزاج کو راس آتی ہے اور وہ اس سنگ صفت صنف کو پگھلانے اور اسے اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں''۔ ۴۱؎

مجموعی طور پر یہ کہ ادب کی جن برگزیدہ شخصیتوں نے ان کے فکر و فن کو سراہا ہے، ان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر ابنِ کنول، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر زماں آزردؔہ، پورفیسر جاوید قدوسؔ، جیسے نامور ادیب اور نقاد شامل ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی ،فرؔید پربتی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''فرؔید پربتی کے اندر نظم و نثر کی صلاحیتیں غیر معمولی ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ قدر ہے کہ فرؔید پربتی مشکل اصناف اور علمی و ادبی مسائل سے گہرا شغف رکھتے ہیں''۔ ۴۲؎

فرید پربتی کی رباعیات کے مجموعے ''فرید نامہ'' پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ابرار رحمانی رقم طراز ہیں۔

''ویسے تو فرید پربتی بنیادی طور پر غزلوں پر بھی دسترس رکھتے ہیں اور ''اثبات'' کی غزلوں سے ان کی شناخت قائم ہوئی لیکن میری نظر میں ان کا اصل میدان رباعی ہے'' ۴۳

فرید پربتی کی رباعیات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

برباد ہوا صحنِ چمن، رقص میں ہوں
ویرانہ بنا اپنا وطن، رقص میں ہوں
باقی نہیں ارتباط روح اور تن میں
رہ بر ہے بشکلِ راہ زن، رقص میں ہوں

☆

بڑھتا ہے اب احساسِ زیاں روز بروز
جلتا ہے اِک آسودہ مکاں روز بروز
بدلا ہے چمن، بدلا ہے گلچیں کا مزاج
خوابوں کا یاں اُڑتا ہے دھواں روز بروز

☆

خود کو میں رکھوں اوروں کے بس میں کب تک
غیروں کو بناؤ ہم نفس کب تک
جس میں کوئی کھڑکی ہے نہ دروازہ کوئی

میں قیدر ہوں اُس اک قفس میں کب تک

☆

نا دیدہ مقامات دیکھاتا ہے کوئی
ہوں اصل میں ہی، یہی بتاتا ہے کوئی
تُو تُو کا پڑھا میں نے وظیفہ اک عمر
میں میں کا سبق مجھے پڑھاتا ہے کوئی

فریدؔ پربتی کی شاعری کے اس مختصر سے مطالعہ سے اتنی بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ حقائقِ زندگی سے پوری طرح واقف تھے۔حقیقت نگاری، زبان کی سادگی، وسیع النظر، بلند خیالی، فراخ دلی ان کی اہم خصوصیات ہیں۔ان کے کلام میں اعلیٰ انسانی قدروں کی حلاوت موجود ہے۔وہ شاعری میں فنی اور جمالیاتی اقدار کی قدرو قیمت سے نہ صرف یہ کہ کماحقہ واقف ہیں بلکہ ان اوصاف سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔

پریمی رومانی:۔ کا شمار جموں وکشمیر کے جدید شعراء میں ہوتا ہے، آپ کا تعلق کے ایک علمی و ادبی خاندان سے ہے۔اُن کا مجموعہ ''سنگِ میل'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ان کا اصل میدان اگر چہ ادبی تنقید ہے اس کے باوجود پچھلے چند سالوں سے اُنہوں نے کافی منفرد غزلیں اور نظمیں پیش کی ہیں۔اُن کی غزلوں میں منفرد لفظیات اور زبردست تنوع پایا جاتا ہے اور ان کی نظموں میں فنی رچاؤ اور بے پناہ تخلیقیت موجود ہے۔ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ آئینہ دیکھتا ہے مجھے آئینے کو میں
یوں عکس عکس ٹوٹ گیا ہوں غلط نہیں

☆

ہر تیّ ہر اک رات کے سر پہ ہے اک رات
سورج ہے وہ سراب کہ جس کا نہیں زوال

☆

میں رہا ہوں عمر بھر خود سے جُدا
مجھ سے سایہ بھی مرا بچ کر چلا

☆

سائے کو میرے دیکھ کے یہ مان لیں گے آپ
میں آپ اپنے قد سے بڑا ہوں غلط نہیں

☆

تنہائیوں کے گھر میں رہا ہوں تمام عمر
میں کس لئے جہاں میں جیا ہوں تمام عمر

مذکورہ شعراء کے علاوہ جموں وکشمیر کی شعری فضا کئی منفرد ناموں سے معمور ہے جن کے یہاں تازہ کاری اور بھرپور امکانات موجود ہیں۔ جن میں شاہباز راجوروی، جاوید آذر، لیاقت جعفری، شوکت شفائی، حیات عامر، رفیق ہمراز، سجاد حسین، فدا راجوروی، سجاد پونچھی، جان محمد آزاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مجموعی طور پر ریاست میں اکیسوی صدی میں اُردو شاعری کے اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کی تاریخ میں جموں وکشمیر میں اُردو شعراء کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے۔ جو اس وقت اپنا ادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان شعراء کی شاعری کا دائرہ جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم وفنون کی بدولت کافی وسیع ہے اور وہ پوری محنت ولگن سے اپنے تخلیقی سفر میں مصروف ہیں۔ آئے دن کسی نہ کسی کا شعری مجموعہ منظر عام پر آتا رہتا ہے جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست جموں و

کشمیر میں اُردو شاعری کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ محمود احمد شیرانی، حافظ: مقالات حافظ محمود احمد شیرانی، بحوالہ حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو، ص ۲۰۷، اردو بازار لاہور

۲۔ سروری عبدالقادر: کشمیر میں اردو (حصہ سوم)، ص ۲۸۳، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز، سرینگر ۱۹۸۴ء

۳۔ ایضاً۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۲۸۲

۴۔ ایضا۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۲۹۱، 292

۵۔ برج کشن بے خبر پنڈت: بہار گلشن کشمیر، ص ۲۸۴، انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۲ء

۶۔ عبدالقادر سروری، پروفیسر: کشمیر میں اردو (حصہ دوم)، ص ۴۲، جے کے آفسٹ پرنٹرس دہلی، ۱۹۸۴ء

۷۔ ناظر، غلام نبی: کشمیر میں اردو شاعری کے پچاس سال، شیرازہ نمبر، ص ۱۱۲، سال اشاعت ۱۹۹۸ء

۸۔ آزاد، عبدالاحد: کشمیری زبان اور اردو شاعری (حصہ سوم)، ص ۲۷۵ء، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز، سری نگر ۱۹۸۴ء

۹۔ سروری، عبدالقادر: کشمیر میں اردو (حصہ اول)، ص ۱۲، ۱۳، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز، سرینگر ۱۹۸۴ء

۱۰۔ ایضا۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔ص ۱۴

۱۱۔ ایضاً۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔ص ۳۰۔۳۱

۱۲۔ تنویر، محمد الیاس: رسا بحیثیت غزل گو شاعر، شیرازہ، ص ۴۰، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز، سرینگر، ۱۹۷۹ء

۱۳۔ بانڈے، محمد دین: پونچھ تاریخ کے آئینے میں، ص ۱۸، شیخ عثمان اینڈ سنز گاؤ کدل سرینگر، ۱۹۹۱ء

۱۴۔ اسیر، ولی محمد کشتواڑی: ضلع ڈودہ کی ادبی شناخت، ص ۲۲۱، سال اشاعت ۱۹۹۸ء

۱۵۔ سروری، عبدالقادر: کشمیر میں اردو (حصہ دوم)، ص۳۸۵، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز، سرینگر۱۹۸۲ء

۱۶۔ نشاطؔ، کشتواڑی: میر غلام رسول نازکی کی حیات اور شاعری، شیرازہ نمبر، میر غلام رسول نازکی نمبر، ص۳۳

۱۷۔ نازکی، میر غلام حسین: متاعِ فقیر، مقدمہ از حامدی کاشمیری، ص۱۱، سال اشاعت۱۹۹۲ء

۱۸۔ ظہورالدین، پروفیسر: میر غلام رسول نازکی میری نظر میں، شیرازہ، میر غلام رسول نازکی نمبر، ص۲۶، سرینگر۔

۱۹۔ اسیرؔ، ولی محمد کشتواڑی: ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت، ص۲۳۴، سال اشاعت، ۱۹۹۸ء

۲۰۔ مجید مضمر، پروفیسر: مضمون، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، جلد۴۵، ص ۱۲۶، سال اشاعت، ۲۰۰۰ء

۲۱۔ مظہرامام، پروفیسر: مضمون، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، جلد۴۵، ص۳۰، سال اشاعت، ۲۰۰۰ء

۲۲۔ محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر: بحوالہ، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، جلد۴۵، ص۳۵، سال اشاعت، ۲۰۰۰ء

۲۳۔ مظہرامام پروفیسر: بحوالہ، مضمون، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، جلد۴۵، ص۳۶، سال اشاعت، ۲۰۰۰ء

۲۴۔ حامدی کاشمیری، پروفیسر: شاخِ زعفران، ص۱۳، جے کے آفسٹ پرنٹرس دہلی، ۱۹۹۱ء

۲۵۔ مظہرامام، پروفیسر: مضمون، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، جلد۴۵، ص۴۱، سال اشاعت، ۲۰۰۰ء

۲۶۔ بلراج کومل: تبصرہ، شاخ زعفران، ص۴، جے کے آفسٹ پرنٹرس دہلی، ۱۹۹۱ء

۲۷۔ مظہرامام پروفیسر: مضمون، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، ص۳۹، سرینگر،

۲۸۔ برج پریمی ڈاکٹر: جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما، ص۱۹۸، دیپ پبلیکشنز، نئی پورہ، سرینگر۱۹۹۲ء

۲۹۔ فاروقی، شمس الرحمٰن: بحوالہ، رفیق راز ''انہار'' فلیپ پر درج رائے، ۱۹۹۸ء

۳۰۔ حامدی کاشمیری، پروفیسر: بحوالہ، رفیق راز ''انہار''، فلیپ پر درج رائے، ۱۹۹۸ء

۳۱۔ نازکی، فاروق: تعارف مشمولہ ''شام سے پہلے''، ص۶۔۵

۳۲۔ سید عقیل رضوی: بحولہ: معاصر اُردو غزل، ص۵۶، ناشر، معیار پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۰۶ء

۳۳۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۳۴۔ جاوید انور: مضمون، احمد شناس کی غزلیں، مطبوعہ ''تحریک ادب''، ص ۵۶، ناشر، جاوید نور وارانسی، ۲۰۱۱ء

۳۵۔ محمد یوسف ٹینگ: پیش آشکار، ص ۹، محمد یوسف ٹینگ جوہر نگر سرینگر، ۱۹۸۸ء

۳۶۔ نصرت آرا چودھری، پروفیسر: ہتھیلی کا چاند، پیش لفظ، سیمانت پرکاش نئی دہلی، ۲۰۰۴ء

۳۷۔ فرید پربتی: مضمون، مطبوعہ، ترسیل، شمارہ نمبر ۹، ص ۱۳۷، سال اشاعت، ۲۰۱۱ء

۳۸۔ یہ اقتباس پورن سنگھ ہنر کے غیر مطبوعہ مضمون سے ماخوذ ہے۔

۳۹۔ فرید پربتی: مضمون، مطبوعہ، ترسیل، شمارہ نمبر ۹، ص ۱۳۷، سال اشاعت ۲۰۱۱ء،

۴۰۔ قاضی عبید الرحمن ہاشمی، پروفیسر: مضمون، شیرازہ، فرید پربتی نمبر، جلد ۴۹، ص ۱۲

۴۱۔ محمد نور الدین، پروفیسر: مضمون، شیرازہ، فرید پربتی، نمبر جلد ۴۹، ص ۲۷

۴۲۔ جاوید احمد ڈار: بحوالہ، مضمون، شیرازہ، فرید پربتی، نمبر جلد ۴۹، ص ۹۴

۴۳۔ محمد نور الدین، پروفیسر: مضمون، شیرازہ، فرید پربتی، نمبر ۴۹، ص ۲۷

☆☆☆☆☆

باب پنجم

1950 کے بعد جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا مزاج و معیار ایک جائزہ

۱۹۵۰ء کے بعد جموں و کشمیر میں اُردو صحافت کے مزاج و معیار کا تنقیدی جائزہ

صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔کسی بھی سماج میں سب سے نمایاں مقام اور ادب کی بنیادی اہمیت ہے۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو عمدہ صحافت اور ادب میں بس رویے کا ہی فرق ہوتا ہے۔صحافت سماج کے خارجی واقعات و حادثات کے معروضی اظہار سے عبارت ہے اور ادب سماج کی داخلی واردات و کیفیات کے بیان سے،اگر صحافت میں داخلیت یا جمالیاتی عناصر کا غلبہ ہو جائے تو وہ صحافت کے عام معنوی دائرے سے باہر ہو جاتی ہے اور ادب کے منصب کے قریب پہنچ جاتی ہے۔اسی طرح اگر ادب میں خارجیت حد سے بڑھ جائے تو ادب اپنے منصب سے ہٹ کر صحافت سے قریب ہو جاتی ہے۔صحافت ادب کیونکر بنتی ہے اس کا اندازہ ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں شامل تحریروں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ریاست جموں و کشمیر میں ادب نما صحافتی تحریروں کی مثالیں شمیم احمد شمیم کے ''آئینہ'' میں شامل تحریروں میں مل جائیں گی۔اسی طرح ادب اپنے منصب سے ہٹ کر صحافت کیسے بنتا ہے اس کی مثالیں ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں وافر مقدار میں موجود ہیں۔جب کسی معاشرہ میں طے شدہ مقصد اور نصب العین کے تحت ادب لکھا جاتا ہے،صحافت کی جاتی ہے تو اکثر ادب اور صحافت کے مروجہ اصول و شرائط کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔

گذشتہ ابواب میں ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان،شاعری،اُردو افسانہ،ناول اور ڈرامہ وغیرہ کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح ریاست جموں و کشمیر کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے مسائل کو اخبارات

کے ذریعے اپنی شاعری افسانوں اور مضامیں میں پیش کیا۔اوراس ضمن میں انھوں نے ادب کے لیے لازمی تخلیقی اور جمالیاتی قدروں سے بھی بعض اوقات بے اعتنائی برتی ۔لیکن مقصد اور منزل کے حوالے سے ادب کے ان نمونوں کی بھی اہمیت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔حقیقت تو یہ ہے کہ ہنگامی حالات میں ادب کے مقابلے میں صحافت، عوامی مسائل ،حقائق ، جذبات اور خواہشات کے اظہار اوران کی رہنمائی کا فریضہ زیادہ ایمانداری کے ساتھ انجام دیتی ہے ۔ کیونکہ ایمانداری اور غیر جابنداری صحافت کی بنیادی شرائط ہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ کہیں ذاتی مفادات، کہیں نظریات اور کہیں مذہبی تعصّبات کی بنا پر اکثر صحافت اپنے اس منصب کی خلاف ورزی بھی کرتی ہے ۔کشمیر کے حوالے سے ریاستی اور ملکی صحافت میں اس کی مثالیں بھری پڑی ہیں ۔ چنانچہ جب ہم ریاست جموں و کشمیر میں اُردو کے فروغ وارتقا میں اُردو صحافت کے رول کا جائزہ لیتے ہیں ۔اس سلسلے میں اردو صحافت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ ریاست میں اردو صحافت کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے سے پہلے ریاست میں اردو صحافت کی تاریخ سے جانکاری بھی ضروری ہے ۔جس سے یہ معلوم ہوتا ہے ابتدا سے ہی ریاست جموں و کشمیر کے اُردو اخبارات نے عوامی مسائل وحقائق کے حوالے سے مثبت کردار بھی ادا کئے ہیں اور منفی بھی ۔بعض اخبارات نے کھل کر ریاست کی تحریک آزادی میں عوام کی حمایت اور حکمراں طبقے کی مخالفت کی ۔ وہیں ایسے اخبارات کی بھی کمی نہیں تھی جنھوں نے حکمراں طبقہ کی حمایت اور عوام کی مخالفت میں کوئی کمی نہ رکھی ۔آزادی کے دنوں میں اُردو اخبارات کی ضرورت اور کردار کا نقشہ ریاست جموں و کشمیر میں آزادی کے نقیب شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سوانح عمری ''آتش چنار'' میں اس طرح کھینچا ہے:

> ''ہم نے اپنی آواز بلند کرنے کی ضرورت کو اور زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کر ڈالا ۔لیکن سوال یہ تھا کہ اس آواز کی نشر و اشاعت کے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں ۔اس زمانے میں تحریر و تقریر کی آزادی ایک خیالی چیز کے برابر

تھی۔ریاست سے مسلمانوں کا کوئی اخبار شائع نہ ہوتا تھا۔البتہ جموں سے ایک ہندو اخبار ''رنبیر'' چھپتا تھا جو مہاراجا کی قصیدہ خوانی اوراس کے ظالمانہ نظام کی تعریف کر کے اپنے وجود کو قائم رکھنے کی سعی کرتا رہتا تھا۔اس کے علاوہ لاہور سے ''ملاپ''،''پرتاپ''،''ٹریبیون''اور کچھ دوسرے ہندو اخبارات ریاست کے ہندو مہاراجہ اور ہندو مفادات کی حفاظت کے لیے ان کے جائز ناجائز اقدامات کی حمایت میں پیش پیش رہتے تھے۔ لاہور سے کچھ ایسے اخبارات بھی ضرور شائع ہوتے تھے جن کے مدیر مسلمان تھے لیکن اگر وہ دربار کشمیر کے خلاف ذرا سا منہ کھولتے توان کا ریاست میں فوراً داخلہ بند کر دیا جاتا۔ایک کشمیری نژاد بزرگ محمدالدین فوقؔ جنھوں نے بعد میں کشمیر کے بارے میں بہت سی تاریخی کتابیں لکھنے کے سلسلے میں خاصا نام کمایا ایک ہفتہ وار اخبار لاہور سے ہی نکالا کرتے تھے۔جو کبھی کبھی نحیف سی آواز میں کشمیری مسلمانوں کی شکایات کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کراتا رہتا تھا''۔(۱)

اس اقتباس سے دو سوال ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ جموں وکشمیر سے اُردو اخبارات کیوں نہیں شائع ہوتے تھے۔؟

۲۔ جموں وکشمیر سے کسی مسلمان کو اخبار جاری کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی گئی۔؟

ان دونوں سوالوں کا صرف ایک ہی جواب یہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں نے دنیا کو کشمیری عوام کی شرمناک اقتصادی بدحالی سے بے خبر رکھنے اور حکومت کے خلاف وقتاً فوقتاً اُٹھنے والی آوازوں کو

پھیلنے سے روکنے کے لیے اظہار خیال پر ہر طرح کی پابندی عائد کر رکھی تھی۔ ڈوگرہ حکمراں یہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ ان کے مظالم، جبر اور زیادتیوں سے کشمیر کے اندر اور باہر عام لوگوں کی واقفیت ہو۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں تحریک آزادی کشمیر کے باضابطہ آغاز سے قبل ہی حکمراں طبقہ نے ہر اُن اقدامات کی، پیدائش سے پہلے ہی گلا گھونٹ دینے کی پالیسی اپنائی جن اقدامات سے عوام متحد ہو کر حکومت کے خلاف صف آرا ہو سکتے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ کی ان عوام دُشمن پالیسیوں سے دِل برداشتہ ہو کر اس وقت (۲۹۔۱۹۲۸ء) ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعظم سر ایلبین بنر جی نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اور لاہور میں اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے کشمیر کی ناگفتہ بہہ صورت حال اور حکمراں طبقہ کی بے انصافیوں کے بارے میں واضح لفظوں میں کہا ہے:

> ''جموں وکشمیر کی ریاست بہت سی ناانصافیوں کا شکار ہے۔ اس ریاست کی بڑی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ جو قطعی طور پر ناخواندہ ہیں۔ یہ لوگ غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور انھیں بالکل اندھے اور گونگے مویشیوں کی طرح ہانکا جاتا ہے۔ حکومت اور عوام کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی شکایات کا ازالہ کرنے کے لیے کسی قسم کا موقع فراہم کیا جاتا ہے.... ریاست میں رائے عامہ کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا ہے۔ اخبارات تقریباً مفقود ہیں۔ عوام کی شرمناک اقتصادی بدحالی ریاست کے تمام مصائب کی جڑ ہے۔ اگر چہ لوگ بڑے سمجھدار اور اچھے ہیں۔ لیکن انھیں زندگی کا کوئی سکھ نہیں ملتا''۔ (۲)

یہ بیان ۱۵ مارچ ۱۹۲۹ء کے انگریزی اخبارت میں شائع ہوا۔ اس بیان کے اقتباسات ملک کے دیگر حصوں میں نکلنے والے اخبارات میں شائع ہوئے۔ جس کے نتیجے میں ریاست جموں وکشمیر کے متعدد ادیبوں اور دانشوروں

نے ریاست کے جموں اور کشمیر علاقوں سے اخبار جاری کرنے کے لیے مہاراجہ ہری سنگھ کی خدمت میں درخواستیں دیں لیکن ان کی درخواستیں منظور نہیں کی گئیں۔ درخواست دینے والوں میں محمد الدین فوقؔ، سالک رام سالکؔ اور ملک راج صرافؔ شامل تھے۔ چونکہ ملک راج صرافؔ کی رسائی مہاراجہ ہری سنگھ تک تھی۔ اس لیے ۱۹۲۴ء میں انھیں اخبار جاری کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اور صرافؔ نے ۱۹۲۴ء میں رنبیر کے نام سے ایک اخبار جموں سے جاری کیا تھا۔ اس باب کے آغاز میں شیخ محمد عبداللہ کے اقتباس کے حوالے سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ ''رنبیر'' ایک متعصب اخبار تھا اور ''آزادی'' کے حوالے سے راجہ ہری سنگھ کی عوام دُشمن پالیسیوں کی حمایت کر کے ڈوگرہ راج سے مراعات حاصل کرنا ہی اس کا مقصد تھا۔ اس کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں جب ۱۹۳۱ء میں آزادی کی تحریک باضابطہ طور پر شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں مسلم کانفرنس/نیشنل کانفرنس کے پرچم تلے شروع ہوئی تو کئی اور اخبارات جموں اور سرینگر سے جاری ہوئے۔ لیکن ان اخبارات نے ریاست جموں وکشمیر کی تحریک آزادی میں کون سا کردار ادا کیا اس کا جائزہ لینے سے پہلے کشمیری ادیبوں اور دانشوروں کے ذریعے متحدہ ہندوستان کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات کی فہرست پر ایک نظر ڈالی جائے۔ یہ فہرست ڈاکٹر برج پریمی نے اپنی کتاب ''جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما'' میں درج کی ہے۔ فہرست اس طرح ہے:

۱۔	''مراسلہ کشمیر	لاہور	۱۸۷۲ء
۲۔	اخبار عام	لاہور	۱۸۸۱ء
۳۔	خیر خواہ کشمیر	لاہور	۱۸۸۲ء
۴۔	ہمدردِ ہند	لاہور	۱۸۹۴ء
۵۔	کشمیر درپن	اِلہٰ آباد	۱۸۹۸ء
۶۔	رسالہ کشمیر پرکاش	لاہور	۱۸۹۸ء

۷۔	کشمیری پرکاش	لاہور	۱۸۹۸ء
۸۔	پنجۂ فولاد	لاہور	۱۹۰۱ء
۹۔	کشمیر گزٹ	لاہور	۱۹۰۱ء
۱۰۔	کشمیر میگزین	لاہور	۱۹۰۱ء
۱۱۔	کشمیر مخزن	لاہور	۱۹۰۵ء
۱۲۔	کشمیر میگزین	لاہور	۱۹۰۶ء
۱۳۔	سفیر	لاہور	۱۹۱۴ء
۱۴۔	صبح کشمیر	لاہور	۱۹۱۶ء
۱۵۔	بہار کشمیر	لاہور	۱۹۱۶ء
۱۶۔	کشمیر	امرت سر	۱۹۲۴ء'' ۔۔۔(۳)

اس فہرست سے صاف ظاہر ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے صحافیوں نے اُردو کے اخبارات تو جاری کئے لیکن ریاست سے باہر جا کر۔ کیونکہ انھیں ریاست میں اخبارات کی نشر واشاعت کی اجازت نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ ریاست جموں وکشمیر میں مطبوعہ صحافت کا آغاز اُنیسویں صدی کے وسط کے بعد سے ہی ہوتا ہے۔لیکن اس سے قبل بھی ریاست میں مطبوعہ صحافت کی ایک شکل موجود تھی ۔اس کے بارے میں گر بچن چندن نے اپنی کتاب ''اُردو صحافت کا سفر'' میں لکھا ہے:

''.....ریاست کے بادشاہوں کے نظام میں وقائع نویسی کے لیے باقاعدہ عملہ ہوا کرتا تھا جو بڑی سرگرمی سے وقائع فراہم کرتا تھا۔ یہ وقائع نگار سلطنت کے مختلف علاقوں کے حالات رقم کرتے تھے اور اپنی قلمی رپورٹیں

جنھیں ''اخبار'' کہا جاتا تھا۔ بادشاہ کو مہیا کرتے تھے۔ ان کے مرتب کئے

ہوئے ''اخبار'' دربار کے اندرونی حلقوں میں تو گشت کرتے تھے لیکن عوام

کی دسترس سے باہر ہوتے تھے۔ ان کا مقصد صرف بادشاہوں کو اپنی

سلطنت کے حالات سے باخبر رکھنا ہوتا تھا..... جموں و کشمیر کی ریاست

اُنیسویں صدی میں وجود میں آئی اس کے جموں کے حصے کا قیام ۱۸۲۰ء

میں اور اس میں کشمیر لداخ و گلگت کا شمول ۱۸۴۶ء میں ہوا۔ پہلا چھاپہ

خانہ ۱۸۵۸ء میں ڈوگرہ حکومت کے زیر اہتمام قائم ہوا۔ یہ پریس جس

میں فارسی اور دیوناگری حروف میں طباعت کا انتظام تھا..... جموں میں

تھا یہاں فارسی اور سنسکرت کے علاوہ اُردو میں بھی کچھ سرکاری فارم اور

دستاویزات چھپتے تھے''۔ (۴)

گذشتہ ابواب میں ذکر ہو چکا ہے کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں علوم وفنون کی ترقی کی جانب توجہ دی گئی۔ رنبیر سنگھ نے ایک انجمن (ودیا بلاس سبھا) قائم کی جس کا مقصد عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کی مفید علمی و ادبی کتابوں کا اُردو اور ہندی میں ترجمہ کرنا اور ان کے بارے میں تنقیدی و تاریخی نکات پر غور و فکر کو وسعت دینا تھا۔ چند سال بعد جموں میں بدیا بلاس پریس اور سرینگر (کشمیر) میں سالگ رام پریس کے ناموں سے دو الگ الگ پریس قائم ہوئے۔ ان دونوں میں اُردو کی طباعت کا انتظام تھا۔ گربچن چندن کے مطابق:

''جموں کے اس پریس سے ۱۸۶۷ء میں 'بدیا بلاس' ہی کے نام سے

ریاست (جموں وکشمیر) کا سب سے پہلا مطبوعہ اخبار جاری ہوا یہ ایک

ہفت روزہ تھا جس کے دائیں کالم میں اُردو اور بائیں کالم میں ہندی میں

مواد شائع ہوتا تھا۔اس اخبار کی صحافت آٹھ ضخامت تھی‘‘۔(۵)

’’بدیا بلاس‘‘ جموں کا ذکر اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی نے اپنی تالیف ’’اختر شاہنشاہی‘‘ میں بھی کیا ہے۔سید محمد نقوی اخبار’’اختر ہند‘‘ کے اڈیٹر اور اختر پریس لکھنؤ کے مالک تھے۔اختر شاہنشاہی جون ۱۸۹۶ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔اور اسے اُردو اخبارات کی اولین تاریخ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اختر شاہنشاہی میں سرینگر کشمیر سے شائع ہونے والے پہلے اُردو اخبار’’تحفہ کشمیر‘‘ کا بھی ذکر ہے۔’’تحفہ کشمیر‘‘ ۱۸۷۶ء میں منشی جمنا پرشاد کی ادارت میں جاری ہوا۔اس کے مالک ہرسکھ رائے تھے۔لیکن ’’تحفہ کشمیر‘‘ کے اجراسے قبل مہاراجہ رنبیر سنگھ کے محکمہ تعلیم نے بھی ’’دھرم درپن‘‘ کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا تھا جو اپنے نام کی مناسبت سے ایک مذہبی رسالہ تھا اور جسے اخبار کہنا مشکل ہے۔اس کے بعد ۱۸۸۴ء میں ایک سرکاری افسر نے سرینگر سے ’’جموں گزٹ‘‘ کے نام سے ایک رسالہ نکالا لیکن اس میں چونکہ ڈوگرہ راج کے حوالے سے معلومات پیش کی جاتی تھیں۔عوامی دِلچسپی کی خبریں نہیں ہوتی تھیں۔اس لیے اسے اصطلاحی معنوں میں ’’اخبار‘‘ (News Paper) کی بجائے ’’سرکاری گزٹ‘‘ ہی کہنا بہتر ہوگا۔

اُنیسویں صدی کے اخیر تک آکر ہندوستان کے اکثر و بیشتر شہروں میں سرکاری اور غیر سرکاری چھاپہ خانے (Preinting Press) قائم ہو چکے تھے۔اور کئی شہروں سے بہ یک وقت کئی کئی اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ لیکن ریاست جموں و کشمیر میں عوام کو چھاپہ خانے قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔لہٰذا کچھ کشمیر الاصل دانشوروں نے اُردو کے دوسرے مراکز لاہور، اِلٰہ آباد امرتسر وغیرہ سے اُردو اخبارت کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔اس سلسلے میں عبدالقادر سروری نے لکھا ہے۔

’’مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ابتدائی دور میں لاہور سے بابو غلام محمد نے ’’آئینہ ہند‘‘ کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار ۱۸۸۵ء میں جاری کیا تھا اور اس میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ

اوران کے نظم ونسق پر تنقید کی جاتی تھی۔ایک اوراخبار''ہمدرد''۱۸۹۴ءمیں جاری ہوا
تھا۔اوراس کا مقصد مہاراجہ کے خلاف تنقیدوں کا جوان دینا تھا۔لیکن اس میں زیادہ
تر اشخاص کو چن کران کے خلاف لکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ ریاست کے اکثر صحیفہ نگار
وں کا رہا۔ چنانچہ پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ اور پنڈت سالگرام سالکؔ کا بھی یہی
طریقہ رہا۔''کشمیر پرکاش'' ماہنامہ تھا جسے ۱۸۹۸ء سے پنڈت منکامشیور (منکیشور)
نکالا کرتے تھے۔''کشمیر درپن'' سر تیج بہادُر سپرو کی ادارت میں اِلٰہ آباد سے
۱۸۹۸ء سے نکلنے لگا تھا اور ۱۹۰۱ء تک جاری رہا۔ یہ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں
میں شائع ہوتا تھا۔سر تیج بہادُر کے علم وفن اور سیاسی صداقت شعاری نے اس کے
لب ولہجہ کو بہت بلند کر دیا تھا۔اسی سنہ میں پنڈت ہرگوپال خستہؔ نے''اخبار شمالی''
کے نام سے روالپنڈی سے ایک ہفتہ وار جاری کیا جو دو سال بعد بند ہوگیا۔پنڈت
گوپی ناتھ گرٹو نے جو پہلے بدیا بلاس کے اڈیٹر تھے۔اس کے بند ہونے کے
بعد انھوں نے''اخبار عام'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ جسے ان کے فرزند
پنڈت بال کرشن گرٹو ترتیب دیتے تھے۔یہ اخبار ۱۹۳۸ء تک جاری رہا''۔(۶)

اُنیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اُردو صحافت کشمیر اور کشمیری قوم کے حوالے سے ایک نیا تعمیری، اصلاحی اور احتجاجی موڑ اختیار کرتی ہے۔اس کی شروعات جس شخصیت نے کی اس کا نام محمد الدین فوق ہے۔محمد الدین فوق نے اُردو زبان وادب کی ترقی اور قوم (کشمیری قوم) کی بیداری میں کم وبیش وہی کردار ادا کیا جو سرسید نے اپنے احباب کے ساتھ مل کر ادا کیا تھا۔محمد الدین فوق ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک قلم کار تھے۔ جنھوں نے ریاست جموں وکشمیر کے اُردو، ادبی اور صحافتی سرمایہ میں قابل قدر اضافے کئے۔دراصل اٹھارہویں اور

اُنیسویں صدی میں کچھ تو سکھ دور اور ڈوگرہ راج کے مظالم سے تنگ آ کر اور کچھ ۱۸۷۸ء میں کشمیر میں پڑنے والے قحط کے سبب متعدد کشمیری خاندان لاہور، اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں سکونت پذیر ہو گئے تھے لیکن کشمیریوں کے حقوق کے لیے جدوجہد بھی کرتے رہے۔ گربچن چندن کے مطابق:

''کشمیری پنڈتوں کے علاوہ کشمیری مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی رجواڑہ شاہی سے نالاں تھا...۱۸۹۶ء میں انھوں نے لاہور میں ایک کشمیری مسلم کانفرنس (پنجاب) قائم کی۔ جو ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس میں تبدیل ہو گئی۔ اس جماعت کے پہلے جنرل سکریٹری علامہ اقبال اور معاون سکرٹیری منشی محمد الدین فوقؔ تھے''۔(۷)

محمد الدین فوقؔ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اُردو صحافت سے کیا۔ فوقؔ نے صرف بیس سال کی عمر میں پیسہ اخبار لاہور میں ملازم ہو گئے۔ اس کے علاوہ اخبار ''کوہ نور'' کے علاوہ کئی دوسرے اخبارات مثلاً ''اخبار عام''، ''صدائے ہند''، ''اُردو اخبار''، ''کوہ نور'' اور ''آفتاب پنجاب'' وغیرہ سے بھی وابستہ رہے اور ادارت کے فرائض انجام دئے۔ محمد الدین فوق اس دوران لاہور سے کشمیر بھی آئے اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے درخواست کی کہ انھیں کشمیر میں ایک پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کی اجازت دی جائے۔ محمد الدین فوقؔ نے ۱۹۰۴ء کی اپنی عرضداشت میں ڈوگرہ حکومت کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ان کے مجوزہ اخبار کا سیاسی اور ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی منفی رویہ اختیار کیا جائے گا۔ لیکن اس یقین دہانی کے باوجود مہاراجہ نے محمد الدین فوق کی درخواست مسترد کر دی۔ ۱۰ جون ۱۹۰۷ء کو فوق کو جواب میں لکھا کہ ''موجودہ وقت میں ان کو کشمیر میں پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی''۔ مہاراجہ نے ریاست جموں و کشمیر کی عدالت عالیہ کو ہدایت بھی دی کہ وہ پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے سے متعلق ایک ضابطے کا خاکہ تیار کرے

جس میں ان تمام پابندیوں اور شرائط کا اندراج ہو۔ جن پر اخبار جاری کرنے والوں کا کاربند رہنا ضروری ہوگا۔ فوقؔ نے کشمیر سے اخبار جاری کرنے کے لیے بار بار درخواستیں دیں لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اس دوران محمد الدین فوقؔ نے ۱۹۰۱ء میں ''پنجۂ فولاد'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جو شروع میں پندرہ روزہ تھا اور بعد میں ہفتہ وار ہو گیا۔

محمد یوسف ٹینگ نے ''پنجہ فولاد'' کو ''کشمیریت'' کی منزل حاصل کرنے کے لیے فوق کے لانگ مارچ کی ابتدا قرار دیا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں ایک انقلابی رسالہ ''کشمیری میگزین'' جاری کیا جس کا نصب العین قومی بیداری، حصول تعلیم، حقوق کے تحفظ اور حصول کے لیے جدوجہد اور سماجی و ثقافتی شعور کی بیداری تھا۔ ''کشمیری میگزین'' ۱۹۳۴ء تک پوری مستعدی اور خلوص کے ساتھ کشمیریوں کا ترجمان بنا رہا۔ محمد یوسف ٹینگ نے لکھا ہے:

> ''اقبال کے کچھ مضامین کشمیری میگزین میں شائع ہوئے......
>
> بعد میں یہ مضامین بشیر احمد ڈار نے پاکستان اور جگن ناتھ آزاد
>
> نے کشمیر میں شائع کئے''۔(۸)

۱۹۳۲ء میں فوقؔ نے سرینگر سے ''کشمیر جدید'' کے نام سے ایک ہفت روزہ بھی جاری کیا جو دو سال تک شائع ہوتا رہا۔ اس کی مجلس ادارت میں فوقؔ کے علاوہ غلام محمد رفیق شامل تھے۔ محمد الدین فوقؔ نے اُردو صحافیوں کا ایک تذکرہ قلم بند کیا تھا۔ جس کا نام مشعل سلطان پوری نے تذکرہ ''اخبار نوسیاں'' لکھا ہے جبکہ گربچن چندن کے مطابق اس کتاب کا نام ''اخبار نویسوں کے حالات'' تھا۔ جس میں اس دور کے ۳۸ صحافیوں کے حالات زندگی درج ہیں۔

ڈوگرہ راج نے ریاست جموں و کشمیر میں صحافت کی آزادی پر جو پابندیاں عائد کر رکھی تھیں وہ بالآخر ریاست کے پہلے باضابطہ اخبار ''رنبیر'' کے اجرا کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ رنبیر کے مدیر جموں کے ایک بے باک اور ممتاز صحافی ملک راج صرافؔ تھے۔ ملک راج صرافؔ کی حیات، اور صحافت پر گربچن چندن نے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے جس سے بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے لے کر تقسیم ملک تک ریاست جموں و کشمیر میں اُردو

صحافت کی صورت حال کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک ریاست جموں وکشمیر میں کسی نجی اخبار کے اجرا کی اجازت ملنا محال تھا۔ پھر جموں کے ایک نوجوان نے ریاست کے اندر اپنا اخبار نکالنے کا عزم کیا۔ اس نوجوان کے ذہن کی ابتدائی پرورش لاہور کے دو اخباروں ''راجپوت گزٹ'' اور ''اخبارعام'' جلیاں والا باغ کے سانحہ کے قومی ردِعمل اور مہاتما گاندھی کی ۱۹۲۰ء کی عدم تعاون کی تحریک سے ہوئی تھی۔

اس نوجوان کا نام ملک راج صراف تھا۔ ولادت ۱۸ اپریل ۱۸۹۴ء کو جموں کی تحصیل سانبہ میں ایک تاجر خاندان میں ہوئی۔ دو ہی سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ گھر میں غربت تھی۔ لہٰذا اسکول کی تعلیم دیر سے شروع ہوئی۔ پڑھنا لکھنا سیکھتے ہی صحافی بننے کا خواب دیکھا۔ ۱۹۱۹ء میں جموں کے ایک کالج سے بی۔اے۔ کیا۔ بیچ بیچ میں اپنی روزی کے لیے یہاں وہاں ملازمت بھی کرتے رہے۔ ۱۹۲۰ء میں لاہور کے ایک کالج میں ایل۔ایل۔بی کے لیے داخلہ لیا لیکن اسی زمانے میں لالہ لاجپت رائے نے اپنا روزنامہ جاری کیا تو قانون کی تعلیم بیچ میں چھوڑ کر ''بندے ماترم'' میں سب اڈیٹر تعینات ہوگئے۔ لاہور میں اخباروں کی بہار دیکھ کر اپنی ریاست سے اپنا اخبار نکالنے کی دُھن سر پر سوار ہوئی تو ۱۹۲۱ء میں لاہور چھوڑ کر واپس جموں آگئے اور اسی سال اپنا اخبار نکالنے اور چھاپہ خانہ لگانے کے لیے درخواست داخل کردی۔ مہاراجہ نے جو اس کی اجازت دینے کا واحد مختار تھا اور جو ریاست میں صحافت کا نام تک سننے کا روادار نہیں تھا۔ فوراً اسے نامنظور کردیا۔

ملک راج صراف نے ہمت نہیں ہاری اور زائد از تین سال تک اجازت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ بالآخر ان کی چوتھی درخواست منظور ہوگئی۔ ۲۴ جون ۱۹۲۴ء سے اس کے ہفت روزہ ''رنبیر'' کی اشاعت شروع ہوگئی۔ انھوں نے صداقت کے فروغ کو ''رنبیر'' کا نصب العین بنایا اور اولین شمارے ہی میں ''صداقت'' کے عنوان سے اپنے اداریے میں لکھا:

''برادرانِ وطن سے یہ بات مخفی نہیں کہ عرصہ مدید سے اجرائے اخبار حدود ریاست کے لیے کس قدر سعی بلیغ ہو رہی تھی اور چند احباب کی دلی عقیدت کی وجہ سے باوجود ہزار رکاوٹیں حائل ہونے کے آخر اپنے مقصد میں قوتِ ارادی و تائیدِ ایزدی سے میدان جیت کر اسم بامسمیٰ بن کر قوم و ملک کے شیدائیوں کے حضور اپنے آپ کو ملک کا خادم تصور کر کے پیش ہوتا ہے۔ اس اخبار کا نام گو، نگاہِ عامہ میں والئی ملک سری سرکار والا مدار جی مہاراجہ صاحب بہادر مہاراجہ رنبیر سنگھ صاحب سرگباشی کی یادگار کو قائم رکھنے کا مقصد ظاہر کرتا ہے مگر یہ حرف 'رنبیر' بڑا پرمعنی ہے۔ اس نام کے لغوی معنی بلوان، جیتنے والا بہادر یعنی ضرور جیتنے والا فطرتاً کامیاب ہو جانے والا۔ غالب آ جانے والا۔ اب میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں انسان دو طرح جیت سکتا ہے۔ ایک آتمک شکتی سے یعنی روحانی طاقت سے دوسرا اشاریرک بل یعنی جسمانی طاقت سے۔ مگر سب سے زیادہ مضبوط اور ابدی فتح روحانی طاقت کی فتح ہے جس کے بعد کوئی دیگر طاقت ہرگز نہیں جیت سکتی۔ اب سنیے اور ذرا غور کے ساتھ توجہ مبذول کیجیے کہ روحانی طاقت، صداقت یعنی سچائی پر انحصار رکھتی ہے''۔

(ہفتہ وار رنبیر، نمبر ا جلد ا۔ ۲۴ جون ۱۹۲۴ء۔ جموں یونیورسٹی لائبریری)

یہ خیالات مہاتما گاندھی کے عدم تشدد اور صداقت کے نظریات کی تائید و تاکید تھے۔ ریاست کے اولین سیاسی اخبار نے ان کی تبلیغ سے وہاں کے اہل سیاست کے جو تیس کے دہے سے سرگرم ہوئے۔ فکر و نظر کے سانچے ڈھالنے میں خاموش معاونت کی اور ڈوگرہ راج کے خلاف جو تحریک چلی وہ بیشتر اسی سیاسی کلچر کی ارادت مند رہی۔ ریاست کی صحافت بھی بیشتر انھیں دھاروں کی شناور رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریاست کے اربابِ اختیار میں صحافت

یا اس کی صداقت کا کوئی مداح یا ثنا خواں نہیں تھا۔ان کے پاس اخبار کی ہر سطر کے لیے صرف ترچھی نظر تھی۔عوام میں اخبار پڑھنے کا زیادہ شوق اور مطبوعہ مواد کی صداقت کے دفاع کا کھلا حوصلہ نہیں تھا۔خبریں فراہم کرنے اور بھیجنے کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔اور ریاست کے اندر صحافیوں اور نامہ نگاروں کی بھی سخت قلت تھی۔

اس زمانے میں ''رنبیر'' ایک باشعور اور تعمیر پسند صحافت کے معمار کی حیثیت سے اُبھرا۔اس کی داستان میں ریاست کی جدید اُردو صحافت کے ارتقا اور افزائش کی روداد مضمر ہے۔اس کی سرگرمیوں اور پہل کاریوں کے کئی پہلو تھے۔اس نے بیرون کشمیر اور بالخصوص پڑوسی پنجاب سے شروع کیے جانے والے بعض کشمیریوں اور ان کے حواریوں کے اخباروں کے قدرے فرقہ پسندانہ رجحانات سے پہلو بچاتے ہوئے ریاست میں ایک مشترکہ اور وسیع النظر صحافت کی راہ اختیار کی۔اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ ''رنبیر'' ایک قومی اخبار ہوگا اور کسی مذہب یا فرقے کی طرف داری نہیں کرے گا بلکہ ریاست کے تمام باشندوں کا بلا لحاظ مذہب، ذات یا فرقہ ترجمان ہوگا۔اس کے سرورق کی پیشانی پر یہ شعر شائع ہوتا تھا۔

مل جل کے ہم ترانے حبِ وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اُس چمن کے گائیں

انہوں نے اپنے نامہ نگاروں کا ایک خاصا وسیع نظام قائم کیا اور ان میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ یہ ستی نگر، سوپور، بارامولہ، مظفر آباد، بھدرواہ، اودھم پور، میر پور، رنبیر سنگھ پورا، بمبر، مانا ور، سانبہ، کٹھوا، بشولی، کوٹلی، راجوری، رام نگر، پونچھ اور چنانی میں مقیم تھے۔ان میں پنڈت پریم ناتھ بزاز، پنڈت جیالال کول کلم، کاشی ناتھ ایمہ، مولوی زین العابدین، چودھری محمد شفیع، منشی غلام رسول خادم، خواجہ غلام قادر بندے وغیرہ شامل ہیں۔عملے میں ڈوگروں اور کشمیریوں کے علاوہ پنجاب کے افراد بھی شامل تھے۔ان میں سے کئی افراد نے بعد میں اپنے اخبار جاری کیے اور اس طرح ریاست کے اندر ''رنبیر'' صحافیوں کی نئی نسل کا پہلا مدرسہ صحافت بنا۔اس اخبار نے فرنگی حکام کی

فرقہ وارانہ حکمتوں کی نڈرتا سے مخالفت کی اور آزادیِ صحافت اور جرات اظہار کی ایک اچھی روایت قائم کی۔

جون ۱۹۲۵ء میں جب ریاست کے مالیات اور پولیس کے امور انگریز وزیر مسٹر بی۔ جے۔ گلانسی لاہور کے دورے پر گئے تو وہاں مقیم کشمیری مسلمانوں کے ایک وفد نے انھیں اپنی کچھ شکایات پیش کیں۔ مسٹر گلانسی نے ان شکایات میں خصوصی دلچسپی دکھائی اور ان پر والئی ریاست کا جواب حاصل کرنے سے قبل ہی وفد کے تئیں اپنی سرپرستی کا اظہار کیا۔

''رنبیر'' نے اس رویے کو فرقہ وارانہ قرار دیا اور اسکی کڑی نکتہ چینی کی۔ کہا کہ یہ فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے کی حکمت عملی ہے۔ کشمیر کے لوگوں کی شکایات مشترکہ ہیں۔ انھیں اسے مسلم یا ہندو کا جامہ نہیں پہنایا جانا چاہیے، اس زمانے میں ایک ریاست کے کسی انگریز افسر کے خلاف ایسی تنقید ایک بے نظیر جرات اظہار تھی۔ مسٹر گلانسی نے دورے سے واپسی پر رنبیر کے خلاف سرکاری کارروائی کی لیکن ریاست کی کونسل نے اسے بے اثر کر دیا۔

اسی طرح جب رنبیر نے ۱۹۳۰ء میں نمک قانون کے خلاف مہاتما گاندھی کے ستیہ گرہ کے لیے ریاست کے لوگوں کی حمایتی تحریک کی حوصلہ افزائی کی تو ریاست کے برطانوی چیف سکریٹری کے حکم سے اس کی اشاعت روک دی گئی۔ اس پر اس کے سخت جان اڈیٹر نے لاہور سے یکے بعد دیگرے دو ہفت روزہ اخبار ''امر'' اور ''مشیر'' نکالے۔ ڈیڑھ سال کے بعد ریاست کے دیوان (وزیر اعظم) کی مداخلت پر ''رنبیر'' کا ڈیکلریشن بحال کر دیا گیا اور اڈیٹر نے اسے دوبارہ سے جاری کر دیا۔ جموں سے شائع ہونے والا اخبار ''رنبیر'' ۷ مئی ۱۹۵۰ء کو بند ہو گیا۔ رنبیر کے آخری شمارے میں ملک راج صراف نے لکھا:

> ''بڑے دُکھ بھرے دل کے ساتھ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ چند در چند وجوہات سے جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں ''رنبیر'' کی مزید اشاعت کو جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے میں اسے غیر معین عرصے کے لیے بند کر دینے پر مجبور ہوں....''رنبیر'' کی اس

رضا کارانہ بندش کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن قوم پرورانہ اور ترقی پسندانہ مقاصد کو لے کر ''رنبیر'' معرضِ وجود میں آیا تھا اور جن کے حصول کے لیے وہ اب تک برابر کوشاں رہا ہے اور جس میں اسے کسی حد تک کامیابی بھی نصیب ہوئی ہے اس میں کوئی کمی آجائے گی۔ یہ مقاصد تو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں اور وہ مستقبل میں بھی میری اور میرے خاندان کی آئندہ پبلک زندگی کے لائحۂ عمل کا بدستور ایک اہم جُز بنے رہیں گے''۔(۹)

اخبار ''رنبیر'' کے مدیر ملک راج صراف نے اپنی سوانح حیات ''میری صحافت کے پچاس سال'' (Fifty Years as a Journalist) میں لکھا ہے کہ آزادی سے قبل تک ریاست میں ایک سرگرم اور فعال پریس تیار ہو چکا تھا جو تقریباً سب کا سب اُردو میں تھا۔ اخباروں کے نام جن کے نمائندوں کو وزیرِاعظم کی ایک پریس کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ ان کی فہرست ملک راج صراف کی سوانح حیات میں اس طرح پیش کی گئی ہے:

اخبار	اڈیٹر/نمائندہ
رنبیر	ملک راج صراف
خدمت	خواجہ غلام رسول عارف
مارتنڈ	پنڈت پریم ناتھ
ہمدرد	مولانا مسعودی۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز
رہبر	پنڈت دینا ناتھ مست کاشمیری
دیش	کشیپ بندھو
خالد	خواجہ صدرالدین مجاہد

سچ	ماسٹر روشن لال
پاسبان	منشی معراج الدین احمد
چاند	دیوان نرسنگھ داس نرگس
شمشیر	رگھبیر سنگھ مکٹ
پکار	بلراج پوری
وکیل	پنڈت شمبھوناتھ کول ناظر
خالصہ گزٹ	سرداد گور پرب سنگھ
سدرشن	پنڈت وشوناتھ کیرنی
دیش سیوک	کویراج ویشنو گپت
کسان	یٰسین مسکین
وطن	سردار مہندر سنگھ
آنند	گردھاری لال آنند
رتن	اوم پرکاش صراف
اوشا	شریمتی شکنتلا سیٹھ
جاوید	کے۔ایچ۔خورشید
الانسان	چودھری محمد دین
بھارتی	بھاگ مل
زندگی	رام سرن داس ملہوترا

گلاب دینو بھائی پنت

سچ (میر پور) راجہ محمد اکبر خاں

صداقت (پور) دھرم ویر

پربھات (پونچھ) خواجہ غلام قادر بانڈے''۔(۱۰)

اخبار ''رنبیر'' ڈوگرہ راج کا حمایتی تھا لیکن بعد میں ریاست میں جمہوری حکومت اور ریاست کے ہندوستان سے الحاق کی وکالت بھی کرتا تھا۔ ملک راج صراف نے اس وقت مہاراجہ ہری سنگھ کی سخت مذمت کی جب وہ اپنے دیوان پنڈت رام چندر کاک کی مشاورت میں کشمیر کو آزاد اور کچھ پہاڑی علاقوں کو ساتھ ملا کر ایک وسیع تر ریاست بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ریاست کا دیوان اس کی تنقیدی تحریروں سے بہت برہم ہوا اور جون ۱۹۴۷ء میں کوئی وجہ بتائے بغیر اس کی اشاعت بند کروادی۔ لیکن ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کے فوراً بعد ۲۶ اگست ۱۹۴۷ء کو اس کی اشاعت کے احکامات جاری ہو گئے اور لیکن اخبار ''رنبیر'' کی اشاعت کے آغاز (۲۴ جون ۱۹۲۴ء) سے لے کر اختتام (۱۷ مئی ۱۹۵۰ء) کے دوران ریاست جموں وکشمیر میں اُردو صحافت نے کئی کروٹیں لیں۔ طباعت سے لے کر ترسیل تک اور خبر نگاری سے لے کر گرفتاری تک کئی مرحلے سامنے آئے لیکن اس دوران ریاست کے حکمرانوں نے بھی یہ سمجھ لیا کہ صحافت کی آزادی چھین کر نہ تو وہ آداب حکمرانی نبھا سکتے ہیں اور نہ ہی عوامی جذبات واحساسات مسائل اور ضروریات کو آمرانہ رویوں کے پاوں تلے کچلا جا سکتا ہے۔ چنانچہ چہار طرفہ دباو کی بنا پر مہاراجہ ہری کو مارچ ۱۹۳۲ء میں جموں اینڈ کشمیر پریس اینڈ پبلیکیشنز ایکٹ نافذ کر دیا۔ جس کے مطابق عوام کو پریس قائم کرنے اور اخبار شائع کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ اس ایکٹ کے نفاذ کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں اُردو صحافت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اور ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۲ء صرف دس برسوں میں جموں وکشمیر سے شائع ہونے والے اُردو اخبارات کی تعداد سو سے زیادہ ہو گئی۔ ان میں سے چند اخبارات مثلاً۔ ''وتستا''، ''مارتنڈ''، ''ہمدرد'' اور ''خدمت'' وغیرہ کے

نام سنہری حرفوں سے لکھے جانے قابل ہیں۔ کیونکہ ان اخبارات نے خصوصیت کے ساتھ ایک طرف کشمیر کی تحریک آزادی کو رفتار عطا کی وہیں ریاست جموں وکشمیر میں صحافت کے معیار کو بھی بلند کیا۔

اگست ۱۹۴۳ء میں آل جموں اینڈ کشمیر ایسوسی ایسن All Jammu & Kashmir Journalist Association کی پہلی کانفرنس سرینگر میں منعقد کی گئی۔ جس کا افتتاح ''امرت بازار پتریکا'' کے اڈیٹر تشار کانتی گھوش نے کیا۔ اس کانفرنس میں قریب آٹھ ہزار لوگوں نے حصہ لیا۔ ان میں ادیب، شاعر، صحافی، ممبران اسمبلی، وکلا، پروفیسروں، ڈاکٹروں، تاجروں، سیاسی لیڈروں نے اور کارکنوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسٹیج پر شیر کشمیر شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی اور بار ایسوسی ایشن کے صدر پنڈت جیالال کلیم بھی جلوہ افروز تھے۔ اس موقع پر شیخ محمد عبداللہ نے جو نیشنل کانفرنس کے صدر بھی تھے۔ اس کانفرنس سے اپنے مخصوص انداز میں خطاب کیا۔ ان سے پہلے تشار گھوش نے صحافت کی معنویت، اور غرض وغایت کے حوالے سے اپنے افتتاحی خطبے میں کہا:

> ''پریس بہت بڑی طاقت ہے لیکن اس کے زور کا انحصار صحافی کے ہاتھوں اس کے استعمال پر ہے۔ وہ اس سے تخریب کا کام بھی لے سکتا ہے اور تعمیر کا بھی۔ صحافی کی یہ طاقت یا صلاحیت کسی سرمایہ دار حکومت کی طرف سے عطا نہیں ہوتی بلکہ یہ اس میں لوگوں کے اعتماد سے پیدا ہوتی ہے اور انھیں کی امانت ہوتی ہے۔ صحافی کا یہ اخلاقی اور مقدس فرض ہے کہ وہ اسے دیانت داری سے استعمال کرے۔ اسے کسی فرقہ وارانہ مصلحت سے گمراہ نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ہی کسی اور ترغیب کے تحت عوام کی طرف اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں اپنے قلم کو کمزور کرنا چاہیے۔ اسے ظلم، بے انصافی۔ ظلم کے شکار لوگوں، پسماندہ طبقوں، اہل محنت، کسانوں اور کمزور لوگوں کے تحفظ کے لیے بغیر کسی خوف، رعایت یا تعصب کے اپنے اخبار

کی طاقت کو بروے کار لانا چاہیے۔

انھوں نے پوچھا:

ہمارے عوام ناخواندگی، جہالت اور بھوک کے حلقوں میں گھرے ہوئے

ہیں۔کیا یہ ہمارا لازمی فرض نہیں کہ ان کی مصیبتوں اور دشواریوں کی نیابت کریں

اورانھیں سے نجات دلانے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لیں؟۔''(۱۱)

۱۰ستمبر۱۹۴۷ء سے رنبیر کی اشاعت دوبارہ شروع ہوگئی۔لیکن آزادی کے بعد بعض وجوہات کی بنا پر ملک راج صراف نے ریاست کے اس اخبار کو ہمیشہ کے لیے بند کردیا جس کا ذکر گذشتہ صفحہ پر ہو چکا ہے۔

ملک راج صرف کا انتقال ۲۱فروری ۱۹۸۹ءکو ہوا۔گرچہ رنبیر اصلاً ایک سیاسی وسماجی اخبار تھا لیکن اس میں معیاری ادبی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔جموں وکشمیر کے علاوہ بیرون ریاست کے جن شعرا کا کلام رنبر میں شائع ہوتا تھا ان میں جوش ملیح آبادی، سیماب اکبرآبادی، جگر مرادآبادی، ساحر لدھیانوی، مولانا ظفر علی خاں، پروفیسر محمد دین تاثیر، آغا حشر کاشمیری اور مجید لاہوری وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔اخبار ''رنبیر'' کی فائلیں جموں یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہیں۔

رنبیر کے ادارے سے ہی ریاست کا پہلا بچوں کا رسالہ ''رتن'' جاری ہوا۔یہ رسالہ نوجوانوں خاص طور پر طالب علموں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت پر زور دیتا تھا۔نظم اور کہانی کی شکل میں بچوں اور نوجوانوں میں تعمیری جوش وجذبہ، احساس ذمہ داری اور حب الوطنی پیدا کرنا ''رتن'' کا نصب العین تھا۔رتن کے اڈیٹر تو ملک راج صراف ہی تھے۔لیکن اس کی تہذیب وترتیب میں مشہور فکشن نگار پریم ناتھ پردیسی کا بنیادی کردار ہوتا تھا۔آزادی سے قبل ''رتن'' سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والا رسالہ تھا۔سرکاری اعداد وشمار کے مطابق دسمبر ۱۹۴۵ء میں ''رتن'' کی تعداد اشاعت ۲۵ ہزار تھی۔

جموں وکشمیر میں اُردو صحافت کی صورت حال کے بارے میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو صحافت آزادی سے قبل ہی عروج کے کئی مرحلے طئے کر چکی تھی۔اس ضمن میں خاص طور پر جن اخبارات کو نمایاں حیثیت حاصل ہوئی ان میں ''رنبیر''، ''مارتنڈ''، ''ہمدرد''، ''خدمت''، ''امر''، ''وتستا''، ''صداقت'' اور ''حقیقت'' وغیرہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔شیخ محمد عبداللہ کے دست راست مولانا محمد سعید شعودی نے پیر حسام الدین بانڈے، قیصر قلندر وغیرہ کے ساتھ مل کر ۱۹۳۳ء میں ہفتہ روزہ ''صداقت'' جاری کیا لیکن چونکہ اس اخبار میں ڈوگرہ راج کی پالیسیوں پر شدید نکتہ چینی اور تحریک آزادی کی بھرپور حمایت کی جاتی تھی اس لیے ڈوگرہ حکومت نے اس اخبار کی اشاعت پر پابندی لگادی۔اس کے بعد قیصر قلندر نے ''حقیقت'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔لیکن اس اخبار کو بھی ڈوگرہ حکومت نے بند کروادیا۔''صداقت'' اور ''حقیقت'' دونوں کو شیخ محمد عبداللہ کی قیادت والی جماعت ''آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس'' کی حمایت حاصل تھی۔اس کا اعتراف خود شیخ محمد عبداللہ نے اپنی خودنوشت ''آتش چنار'' میں کیا ہے۔

وقت اور حالات نے جب کروٹ لی اور ڈوگرہ حکومت کے خلاف کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ پنڈتوں اور جموں کے ڈوگروں نے کمر کس لی تو آل جموں وکشمیر کانفرنس All Jammu & Kashmir National Conference کر دیا گیا تو پارٹی کے ترجمان کے طور پر اخبار ''خدمت'' کی اشاعت عمل میں آئی۔اس کا ذکر شیخ محمد عبداللہ نے بھی ''آتش چنار'' میں کیا ہے۔

۱۹۵۰ء سے پہلے قیصر قلندر کے اخبار ''جہاں گیر''، ایم۔اے صابر کے ''البرق'' اور خواجہ محی الدین کے ''رہبر'' کا شمار بھی اُردو کے اہم اخبارات میں ہوتا ہے۔

جموں اور کشمیر کی اُردو صحافت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ آزادی سے پہلے اخبارات کی طباعت، خبروں کی فراہمی اور اخبار کی تقسیم کاری وغیرہ کی دُشواریوں کے باوجود ریاست میں اخبارات شائع ہوتے رہے۔لیکن چونکہ

زیادہ تر اخبارات سیاسی لیڈر نکالتے تھے۔اس لیے تقسیم ملک سے کچھ پہلے اور کچھ بعد کئی اخبارات کے مدیران سیاست میں اس قدر ملوث ہوگئے کہ انھیں اخبار بند کرنا پڑا یا اخبارات سے علحدگی اختیار کرنی پڑی۔اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کشمیر کے مشہور صحافی یوسف جمیل نے لکھا ہے:

''مشکلات کے باوجود ۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۷ء کشمیر میں صحافت کا معیار مجموعی طور پر اچھا رہا۔اس دور میں جتنے بھی صحافی منظر عام پر آئے۔ان میں سے اکثر کی سیاسی وابستگیاں تھیں۔اس طائفے میں پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا محمد سعید مسعودی اور پنڈت کیشپ بندھو شامل تھے۔۱۹۴۷ء سے کچھ پہلے اور اس کے بعد ان میں سے بیشتر نے صحافت کو خیر باد کہہ دیا اور عملی سیاست میں حصہ لینے لگے جس سے ریاست کی صحافتی دنیا میں ایک خلا سا پیدا ہوگیا''۔(۱۲)

ملک کی تقسیم کے بعد فسادات اور قبائلی حملوں کی وجہ سے کئی اُردو اخبارات کے مدیران پاکستان چلے گئے۔اور کئی اخبارات بند ہوگئے۔اس لیے ۱۹۴۷ء کے بعد جموں وکشمیر کی اُردو صحافت کی رفتار میں تھوڑی سی سُستی اور معیار میں گراوٹ ضرور آئی۔لیکن پھر جموں وکشمیر کی سیاست اور معاشرت کی طرح اُردو صحافت میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

۱۹۵۰ء کے بعد ریاست میں شخصی راج کا خاتمہ ہوا۔اور عوامی حکومت برسر اقتدار آ گئی۔چونکہ یہ دور اقتصادی بدحالی، سیاسی عدم استحکام، رسل ورسائل کے ذرائع کے فقدان، پاور سپلائی کی عدم فراہمی، نیوز پرنٹ کی قلت کا دور تھا اسی لیے فوری طور پر اُردو صحافت آگے نہ بڑھ سکی۔ان دشواریوں کے باوجود کئی باصلاحیت لوگوں نے اخبار نویسی کو اپنا پیشہ بنایا اور اخبارات جاری ہونے لے۔اخبارات کے ساتھ ساتھ ان برسوں میں بعض معیاری ادبی ماہنامے بھی جاری ہوئے ان میں کشمیر ماہنامہ ''گل ریز''....بدری ناتھ کوشر کا ''آزاد'' محکمہ اطلاعات کا ''تعمیر''

ویدراہی کا ’’سویرا‘‘ موہن یاور کا ’’سنگم‘‘ اور محکمہ دیہات سدھار کا ’’ دیہات سدھار‘‘ قابل ذکر ہیں۔

ریاست میں ۱۹۵۷ء میں کلچرل اکادمی قائم ہوئی۔ اکادمی کے زیر اہتمام ریاست کی مختلف زبانوں کشمیری۔ ڈوگری، اور اُردو میں رسالے جارے ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں اکادمی نے اُردو رسالہ ’’شیرازہ‘‘ کی اشاعت شروع کیا۔ جو اس وقت تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ جموں میں صحافت کا عمل سرگرمی سے جاری رہا۔ ۱۹۵۴ء میں گوجر برادری کا ترجمان ’’نوائے قوم‘ جاری ہوا۔ اسی سال سردار گمبیھر سنگھ ملکتا نے ’ہفت روزہ‘‘ ، ’’لوک سندیش‘‘ جاری کیا۔

ریاست جموں وکشمیر میں ’’رنبیر‘‘ اور ’’ہمدرد‘‘ جیسے اخبارات کے بعد ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۳ء کے سیاسی انقلابات کے بعد ۱۹۶۴ء میں شمیم احمد شمیم نے تاریخ ساز اخبار ’’آئینہ‘‘ جاری کیا۔ شمیم اپنی ریاست کے بگڑتے ہوئے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک اخبار جاری کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مالی اعتبار سے وہ اس لائق نہ تھے کہ اخبار کے اخراجات برداشت کر سکتے۔ پھر بھی انھوں نے کسی نہ کسی طرح وسائل جٹائے اور ہفت روزہ ’’آئینہ‘‘ جاری کیا۔ شمیم احمد شمیم نے ریاست جموں وکشمیر مسائل کے پیش نظر سیاست اور سیاسی رہنماوں کے منفی رویوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ مقصد اصلاح اور تعمیر تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے حوالے سے مسئلہ کشمیر کا جو ناسور پیدا ہوا تھا اس کی ٹھیسیں شمیم کو بے چین رکھتی تھیں۔ اس کو سب سے زیادہ شمیم احمد شمیم نے محسوس کیا تھا۔ شمیم نے اپنے بزرگ سیاسی رہنماوں کی جن میں شیخ محمد عبداللہ اور افضل بیگ بھی شامل تھے۔ بہت عزت کی۔ ان کی عنایتوں کا اعتراف بھی کیا۔ لیکن جہاں ان سے کوتاہیاں سرزد ہوئیں۔ ان کی نکتہ چینی بھی کی۔ اس لیے کہ شمیم کا اخبار حق وصداقت کا آئینہ تھا ’’وہ آزاد ہواوں کا پنچھی تھا۔ نہ ہندوستان کا غلام تھا نہ پاکستان کا دُم چھلا۔

شمیم احمد شمیم نے ’’آئینہ‘‘ کے ابتدائی شمارے میں ہی ’’یہ اخبار کس کا ہے‘‘ کے عنوان سے لکھا تھا۔

’’آئینہ کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے آپ کو اپنی صورت نظر آئے گی اور کچھ

دیر بعد آپ کو اس میں اور بھی صورتیں نظر آئیں گی یہ صورتیں آپ کے
اِردگرد کی دنیا کی، آپ کے ماحول کی، آپ کے ماضی، حال اور مستقبل
کی صورتیں ہوں گی۔ اور آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائینگے کہ یہ کس کا
آئینہ ہے"..... "آئینہ" کا کسی سیاسی جماعت یا لیڈر سے تعلق نہیں۔ یہ
عوام کا اخبار ہے..... یہ صحیح ہے کہ آئینہ عوام کے ہر جائز صالح اور معقول
مطالبے کی حمایت کرے گا لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ سستی مقبولیت حاصل
کرنے کے لیے "آئینہ" اعتدال، توازن اور صحت مند تنقید کا دامن ہاتھ
سے چھوڑ دے۔ اپنے یہاں صحافتی تنقید کی معنی صرف حکومت پر ہی نکتہ
چینی سمجھا گیا ہے لیکن جمہوری نظام کی بقا کے لیے صرف حکومت پر ہی
نکتہ چینی کرنا کافی نہیں عوام کو بھی تنقید کا ہدف بننا چاہیے۔ "آئینہ" جہاں
حکومت کی فروگذاشتوں کو بے نقاب کرنے میں کوئی دقیقہ فرگذاشت
نہیں کرے گا وہاں وہ بڑی بیباکی کے ساتھ تعصب، تنگ نظری، فرقہ پرستی،
جہالت اور توہم پرستی کے خلاف بھی جہاد کرے گا"۔(۱۳)

شورش کاشمیری کے مطابق شمیم بنیادی طور پر ادب کا طالب علم تھا۔ آل احمد سرور، شہیر یار، محمد یوسف ٹینگ، حامدی کاشمیری اور مشعل سلطان پوری بھی شمیم کی صحافت، ادبی مزاج اور ادبی مضامین کی اعلیٰ ادبیت Literaryness کی تصدیق کرتے ہیں۔ جراحی تو شمیم کی طبیعت کا لازمہ تھی اس لیے تنقیدی مضامین اور خاکوں میں بھی ان کا Operational Attitude باذوق قارئین کو بڑا لبھاتا تھا۔ شمیم کا طنز و تنقید کے سبھی وار قارئین نے بڑے ہی معشوقانہ انداز میں اپنے جسم و جاں پر سہے کہ انھیں پتہ تھا کہ شمیم کا "آئینہ" محض رسمی صحافت اور

ادب کا آئینہ نہیں ہے بل کہ لفظ لفظ قوم کی مسیحائی کا ایک سلسلہ تھا۔ جو ۱۹۸۰ء میں شمیم کی ناوقت موت کے بعد ختم ہو گیا۔ جموں اور کشمیر ہی نہیں ہندوستان اور پاکستان کے کم و بیش تمام اہم ادیبوں اور صحافیوں نے الگ الگ انداز میں شمیم احمد شمیم کے امتیازات کی نشاندہی کی ہے۔ ریاستی کلچرل اکیڈمی کے اُردو رسالے ''شیرازہ'' نے شمیم احمد شمیم کی یاد میں ایک ضخیم خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔

۱۹۶۷ء میں 'سرینگر ٹائمز'' کو صوفی غلام محمد نے جاری کیا۔ سرینگر ٹائمز عوام میں بے حد مقبول ہے۔ اس میں بشیر احمد بشیر کا کارٹون شامل ہوتا ہے۔ جو سیاسی اور سماجی بے ضابطگیوں پر طنز کا کام کرتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد جو مشہور اخبارات سامنے آئے ان میں ''انڈین ٹائمز'' سرینگر ایکسپریس''، ''مارننگ ٹائمز''، ''کرم ویر''، ''تقویم''، ''کوہستان''، 'صداقت''، ''انقلاب'' اور ''لالہ رُخ'' قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک ادبی ماہناموں کا تعلق ہے۔ اس دور میں کشمیری اور اُردو میں نکلنے والے ماہنامے گلریز، وکیل۔ جھرنا، کینواس، ادبیات، العطش، ہما وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی سے خبر نامہ کے علاوہ ابتدا میں ''ادبیات'' اور ''نیا شعور'' کے نام سے رسالے نکلتے تھے لیکن ساتویں دہائی سے شعبہ اُردو ''بازیافت'' کے نام سے سالانہ رسالہ پابندی سے شائع کر رہا ہے۔ اسی طرح شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کا رسالہ ''تسلسل'' کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ گذشتہ پچاس برسوں میں ریاست میں اُردو صحافت نے حیران کن ترقی کی ہے اور متعدد روز نامے، ہفت روزہ اور ماہنامے معرض وجود میں آئے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ریاست میں تعلیم کے پھیلاؤ نے لوگوں کو اخبار بینی کی طرف مائل کیا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ کئی نوجوانوں نے صحافت کو روزگار کا وسیلہ بنایا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ریاست جموں و کشمیر کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے، قبائلی حملہ اور ہندوستان کے ساتھ الحاق، اور رائے شماری کے ذریعے ریاست کے مستقل کے فیصلے کے سوال پر تہہ در تہہ سیاسی مسائل سامنے آئے جو وقت کے ساتھ سلجھنے کے بجائے اُلجھتے ہی گئے۔ گرچہ آزادی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو حکومت کی حمایت سے شیخ محمد

عبداللہ ریاست کے سربراہ (وزیراعظم) کے عہدے پر فائز ہوئے تھے لیکن پھر دلی کے ساتھ شیخ محمد عبداللہ کے اختلافات بڑھتے گئے ۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۳ء میں انھیں اقتدار سے بے دخل کر کے بخشی غلام محمد کو اقتدار کی کرسی پر بیٹھا دیا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ صحافت کی آزادی کے حامی تھے جبکہ بخشی غلام محمد نے اقتدار سنبھالتے ہی صحافت کی آزادی کو مجروح کرنا شروع کر دیا۔ اخبارات کو آزادانہ اور بے باکانہ اظہار کی اجازت نہیں تھی نئے اخبارات جاری کرنے میں دُشواریاں کھڑی کی گئیں۔ اس کے باوجود کشمیر اور جموں سے کئی اخبارات جاری ہوئے ۔ مثلاً کشمیر سے ’’دہقان‘‘، ’’رہنما‘‘، ’’آفتاب‘‘، ’’کشمیر پوسٹ‘‘ وغیرہ۔ آفتاب آج بھی سرینگر سے شائع ہو رہا ہے۔ صوبہ جموں سے جو اخبارات جاری ہوئے اُن میں محمد اسماعیل کی ادارت میں ۱۹۵۳ء میں ہفت روزہ ’’نوائے قوم‘‘ جاری ہوا جو بالخصوص گوجر برادری کا ترجمان تھا۔ یہ اخبار بعد میں سروری کسانہ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار کو کئی بار اپنی صداقت بیانی کی بنا پر مخالف قوتوں کی رعونت وخشونت کا حدفِ انتقام بننا پڑا۔ سروری کسانہ بعد میں ریاستی کلچرل اکادمی کے گوجری شعبہ سے وابستہ رہے اور گوجری زبان کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں سردار رگھبیر سنگھ مُکت نے ’’لوک سندیش‘‘ جاری کیا جو بعد میں ایس، آر۔ سدھیر کی ادرات میں شائع ہوتا رہا۔ اس سال کے دوران شائع ہونے والے دیگر اخبات میں گوپال سچر کا ہفت روزہ ’’جے سودیش‘‘، روشن لال کلفت روزہ ’’مساوات‘‘ اور اقبال نرگس کا ہفت روزہ ’’خورشید‘‘ قابل ذکر ہیں ۔ ۱۹۵۶ء میں لالہ آنند صراف نے ہفت روزہ ’’حقیقت‘‘ وجے سمن نے ’ہفت روزہ‘‘، ’’چٹان‘‘، ایس۔ پی۔ انقلابی نے ہفت روزہ، ’’اکالی یودھا‘‘ جاری کیا۔ یہ اخبارات آغاز میں تو کسی قدر باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے رہے لیکن بعد میں گمنام ہو گئے ۔ ۱۹۵۷ء میں ’’انساف‘‘، ’’جموں پتریکا‘‘، ’’ٹرانسپورٹ‘‘، ’’رنجیت‘‘ اور ’’گاندھی مشن‘‘ وغیرہ نام کے اخبارات منظرِ عام پر آئے۔ ماسوائے چند شماروں کے یہ اخبارات زیادہ تر خانہ پُری پر ہی انحصار کرتے رہے۔ نیز اخبارت کی کتابت بھی بہت ہلکی ہوا کرتی تھی ۔ ۱۹۵۸ء میں سردار رنجیت سنگھ نے ’’کشمیر ٹرانسپورٹ‘‘ اور ریشی نے اس کے دوسال بعد ہفت روزہ

’’امان‘‘ جاری کیا جو بعد میں عدم اشاعت کی امانت میں چلا گیا۔

۱۹۶۳ء میں آئی۔ ایس بلوریا نے ہفت روزہ ’’چناب‘‘ ڈوڈہ سے جاری کیا۔ یہ اخبار کئی سال تک نکلتا رہا۔ ۱۹ اگست ۱۹۸۶ء کو مسٹر بلوریا سرولباغ بھدرواہ میں چل بسے تو مسٹر او۔ پی۔ ٹھاکر نے اس کی ادارت سنبھالی اور کئی سال تک یہ اخبار باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اس دور کے آس پاس منظر عام پر آنے والے اخبارات میں بابو رام گپتا کا ’’عمارت‘‘، بنارسی دت کا ’’ینگ آرگنائزز‘‘، منگت رام کا ’’سیاست‘‘، ترلوک سنگھ کا ’’لوک آواز‘‘، مسٹر ایل۔ سنگھ کا ’’نئی زندگی‘‘ اور سردار تارا سنگھ کا ’’امن‘‘ قابل ذکر ہیں۔ دسمبر ۱۹۶۲ء میں جب حضرت بل سرینگر کی خانقاہ معلیٰ سے موئے مقدس کو اپنی جگہ سے اُٹھانے کی مذموم سازش کا واقعہ پیش آیا تو اس کے نتیجے میں پوری ریاست میں ایک سیاسی کشیدگی واقع ہوئی اور پریس پر اجارہ داری کی گرفت قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔ خواجہ شمس الدین عبوری طور پر ریاست کے نئے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انھوں نے انتظامیہ میں بدعنوانیوں کے خلاف کچھ اقدام اُٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ چند دنوں کے مہمان ثابت ہوئے اور انھیں بھی برخاست کر دیا گیا۔ اُن کے بعد خواجہ غلام محمد صادق نے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ اُنھوں نے اقتدار سنبھالتے ہی شہری آزادی، پریس اور پلیٹ فارم پر عائد شدہ تمام پابندیاں اُٹھانے کا اعلان کیا جس سے صحافت کو ایک حوصلے کی اُمید پیدا ہو گئی۔ صادق صاحب نے جموں میں ایک پریس کانفرنس میں مقامی صحافیوں کو یقین دِلایا کہ پریس ایکٹ کی اُس ظالمانہ دفعہ (۵ -الف) کو منسوخ کر دیا جائے گا جو صحافت کی حوصلہ شکنی کے لیے نافذ کی گئی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ متذکرہ دفعہ ریاستی پریس ایکٹ میں کہیں درج ہی نہ تھی۔ البتہ سرکار کے پاس جو پریس ایکٹ کی کاپی محفوظ تھی اس میں ٹائپ شدہ ایک صفحہ شامل کیا گیا تھا جو ترمیمی دفعہ کی نمائندگی کرتا تھا۔ اپریل ۱۹۶۴ء میں غلام محمد صادق نے مرکزی سرکار سے پریس سے متعلق قوانین اور ریاستی قوانین میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے حکومتِ ہند کو درخواست پیش کی کہ وہ پریس اور مطبوعات کا قانون ریاست ہذا پر بھی نافذ کرے اور ریاست جموں و کشمیر کو بھی پریس رجسٹرار آف انڈیا کے دائرہ عمل میں شامل کیا

جائے۔اس طرح سے ۶۷۔۱۹۶۶ء میں مرکزی پریس ایکٹ ریاست پرلاگو ہوتے ہی ریاستی پریس ایکٹ منسوخ ہوگیا۔جس کے بعد پوری ریاست میں اخبارات کی اشاعت کاایک بڑا سلسلہ شروع ہوگیا۔

۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۱ء وادی کشمیر سے،''آئینہ''،''ہماراکشمیر''،''کارواں''،''اذان''اور سرینگر ٹائمز'' جیسے نمائندہ اخبارات منظر عام پر آئے۔اس دور میں جموں سے جواخبارات شائع ہوئے اُن میں انگریزی ہفت روزہ ایکسیلشیر (Excelsior) سہد یورومترا کی ادارت میں شائع ہوا۔ یہ اخبار ۱۹۷۱ء میں روز نامہ بنا اور آج کل ریاست کے صفِ اول کے معیاری اخبارات میں شامل کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں یوگ راج آنند نے''آزاد ہند'' اورسی۔ایل۔ہانڈہ نےہفت روزہ''ریفارمر'' جاری کیا۔ ۱۹۶۵ء میں جی۔ڈی۔گپتا نےہفت روزہ'آزاد' اور کامریڈ جوگیندر سنگھ نےہفت روزہ''حق'' جاری کیا۔لیکن بہت کم وقت کے بعد ہی ان کی آزادی اورحق شناسی کا جذبہ مدھم ہوگیااوردونوں اخبار گمنامی کا شکار ہوگئے۔۱۹۶۵ء ڈوڈہ سے تعلق رکھنے والے محاذ دائے شماری کے سرگرم رُکن خواجہ عبدالغنی مست فریدی نے اخبار''محاذ'' جاری کیا جومحاذ رائے شماری کا ترجمان تھا۔لیکن چند شماروں کے اجراء کے بعد ہی اُنھیں جیل بھیج دیا گیااور دوسال کے بعد جب اُنھیں رہائی ملی تو اُنھوں نےہفت روزہ''تقویم'' نکالا۔۱۹۷۰ء میں انھیں پھر سے جیل بھین دیا گیا۔اس اخبار کوغلام نبی ہاگرو ایڈوکیٹ چھ ماہ تک اننت ناگ کشمیر سے بھی چھپواتے رہے۔جیل سے رہائی کے بعد اُنھوں نے ۱۹۷۵ء میں اسے پھر سے جاری کیالیکن اب''تقویم'' پھر سے تقویم پارینہ بن گیاہے اورکہیں نظر نہیں آتا۔

۱۹۶۶ء میں پریم بخشی نے ہفت روزہ''کشمیر پوسٹ'' نکالا جو بعد میں روزنامہ کی شکل میں شائع ہوتا رہا۔ سردار ہرچرن سنگھ نے اسی دوراں ہفت روزہ'وقت' جاری کیا تھاجو ۱۹۷۰ء میں روزنامہ بنااورقدرے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہونے لگا۔اس کے علاوہ اورکئی ہفت روزہ اخبار جاری ہوئے۔جن میں ہفت روزہ''جمہور'' اور ''چنگاری'' شامل ہیں۔

۱۹۶۷ء میں ہری اوم رینہ نے ہفت روزہ ''منظرِ بہارِ ہند'' بے تاب جے پوری نے ''فروغِ وطن'' نند گوپال باوا نے ہفت روزہ ''عوامی لہر'' اور رام لال ورمانے ''عوامی دور'' جاری کیا۔ ''عوامی دور'' نے کچھ خصوصی اور شاندار شمارے بھی نکالے جو صحافت کے اُونچے معیار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ''نوائے ڈُگر'' جو عرصہ پہلے بند ہو چکا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں ایس۔آر۔سدھیر نے پھر سے جاری کیا۔ ۱۹۶۹ء میں جتندر دیو شرما نے ہفت روزہ ''کواپر ٹیو بلیٹن'' پرکاش مہاشے نے 'جواہر نگار''، ایس۔پی۔ملہوترا نے ''بلڈرز'' بھگت سنگھ چاؔ کو نے ''پیغام نانک'' جاری کیا ''پیغامِ نانک'' زیادہ تر سکھ برداری کے مفادات کا ترجمان رہا اور باقی ماندہ اخبارات نے بھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

۱۹۷۰ء میں چودھری شبیر احمد سلاریہ نے ہفت روزہ ''البیان'' جاری کیا جس کا زیادہ تر جھکاؤ مسلم مفادات کی نگہداشت کی طرف رہا۔ازیں نانک چند نے ہفت روزہ ''عوامی عدالت''، چرن سنگھ نے ہفت روزہ ''آبگینہ'' سردار سنگھ نے ہفت روزہ ''دیہاتی سماچار'' اور وید پال دیپ نے ہفت روزہ ''جدوجہد'' جاری کیا۔ ''جدوجہد'' ٹریڈ یونین اور متوسط درجے کے سرکاری ملازمین کے مسائل کو اُبھارنے کے ساتھ ساتھ کچھ ادبی انشائیے بھی شائع کرتا رہا ہے۔ جن میں بیشتر مدیر کے ہی زورِ قلم کا نتیجہ ہوتے تھے۔ یہ اخبار اشترا کی فکر و فلسفہ کا ترجمان تھا۔اس دور میں شائع ہونے والے دوسرے اخبارات میں راج گپتا کا ہفت روزہ ''ایڈوایس'' مقبول حسین کاظمی کا ہفت روزہ ''تسکین'' جواب روزنامہ ہو گیا ہے۔ایس۔ایل سرین کا ہفت روزہ ''پابندی'' سردای لال کا ہفت روزہ ''پریت''، کیپٹن اُودھے چند کا ''راج سپیتاہ''، بشیر احمد ملک کا ''اُلصدا'' اور ارون سنگھ کا ''کوہ ہمالیہ'' قابل ذکر ہیں۔

غرض ساتویں دہائی کے دوران اس ریاست میں صحافت کو ایک جاندار تحریک ملی اور کئی نوجوان قلم کار فکر کی تازگی لیے ہوئے سامنے آنے لگے۔اس دور کے آس پاس منظرِ عام پر آنے والے دیگر اخبارات میں ''کشمیر سنسار''، مہلا پتریکا''، ''قومی محاذ''، ''جے جگت''، ''کسان''، ''کشمیر ایکسپرس''، ''سر سالار''، ''آواز جموں و کشمیر''، ''ڈوگرا ویرا'' ''امر جیت''، ''صحت''، ''اُستاذ''، ''صرافہ پتریکا''، ''انکشاف''، ''رتن''، ''جاگری''، ''ہموطن''، ''صدائے ڈوگر''، ''

دیپک‘‘، ’’ٹرانسپورٹ ڈرائیور گزٹ‘‘، ’’کارواں‘‘، ’’للکار‘‘، ’’جواہر‘‘، ’’وائس آف ملیز‘‘، ’’آنند‘‘، ’’امر سیوک‘‘، ’’آوازِ خلق‘‘، ’’بازگشت‘‘، ’’جے کے پتریکا‘‘، ’’ستارہ وائس‘‘، ’’قومی سماچار‘‘، ’’جلتا جموں‘‘، ’’تحریک‘‘، ’’مینارِ حق‘‘، ’’لوک آواز‘‘، ’’نصیحت‘‘، ’’پونچھ وائس‘‘، ’’سلامتی‘‘، ’’ضمیر خلق‘‘، ’’غلامی کو دور کرو‘‘، ’’مظلوموں کی فریاد‘‘، ’’سنہری شعاع‘‘، ’’شیر جموں‘‘، ’’یہ گلستان ہمارا‘‘، ’’پرستان ٹائمز‘‘، ’’ہندوراج‘‘، ’’رنبیر سماچار‘‘ اور ’’لیڈر‘‘ وغیرہ شامل ہیں۔ ان اخبارات میں سے تو بیشتر بند ہو چکے ہیں۔ سوائے چند کے باقی سب بے قاعدہ اشاعت کے شکار ہیں۔

۱۹۷۵ء میں شیخ محمد عبداللہ دوبارہ کشمیر ایکارڈ (Kashmir Accord) کے تحت برسر اقتدار آئے۔ اُنھوں نے فوری طور پر صحافیوں کے مسائل کے بارے میں زیادہ توجہ نہیں دی لیکن اخبارات سے متعلق مروجہ پالیسی کو جاری رکھا۔ پورے ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کے دوران بھی ریاستی پریس کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اُن کی حکومت کے دور آغاز میں ریاض پنجابی نے انگریزی ماہنامہ ’’ایکارڈ‘‘ جاری کیا لیکن ایک یا دو شماروں کے بعد ہی ایکارڈ بند ہو گیا۔ وادیٔ کشمیر سے بھی اس دوران کئی اخبارات کا اجرا ہوا۔ جموں سے آر۔ ایس مکت نے ’’قومی آواز‘‘ اور نادم کوہلی نے ’’ترجمان السحر‘‘ جاری کیا، اس کے ایک سال بعد جے بی چوپڑہ نے ’’ٹائمز آف کارٹونز‘‘، راکیش گپتا نے ’’شو جموں‘‘ اور ستیش لنگر نے ’’وصیت‘‘ جاری کیا۔ یہ اخبارات تو آغاز میں نئی اُمنگوں کے ساتھ اُبھرے لیکن رفتار زمانہ کے ساتھ سُست خرامی کا شکار ہو گئے۔

۱۹۷۷ء میں غلام رسول آزاد نے ناظم تعلیمات جموں و کشمیر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد ہفت روزہ ’’دہر‘‘ بھدرواہ سے جاری کیا لیکن یہ پرچہ بھی چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۷۸ء میں تاج بھٹی نے ’حق گو‘ آر۔ سی کپور نے الجھنیں جاری کیا۔ ۱۹۷۹ء میں انیل سہگل نے ’’جموں ایکسپریس‘‘، کلدیپ شرما نے ’’دھرم لوک‘‘ اے۔ جی ملہوترہ نے ’’کام‘‘ اور سردار مہندر سنگھ نے پندرہ روزہ ’’نیوز اینڈ یوز‘‘ انگریزی زبان میں جاری کیا جو محکمہ تعلیم کے مسائل کو خاص طور سے نمایاں کرتا رہا۔ اس کے علاوہ بابو ملکھی رام نے ’’صبح جموں‘‘، جاوید اختر نے

''لازوال کل''اور پی این کول نے ''جشن شکتی'' جاری کیا جو بعد میں پی ۔ گے گنجو کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔

۱۹۸۱ء میں سائیں داس نے ''امر سیوک'' کرن سنگھ نے ''سلامتی'' سر جیت سنگھ ستارہ نے ''بے کفن جنازہ'' ایوب شبنم نے ماہنامہ ''ستاروں سے آگے'' سریندر کھجوریہ نے ''شیر بھارت'' سائیں داس نے ''آس'' اور غلام رسول نے ''حمایت'' جاری کیا۔ان اخبارات میں سے کچھ تو ابھی شائع ہو رہے ہیں اور کچھ بند ہو گئے ہیں۔

۱۹۸۲ء میں شائع ہونے والے اخبارات میں دیوی داس کا ''کرشنا جموں'' جگل مہاجن کا ''ترکوٹہ ایکسپریس'' ، اشوک کمار کا ''کاشانہ'' جگل کشور کا ''جیک ٹائمز'' ،عبدالعزیز قریشی کا ''حب الوطن'' کے علاوہ ''پس ماندہ عوام''، ''زادراہ'' اور ''دیدار'' وغیرہ اخبارات کے نام لیے جا سکتے ہیں۔اپریل ۱۹۸۲ء میں بھلیسہ (ڈوڈہ) کے دور افتادہ علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان محمد شریف نے ''راہ منزل'' جاری کیا۔ جو ۱۹۸۸ء میں روزنامہ ہو کر خرامِ سفر ہے۔ان اخبارات کے علاوہ سوشیل کمار کا ہفت روزہ ''میرا خیال'' اور اے۔ کے۔ بدید کا ''ہل پوسٹ'' کا نام بھی شامل ہے۔

اپریل ۱۹۸۵ء میں کشتواڑ سے تعلق رکھنے والے ایس اقبال دیو نے ''مادرِ ہند'' جاری کیا۔اس اخبار میں زیادہ تر ضلع ڈوڈہ کے مسائل کو اُبھارا جاتا ہے۔اس پرچہ کے ابتدائی شماروں میں ولی محمد اسیرؔ کی قلمی معاونت کا زیادہ ہاتھ رہا ہے۔ایس اقبال اب اس کو روزنامے کی شکل میں شائع کر رہے ہیں۔اس سال کے دوران شائع ہونے والے اخبارات میں ''نوائے جموں''، ''ہندوراج'' اور ''پونچھ وادی'' کے نام شامل ہیں۔نومبر ۱۹۸۶ء کو ڈوڈہ کے ایک نوجوان صحافی آصف جان نے ''عدل وانصاف'' جاری کیا جو کچھ عرصہ آفسیٹ پر چھپا۔اب گاہے بگاہے اس انگریزی شمارہ بھی شائع ہوتا ہے۔اکتوبر ۱۹۸۵ء میں ارشد حسین رشید اور ساغر حسین جموال نے ''ضمیر خلق' جاری کیا۔ دسمبر ۱۹۸۶ء تک اس کے پس منظر میں محمد بشیر زرگر وغیرہ شائع کرتے رہے اور جنوری کے شمارے میں اس کے چیف ایڈیٹر ہو گئے۔اُس وقت بیتاب جے پوری اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔گذشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر پھیلے

ہوئے صحافت کے اس طویل سفر میں ریاست کے کالجوں، ہائر اسکینڈری اسکولوں اور کئی ادبی تنظیموں کی جانب سے کئی سالنامے اور میگزین شائع ہوتے رہے۔ ان جرائد ورسائل کے ذریعے کئی نئے قلم کاروں کو اُبھرنے اور اپنی شناخت کرانے کا موقع ملا۔ ایسے رسائل میں فروغ اُردو (جموں)، دھنک (راجوری)، چوگان (کشتواڑ)، شاہین (بھدرواہ)، سراج (ڈوڈہ)، رازویر (راجوری)، نوائے فریدیہ (ڈوڈہ)، لولاب (بانہال) ،صحرا اور پھول (راجوری)، العطش (،جموں) نوید صبح (ڈوڈہ)، روشنی کا سفر (ڈوڈہ)، بازیافت (شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی)، تسلسل (شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی) اور ترسیل (ڈی ڈی ایس کشمیر یونیورسٹی) کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔ ریاستی کلچرل اکادمی سے شائع ہونے والا دو ماہی ''اُردو شیرازہ'' اس وقت واحد اُردو جریدہ ہے جو پوری ریاست کی علمی اور ادبی کاوشوں کی ترجمانی میں مصروف ہے۔ اور اس کا شمار ملک کے نمائندہ اُردو جرائد میں کیا جاسکتا ہے۔ یہ جریدہ ابتدا میں جناب محمد یوسف ٹینگ کی زیرنگرانی اور محمد اندرابی کی ادارت میں پوری آب وتاب کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اب محمد اشرف ٹاک کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ محکمہ اطلاعات کا رسالہ ''تعمیر'' بھی غلام رسول بڈھانہ کی ادارت میں برسوں شائع ہوتا رہا۔ لیکن ان دنوں اس کی اشاعت تقریباً بند ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو صحافت کی صورت حال دوسری ریاست سے بہتر ہے۔ آج کی تاریخ میں اُردو کے جو اخبارات اور رسائل پوری آب وتاب کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ان میں ''کشمیر عظمیٰ'' اور ''اُڑان''، بیک وقت جموں اور کشمیر دونوں جگہوں سے شائع ہوتے ہیں۔ سرینگر سے ''اطلاعات'' اور جموں سے ''تسکین'' بھی پابندی سے شائع ہونے والے اخبارات ہیں ان کے علاوہ بھی متعدد ہفتہ وار اور روز نامے شائع ہورہے ہیں لیکن یہ عوامی مقبولیت حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ ادبی رسائل میں بزم ادب (مدیر ابن اسماعیل) اور لفظ لفظ (مدیر زاہد مختار) کشمیر سے شائع ہو رہے ہیں۔ راجوری (جموں) سے رسالہ ''تفہیم''، محمد عمر کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

جموں وکشمیر میں اردو صحافت کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد بہتر ہوگا کہ ریاست کے تینوں خطوں جموں، کشمیر اور لداخ میں اردو صحافت کی موجودہ صورتِ حال کا انفرادی طور پر جائزہ لیا جائے۔

جموں سے شائع ہونے والے اخبارات کا انداز و مزاج

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے آج کی تاریخ میں (Registered Newspaper of India) RNI کے مطابق ریاست جموں وکشمیر سے ۳۵۰ (تین سو پچاس) سے زائد روزنامے اور ہفتہ وار شائع ہوتے ہیں۔ لیکن ان اخبارات میں کئی ایسے اخبارات بھی شامل ہیں جو کچھ عرصے تک اپنی کوششوں سے تھک ہار کر بند ہو گئے ہیں۔ لیکن ۲۰۱۳ء میں ہی ریاست جموں وکشمیر کے ۴۳ ایسے اخبارات ہیں جو DAVP میں اپنا اندراج کروائے ہوئے ہیں۔ جو ایک اچھی خاصی تعداد کہی جا سکتی ہے۔ ان میں سے ۹۰ فیصد اخبارات محض کاروباری مقاصد کے لئے شائع کئے جاتے ہیں۔ بقیہ ۱۰ فیصد میں بھی چند ایسے اخبارات ہیں جنھیں لوگ پیسے خرچ کر کے خریدنا چاہتے ہیں۔ اکثر اخبارات تو ایسے ہیں جو سرکولیشن کے اعتبار سے گرچہ چونکا دینے والے ہیں مگر لوگوں کی ایک کثیر تعداد ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ لیکن جموں وکشمیر کے کچھ اخبارات ایسے بھی ہیں جو گرچہ مکمل اخبارات کہنے کے مستحق نہیں ہیں پھر بھی ان کا معیار اور مزاج متاثر کرنے والا ہے۔ ان اخبارات میں صوبہ جموں سے شائع ہونے والے اخبارات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ روزنامہ کشمیر اعظمیٰ — مدیر- رحمت اللہ رونیال

۲۔ روزنامہ ہند سماچار — مدیر- گوپال داس سچر (جموں ایڈیشن ۲۰۱۳ء سے شائع ہو رہا ہے)

۳۔ روزنامہ اڑان — مدیر- اقبال حسین شاہ

۴۔ روزنامہ مادر ھند — مدیر- اقبال دیو کشتواڑی

۵۔ روزنامہ تسکین — مدیر- سید مقبول حسین کاظمی

۶۔ روزنامہ عمارت ، مدیر- کلدیپ گپتا

۷۔ روزنامہ ڈوگرہ نیوز مدیر- جتندر کمار شرما

۸۔ روزنامہ راہ منزل مدیر- ایم۔ایس۔سرتاج

۹۔ رونامہ سندیش مدیر- بیگم عمرانہ سمنانی

۱۰۔ روزنامہ بھدرواہ ٹائمز مدیر- نصرت بشیر

ہندوستان کی دیگر اردو اخبارات کی طرح جموں کشمیر کے اخبارات کے مزاج پر بھی مذہبیت غالب ہے۔ عام طور پر روزمرہ کے مسائل پر مبنی اداریوں اور خبروں کے علاوہ جموں کے اردو اخبارات میں بھی مذہبی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔لیکن ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہونے والے اخبارات سے مختلف سماجی، سیاسی اور ثقافتی موضوعات پر لکھے گئے مضامین اور کالم بھی نقل کر کے شائع کیے جاتے ہیں۔جموں سے شائع ہونے والے اُردو اخبارات میں باضابطہ طور پر پابندی سے لکھنے والے کالم نگاروں کی تحریریں شائع نہیں ہوتی ہیں بلکہ مذہبی اداروں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں سے وابستہ دانشوروں کے مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔جموں سے شائع ہونے والے اخبار روز نامہ ’’اُڑان‘‘ اور ’’کشمیر اعظمیٰ‘‘ میں ہفتہ میں ایک بار ادبی صفحہ بھی شائع کیا جاتا ہے جس میں ادبی مضامیں، افسانے اور غزلیں اور نظمیں وغیرہ شائع کی جاتی ہیں لیکن چونکہ ان اخبارات کے ادارتی بورڈ میں بہت زیادہ تعلیم یافتہ باصلاحیت اور باذوق افراد کم ہی ہیں اس لئے اکثر و بیشتر مضامین اور ادبی تخلیقات میں املا کی غلطیاں اور کتابت کی خامیان ہوتی ہیں۔

جموں سے شائع ہونے والے اُردو اخبارات عام طور پر کسی خاص سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں ہیں۔اسی لئے ان اخبارات میں ریاست کی تمام سیاسی پارٹیوں کی خبریں یکساں طور پر شائع ہوتی ہیں۔لیکن پھر بھی جموں کے اخبارات فرقہ پرست جماعتوں پر تعمیری نکتہ چینی کرتے ہیں اور ساتھ ہی مسلم دشمنی اور ریاست و ملک کے خلاف سرگر

میوں کا پردہ فاش بھی کرتے ہیں۔ چونکہ ریاست جموں اور کشمیر میں تمام مذاہب کے ماننے والے لوگ بستے ہیں اس لئے اُردو اخبارات کردار اور مزاج کے اعتبار سے سیکولرزم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر تے ہیں۔ جموں کے اُردو اخبارات میں مختلف قبائل خاص طور پر گوجر، پہاڑی، کشمیری، ڈوگرہ وغیرہ کے مسائل پر خبریں اور مضامین وغیرہ خصوصیت کے ساتھ شائع کیے جاتے ہیں۔

جموں کے اُردو اخبارات میں کھیل کی خبریں پابندی کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فلمی دنیا کی بھی تازہ ترین خبریں دی جاتی ہیں۔ کھیل کی خبروں میں مقامی سرگرمیوں کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن قومی اور بین الاقوامی کھیلوں کی خبریں اور تبصرے نمایاں طور پر شائع کیے جاتے ہیں۔ روزنامہ ''اُڑان'' میں ہفتہ میں ایک دن خواتین کے مسائل پر مضامین اور کالم شائع ہوتے ہیں۔ جب کہ ایک دن کسی دینی عالم سے شرعی مسائل پر مبنی سوالات کے جوابات حاصل کر کے شائع کیے جاتے ہیں۔ جو عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ جموں کے اُردو اخبارات میں عام طور پر صرافہ بازار کی خبریں نہیں ہوتی ہیں لیکن اکثر و بیشتر بعض ضروری اشیاء سونا، چاندی، پٹرول، چاول، تیل وغیرہ کی بڑھتی ہوتی قیمتوں کے بارے میں خبریں شائع کی جاتی ہیں۔

جموں سے شائع ہونے والے اُردو اخبارات میں اُڑان اور کشمیر اعظمیٰ کے صفحات کی تعداد بارہ (۱۲) ہوتی ہے لیکن زیادہ تر اخبار آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اکثر اخبارات باتصویر ہیں لیکن ان میں رنگین تصاویر صرف صفحہ اول اور آخر میں ہی دی جاتی ہیں۔ اندر کے صفحات پر سفید اور سیاہ تصویریں ہی ہوتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ بہتر نہیں ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے جموں میں ابھی، بھی جدید ترین اور ترقی یافتہ پرنٹنگ پریس قائم نہیں ہوئے ہیں۔ روزنامہ ''اُڑان'' روزنامہ ''کشمیر اعظمیٰ'' اور روزنامہ ''تسکین'' کے علاوہ غالباً جموں کے کسی اور اُردو اخبار کا اپنا پرنٹنگ پریس نہیں ہے۔

جموں کے اُردو اخبارات کے مزاج اور صحافتی انداز کے حوالے سے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان

اخبارات میں تربیت یافتہ اور صنعت یافتہ صحافی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ادارتی بورڈ میں بھی الگ الگ میدانوں کے ماہر نہیں ہیں۔ عام طور پر دو چار صحافی ملازمین ہی سیاسی، سماجی، ادبی اور دیگر سرگرمیوں کے بارے میں خبریں یا تبصرے تیار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان خبروں اور تبصروں میں وہ معیار نہیں ہوتا جو جموں سے شائع ہونے والے انگریزی اور ہندی کے بعض اخبار میں نظر آتا ہے چونکہ یہی وجہ ہے کہ جموں کا ترقی یافتہ طبقہ انگریزی اخبارات سے ہی اپنی معلومات کی پیاس بجھاتا ہے کیونکہ انگریزی اور ہندی اخبارات میں اول تو سرمائے کی کمی نہیں ہے دوئم ادارتی بورڈ میں تربیت یافتہ اور باصلاحیت لوگ موجود ہیں۔ ساتھ تازہ ترین خبروں کے وصول کے لئے ان کے نامہ نگار سیاسی اور سماجی شخصیتوں سے رابطہ بنائے رکھتے ہیں۔ اسلئے جموں کے اُردو اخبارات میں انگریزی اور ہندی اخبارات کے مقابلے میں تازہ ترین خبریں اور حکومت اور سیاست کے اندر کی باتوں پر تبصرے کم ہی ہوتے ہیں۔ جموں سے اب ملک کے ایک بڑے اخبار ہند سماچار کا اُردو ایڈیشن بھی شائع ہونے لگا ہے چونکہ یہ ایک بڑا اخبار ہے اور آزادی کے قبل سے ہی متحدہ ہندوستان کے کئی مقامات سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اس لئے مالی اعتبار سے ہند سماچار ایک مضبوط صحافتی ادارہ ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جموں سے شائع ہونے والے ہند سماچار بڑی حد تک ایک مکمل اُردو اخبار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے بڑے صحافتی اداروں میں سہارا گروکا اخبار ''راشٹریہ سہارا'' ہندوستان کے کم وبیش تمام ریاستی راجدھانیوں سے شائع ہوتا ہے لیکن ابھی تک اس کی اشاعت جموں یا کشمیر سے شروع نہیں ہوئی ہے اگرچہ بار بار اس کا اعلان کیا جاتا رہا ہے۔

بحیثیت مجموعی جموں سے شائع ہونے اُردو اخبارات کا صحافتی مزاج اور معیار تشفی بخش ہے لیکن اس میں اور بہتری اور عمدگی لانے گنجائش ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جموں کے اخبارات مسلم دوستی کے باوجود تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے نہ صرف دور ہیں بلکہ ان کی مخالفت بھی کرتے رہتے ہیں۔ جموں کے اخبارات کے قارئین جموں شہر سے زیادہ سرحدی علاقوں پونچھ، راجوری، مینڈھر، ڈوڈھ، کشتواڑ، بھدرواہ وغیرہ میں زیادہ ہیں۔ جموں کے اُردو

اخبارات کوسرکاری اشتہارات کے معاملے میں ویسا تعاون حاصل نہیں ہے جیسا کہ انگریزی اور ہندی کے اخبارات کو حاصل ہے۔دوسری بات یہ کہ جموں کے اکثر و بیشتر اخبارات کے مالکان خود صحافی نہیں ہیں اور صحافت کو بھی مالی اور سیاسی مفاد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں جبکہ صحافت ہندوستان جیسے ملک میں جمہوریت کا ایک اہم ستون ہے اور اگر اس میں سنجیدگی نہ برتی جائے تو نہ صرف عوام اور ملک کا نقصان ہوگا بلکہ جمہوریت کو بھی نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے اسلئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جموں کے وہ اخبارات جو مالی اعتبار سے مضبوط ہو چکے ہیں تربیت یافتہ صحافی، دانشوروں اور ادیبوں کی خدمات حاصل کر کے صحافت کے معیار کو بلند کرنے پر سنجیدگی سے توجہ دیں۔

سرینگر سے شائع ہونے والے اخبارات کا انداز و مزاج

ایک اندازے کے مطابق آج کی تاریخ میں کشمیر سے شائع ہونے والے چھوٹے بڑے اخبارات کی تعداد دسو کے قریب ہے۔مرکزی حکومت کے ادارے ڈی۔اے۔وی۔پی(DAVP) ۲۰۱۳ء میں رجسٹراڈ اُردو اخبارات کی تعداد بائیس (۲۲) ہے جنھیں DAVP کی جانب سے اشتہارات ملتے ہیں لیکن ان اخبارات میں درجہ ذیل اُردو اخبارات ایسے ہیں جو پابندی سے شائع ہورہے ہیں اور جو کشمیر کے عوام تک پہنچتے بھی ہیں۔مثلاً

۱۔ روزنامہ آفتاب — مدیر - ڈاکٹر طاہر غلام میر

۲۔ روزنامہ کشمیر اعظمیٰ — مدیر - فیاض احمد کلو

۳۔ روزنامہ عقاب — مدیر- منظور انجم

۴۔ روزنامہ آفاق — مدیر- غلام جیلانی قادری

۵۔ روزنامہ روشنی — مدیر- عزیز کشمیری

۶۔ روزنامہ جنگ — مدیر- طارق سلیم

۷۔ روزنامہ انڈین ٹائمز — مدیر- فاروق اندرابی

۸۔ روزنامہ وادی کی آواز مدیر- غلام نبی شیدا

۹۔ روزنامہ سرینگر ٹائمز مدیر- بشیر احمد بشیر

۱۰۔ روزنامہ صبحِ کشمیر مدیر- نذیر احمد وانی

۱۱۔ رازنامہ خدمت مدیر- نذیر احمد بٹ

۱۲۔ روزنامہ کشمیر ریز مدیر- پرنس پرویز

۱۳۔ روزنامہ تعمیل ارشاد مدیر- آکاش امین بٹ

۱۴۔ روزنامہ ندائے مشرق مدیر- عبدالرشید شاہ

۱۵۔ روزنامہ شہربین ٹائمز مدیر- شیخ راقب ماجد

کشمیر میں اُردو صحافت کی بنیاد بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے ابتدائی برسوں میں رکھی گئی تھی ۔ مارتنڈ، ہمدرد، وتستا، خدمت، وکیل اور خالد جیسے اخبارات نے کشمیر اُردو صحافت کے معیار اور مزاج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان اخبارات کی اشاعت سے پہلے غلام رسول مہر اور عبدالمجید کے اخبار ''انقلاب'' اور ''تحریکِ کشمیر'' اور ریاست جموں کشمیر کے عام عوامی مسائل کی خبریں شائع ہوتی تھیں ۔ بلکہ شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سوانح حیات ''آتش چنار'' میں لکھا ہے کہ لاہور سے شائع ہونے والے اخبار انقلاب نے جس طرح تحریک آزادیِ کشمیر کی حمایت کی وہ ایک یادگار رہے۔ حالانکہ تحریکِ کشمیر حمایت اور ڈوگرہ راج کی مخالفت کی بنا پر بار بار روزنامہِ انقلاب پر پابندیاں عائد کی گئی اور جرمانے بھی لگائے گئے ۔ لیکن جب ۱۹۲۴ء میں جموں سے ملک راج صراف کی ادارت میں اخبار ''رنبیر'' کی اشاعت شروع ہوئی اور مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست سے اخبار جاری کرنے اور پریس قائم کرنے پر عائد پابندی ختم کردی تو پھر جموں کے ساتھ ساتھ کشمیر میں بھی نہ صرف چھاپہ خانے قائم ہوئے بلکہ ہفتہ وار اور روزنامہ کی اشاعت کا باضابطہ آغاز بھی ہوا۔ مارتنڈ اور ہمدود سے لے کر آج کے اخبار ''آفتاب'' اور ''سرینگر ٹائمز'' کشمیر

میں اُردو صحافت نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔اس کی تفصیل میں نے باب چہارم کے ابتدائی صفحات پر پیش کر دی ہے۔ جہاں تک آج کی تاریخ میں شائع ہونے والے اُردو خبارات کے صحافتی انداز اور مزاج کا سوال ہے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ گذشتہ بیس پچیس برسوں سے کشمیر کا سماج، کشمیر کی سیاست اور کشمیر کے ادب کے ساتھ ساتھ صحافت پر بھی دہشت گردی کا سایہ رہا ہے۔ خاص طور پر کشمیر کی آزادی کے حامی بندوق برداروں کا اُردو اخبارات پر بہت زیادہ دباؤ رہا ہے۔اپنی مرضی کی خبریں، کالم اور مضامین شائع کروانے کے لئے بندوق برداروں نے صحافیوں پر ہمیشہ دباؤ ڈالا۔ کشمیر کے اُردو اخبارات حق گوئی پر عمل کرتے ہوئے حریت پسندوں کی سرگرمیوں کے علاوہ پولیس اور فوج کے ہاتھوں ہونے والی زیادتیوں کی خبریں بھی شائع کرتے رہے۔۱۹۸۹ء کے بعد تقریباً دو دہائیوں تک کشمیر کے لوگ موت کی فصلیں کاٹتے رہے۔اندر اور باہر کی سازشوں اور مداخلتوں کی وجہ سے عام لوگوں کے علاوہ اُردو صحافیوں کو بھی جانے اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔کئی صحافیوں کو اپنی جان بھی گنوانی پڑی۔ دوسری جانب ''حریت کانفرس'' کی کال call پر ہونے والی ہڑتالوں ،فوج کی طرف سے ہونے والے کریک ڈاون، انٹروگیشن وغیرہ کے حوالے سے عوامی سطح پر جو مسائل پیدا ہو رہے تھے اور حکومت کی جانب سے ان کے سدباب کے لئے جو اقدامات لئے جا رہے تھے۔اُن سب کی خبریں شائع کرنا صحافیوں کا فرضِ منصبی تھا لیکن ایک طرف کچھ خوف اور دوسری طرف کچھ پابندیاں انھیں حقیقت پسندی سے کام لینے میں روکتی بھی رہی لیکن ان سارے حالات کے باوجود کشمیر میں اُردو اخبارات شائع ہوتے رہے۔

بحیثیت مجموعی کشمیر سے شائع ہونے والے اکثر و بیشتر اُردو اخبارات کا انداز اور مزاج حقیقت پسندانہ رہا ہے خاص طور پر روزنامہ آفتاب اور روزنامہ سرینگر ٹائمیز اپنی غیر جانبدارانہ رپوٹنگ ،تبصروں اور اداریوں کے لئے عوام اور خواص کے درمیان احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔روزنامہ ''آفتاب'' کے مدیر جناب ثنا اللہ بٹ جب تک زندہ رہے اپنے مستقل طنزیہ اور مزاحیہ کالم ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' میں روزمرہ کے عام و خاص مسا

ئل، حریت پسندوں، پولیس اور فوج کی زیادتیوں ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے غیر منطقی رویّوں کو اپنے طنزیہ لیکن تعمیری نقطہ چینی کا نشانہ بناتے رہے۔ خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے ایک بے حد مقبول کالم رہا ہے جسے لوگ آج بھی یاد رکھتے ہیں۔ اسی طرح سرینگر ٹائمیز میں اداریئے، خبریں، کالم اور مضامین کے علاوہ سب سے زیادہ توجہ کا مرکز اُس کا کارٹون رہا ہے۔ یہ کارٹون بی بی اے کے نام سے روزانہ شائع ہوتا تھا۔ بعض اوقات جو بات طویل مضمون یا کالم میں نہیں کہی جا سکتی تھی وہ بات کارٹون کے اندر سے بڑی کامیابی سے نکلتی تھی۔ کاری کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھی۔ کشمیر کے بقیہ اخبارات بھی صحافت کے معیار کو بلند رکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن جو ذہانت اور صلاحیت ''آفتاب'' اور سرینگر ٹائمز'' کے مدیروں کے اندر تھی وہ دوسروں کے یہاں کم تھی۔ اسی لئے اگرچہ متعدد روز نامے نکل رہے ہیں ''آفتاب'' اور سرینگر ٹائمز'' جیسی مقبولیت کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ البتہ اس دوران شمیم احمد شمیم کی ادارت میں جو اخبار ''آئینہ'' کے نام سے جاری ہوا تھا وہ چند برسوں میں ہی کشمیر کا سب سے مقبول اور معیاری اخبار تسلیم کیا جانے لگا تھا لیکن شمیم احمد شمیم کی ناوقت موت کے بعد یہ اخبار کچھ برسوں کے بعد ہی بند ہو گیا۔

ان دنوں کشمیر کا سب سے بڑا اخبار ''کشمیر عظمیٰ'' مانا جاتا ہے۔ یہ اخبار کشمیر کے انگریزی اخبار Greater Kashmir کے ادارے سے شائع ہوتا ہے۔ کشمیر عظمیٰ بیک وقت جموں و کشمیر دونوں جگہوں سے شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کا معیار کشمیر کے دوسرے روز ناموں مثلاً عقاب، روشنی اور آفاق کے جیسا ہی ہے لیکن اس اخبار کا مزاج اور انداز اصلاحی اور حق پسندی سے زیادہ کاروباری ہے۔ اس اخبار کا تعلق کسی خاص سیاسی جماعت سے نہیں لیکن کاروباری مصلحت کی بنا پر کشمیر عظمیٰ میں ریاستی اور مرکزی حکومت کی پالیسیوں اور عوام کے مسائل حل کرنے میں ناکامیوں پر ایماندانہ نکتہ چینی نہیں کی جاتی ہے۔ کشمیر عظمی اور دیگر اخبارات میں مذہبی موضوعات پر مضامین اور کالم زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ یا پھر پاک تنازعہ، مسلۂ کشمیر، ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق اور حریت پسندوں کی سرگرمیوں سے متعلق مواد زیادہ شائع کیے جاتے ہیں۔

کشمیر عظمیٰ اور دیگر اخبارات میں ہفتہ وار ادبی صفحات بھی شائع ہوتے ہیں جن میں تنقیدی اور تحقیقی مضامین، نظمیں اور غزلیں وغیرہ شائع ہوتی ہیں۔ان دنوں کشمیر عظمیٰ میں جموں وکشمیر کی نمائندہ ادبی،سماجی اور سیاسی شخصیتوں کے مضامین اور انٹرویو بھی شائع ہورہے ہیں۔

بحیثیت مجموعی جموں کی طرح کشمیر کے اُردو اخبارات کا انداز اور مزاج اطمینان بخش،سیکولر اور تعمیری ہے لیکن مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے ان اخبارات کو اور زیادہ معیاری اور حقیقت پسند بنانے کی ضرورت ہے۔

(برقی صحافت (ریڈیو،ٹیلی ویژن)

آج کل کے اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے دور میں کسی بھی زبان کو فروغ دینے میں ذرائع ابلاغ یعنی ٹی۔وی اور ریڈیو اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ہماری ریاست جموں وکشمیر میں بھی ریڈیو،ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے ذریعے برصغیر کے دیگر علاقوں اور دنیا کے دور دراز ملکوں تک آپنی آواز پہنچانے اور دنیا میں عالمی سطح پر ہونے والی ترقی اور تبدیلیوں سے اثر قبول کر کے اپنی اجتماعی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے سلسلے میں مذکورہ بالا ذرائع کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح ریاست جموں وکشمیر میں بھی ریڈیو اور ٹی۔وی جیسے ادارے معلوماتی ہی نہیں تفریح اور ترقی کے اہم ذرایع ثابت ہوتے ہیں۔اور اگر دیکھا جائے تو کا دور برقی ذرائع ابلاغ کا ہے، اسلئے اخباری صحافت کے ساتھ ساتھ برقی صحافت کی اہمیت بھی جموں کشمیر میں دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔

دراصل برطانوی تسلط سے برصغیر کی آزادی،تقسیمِ ملک اور کشمیر پر قبائلی حملہ کے بعد حکومتِ ہند نے شدت کے ساتھ کشمیر میں ریڈیو اور ٹی۔وی اسٹیشن قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ریاست میں ریڈیو اسٹیشن سب سے پہلے سرینگر میں ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔

آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے بعد ریڈیو کشمیر سرینگر ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو کہ زیادہ سے زیادہ پروگرام اُردو زبان میں نشر کرتا ہے۔کبھی کبھی یہاں پر شاعروں اور ادیبوں کو دعوت بھی دی جاتی ہے اور اس طرح سے لوگوں کو ان

شاعروں کے بارے میں روشناس کیا جاتا ہے۔ چونکہ دوردراز علاقوں میں جہاں ٹی۔وی اخباراور دوسری سہولیات موجود نہیں۔ریڈیو ہی ایک ایسا آلہ ہے کہ جس سے وہاں کے لوگ بیرونی دنیا سے جڑے رہتے ہیں۔لہذا ان دوردراز علاقوں میں اُردوزبان ریڈیو کے ذریعے ہی لوگوں تک پہنچی۔یہ ریڈیو کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

ریڈیو کشمیر سرینگر کے ابتدائی پروگرام ترتیب دینے میں اُردو کی چند اہم شخصیات کا ہاتھ رہا ہے۔ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، کمال احمد صدیقی، پردیسی، ٹھاکر پونچھی، پشکر بھان، سوم ناتھ سادھو، علی محمد لون، غلام رسول نازکی، عرش صہبائی اور دوسرے لوگوں نے مباحثوں، ڈراموں اور موسیقی سے ریڈیو کے پروگرام میں ایک نئی روح پھونک دی اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دوسری چیزوں کے علاوہ ڈرامے کو خاص طور سے ریڈیو نے ہی مقبول خاص وعام بنایا۔

۱۹۶۵ء میں ریڈیو کشمیر جموں نے کام کرنا شروع کیا۔اس ادارے نے بھی اُردو کے فروغ کی خاطر کافی کام کیا۔ لیکن ریڈیو کشمیر سرینگر کے مقابلے میں یہ کام سورج کے سامنے چراغ کی مانند ہے۔لیکن پھر بھی اسے فراموش یا نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۳ء تک ریڈیو کشمیر جموں سے ایک اُردو پروگرام ''محفل'' عنوان کے تحت آتا تھا۔اور کم سے کم چارسو پروگرام ۱۹۷۳ء تک نشر ہوئے۔اس وقت بھی ایک ادبی پروگرام ریڈیو کشمیر جموں سے ''خرمن'' نشر ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ ریڈیو کشمیر جموں سے ایف۔ایم پروگرام ''کہکشاں'' نشر ہوتا ہے۔یہ پروگرام نئے قلم کاروں کے لیے مخصوص ہے۔لیکن ریڈیو کشمیر جموں نے کوئی خاص کارنامہ اُردو کے حوالے سے انجام نہیں دیا۔البتہ اس دور میں جب کہ اُردو کے نامور ادیبوں کی سرپرستی اس کو حاصل تھی۔ریڈیو کشمیر جموں نے بھی کئی اہم کارنامے انجام دئے۔ریڈیو کشمیر جموں کے پہلے ڈائریکٹر اُردو کے نامور ادیب راجندر سنگھ بیدی تھے۔

اُردو کی نامور شخصیات جیسے غلام رسول نازکیؔ، پران کشور، علی محمد لون، جتندر رادھم، پوری، زبیر رضوی، عبدالمغنی شیخ، مظہر امام، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس اور دوسرے لوگوں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران اُردو کی خاطر

اپنا خونِ جگر دیا اور اُردو کو مقبول بنایا۔ انہوں نے تحریری ڈراموں کو بھی مقبول بنایا۔ اب تک سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں تحریری ڈرامے نشر ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو کشمیر سرینگر سے خبریں، ڈرامے اور مشاعرے وغیرہ نشر ہوتے رہتے ہیں۔

ریڈیو کشمیر سرینگر سے سب سے پہلا اُردو ڈرامہ ''چودہ گولیاں'' کے عنوان سے نشر ہوا۔ یہ ڈرامہ خواجہ احمد عباس کا تھا۔ اس کے بعد یہاں سے بے شمار اُردو ڈرامے نشر کئے گئے۔ ان میں سے بعض ڈرامے قومی ایوارڈ کے لئے منتخب ہوئے۔ ڈراموں اور دوسری چیزوں کے علاوہ ریڈیو کشمیر سرین گر سے وقتاً فوقتاً آل انڈیا مشاعروں کا انعقاد بھی ہوتا ہے اور قیام سے اب تک یہ روایت جاری وساری ہے۔

ریڈیو کے سامعین کی دلچسپی کو مدِنظر رکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً کئی ادبی اور ثقافتی پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔

مختصراً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ریڈیو کشمیر سرینگر بلکہ ریڈیو نے اُردو زبان کے فروغ کی خاطر اہم رول ادا کیا۔ اور نہ صرف ریڈیو کشمیر سرینگر بلکہ ریڈیو کشمیر جموں، پونچھ اور لداخ بھی اُردو کی بقا کی خاطر کام کر رہے ہیں۔ اُردو کے معیاری پروگرام نشر کرتے ہیں۔

ریاست میں ٹی۔ وی نے بھی اُردو کے فروغ کی خاطر کافی کام کیا اور اس وقت بھی کر رہا ہے۔ ''کشمیر دوردرشن'' ۱۹۷۳ء میں قائم کیا گیا۔ دوردرشن جموں اس کے بعد وجود میں آیا اور گزشتہ چند برسوں سے اس نے بھی کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ اب ''کاشر چینل'' بھی شروع کیا گیا ہے۔ یہ تمام ادارے اُردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دراصل دوردرشن کیندر ایک ثقافتی ادارہ ہے جو اکثر و بیشتر اُردو زبان میں ڈرامے، خبریں، فیچر، نظمیں، بحث ومباحثے اور گانے وغیرہ ابتداء سے ہی پیش کر رہا ہے۔ جموں دوردرشن جو کہ ابھی حال میں ہی قائم ہوا ہے یہاں سے بھی ایک پروگرام ''آبشار'' ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت غزلیں اور مشاعرے سنائے جاتے ہیں۔

دوردرشن سرینگر سے اُردو کے کئی معیاری پروگرام نشر ہوتے رہے ہیں۔ دوردرشن کشمیر سے ہر ماہ ایک اُردو پرو

گرام ''دھنک'' نشر ہوتا ہے۔ جو خالص علمی اور ادبی نوعیت کا پروگرام ہے۔ علاوہ ازیں نوجوانوں کے لئے یہاں سے ایک پروگرام ''نئے چراغ ٹیلی'' کاسٹ ہوتا ہے، جو نوجوانوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُردو کے ریسرچ اسکالرس کی خاطر یہاں سے ایک اہم پروگرام ''عکس و آہنگ'' ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے۔ یہ کافی معیاری پروگرام ہے جو کافی عرصے سے یہاں سے ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہے۔ اُردو ڈرامے بھی یہاں سے متواتر ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں اور اداکاروں کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے۔ یہ تمام اُردو پروگرام کافی مقبول ہیں اور اُردو کے فروغ میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

ٹی۔وی پروگراموں کی خاصی تعداد ایسی ہے جن کا تعلق براہ راست ہمارے کلچر سے ہے۔ ان میں خاص طور پر ایسے پروگرام اہم ہیں جو کاشتکاروں کے لئے، بچوں کے لئے، نوجوانوں کے لئے یا ادب و ثقافت سے متعلق ہوتے ہیں۔ کشمیری، ڈوگری اور لداخی، موسیقی، روص اور لوک سنگیت کے پروگرام بھی اس میں پیش ہوتے ہیں۔ کشمیر کی زندگی سے متعلق اُردو اور کشمیری میں فلمیں اور ڈرامے بھی برابر پیش ہوتے ہیں۔ ریاست کے مختلف خطوں سے متعلق دستاویزی فلموں کی نمایش ہماری زندگی کے بعض نمایاں پہلوؤں کو پیش کرنے کا اچھا اقدام ہے۔ یہ پروگرام نہ صرف وادی میں بلکہ جموں اور پاکستان کے بعض حصوں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

القصہ ریڈیو کشمیر جموں اور ریڈیو کشمیر سرینگر نے جہاں اُردو کے پروگراموں کو ہوا میں اُچھال کر شہروں، قصبوں اور دور دراز پہاڑی مقامات تک پہنچایا وہیں ٹی وی۔ نے بھی اگر دور دراز مقامات پر نہ سہی مگر کم از کم شہروں اور قصبوں کے تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں تک اُردو کو پہنچایا اور اس زبان کو مقبول بنایا۔

//////////

☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ شیخ محمد عبداللہ: ''آتش چنار''، ص ۵۵۔۵۴، گلشن بکس، ریزیڈنسی روڈ، سرینگر، ۲۰۰۸ء

۲۔ ایضاً۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۴۵

۳۔ برج پریمی: جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما، ص ۵۶، دیپ پبلی کیشنز، نئی پورہ، سرینگر، ۱۹۷۹ء

۴۔ گر بچن چندن: ''اُردو صحافت کا سفر''، ص ۲۲۸۔ ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ستمبر ۲۰۰۷ء

۵۔ ایضاً۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۲۳۰

۶۔ عبدالقادر سروری: کشمیر میں اُردو، حصہ دوم۔ ص ۲۶۰۔ ناشر۔ جموں کشمیر اینڈ اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ۱۹۸۲ء

۷۔ گر بچن چندن: ''اُردو صحافت کا سفر''، ص ۲۳۳۔ ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ستمبر ۲۰۰۷ء

۸۔ محمد یوسف ٹینگ: شناخت ص ۴۶۔ ناشر، محمد یوسف ٹینگ ۳۳۵ جواہر نگر سرینگر ۱۹۸۸ء

۹۔ بحوالہ۔ اُردو صحافت کا سفر: از گر بچن چندن، ص ۲۵۰۔ ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۷ء

10. Fifty years as a Journalist, By Mulk Raj Saraf

بحوالہ اُردو صحافت کا سفر، از، گر بچن چندن، ص ۲۴۸۔ ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۷ء

۱۱۔ بحوالہ۔ اُردو صحافت کا سفر: از۔ گر بچن چندن، ص۔ ۲۴۶۔۲۴۵۔ ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۷ء

۱۲۔ یوسف جمیل: ''آدابِ صحافت اور ہمارے اخبارات''۔ نوائے صبح، سری نگر یکم اکتوبر ۱۹۸۳ء

۱۳۔ شیرازہ: شمیم احمد شمیم نمبر۔ ص ۷۔ ناشر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر جلد ۴۷۔ شمارہ ۶ تا ۸

باب ششم

1950 کے بعد جموں و کشمیر میں اُردو تحقیق و تنقید

1950 کے بعد جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید

شعروادب کے وجود کا جائزہ کئی حوالوں سے لیا جاتا رہا ہے۔ یہ سارے حوالے اپنے مفاہیم میں اپنی اپنی جگہ پر ایک جداگانہ اعتبار اور مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً تخلیق، تنقید، تحقیق، تدوین، ترتیب وغیرہ۔

شعروادب کو عدم سے وجود میں لانا تخلیقی عمل کہلاتا ہے۔ اس عمل میں فنکار ایک ایسے تجربے سے گزرتا ہے جس میں وہ اپنے خیالات، تجربات، مشاہدات اور واردات کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ الفاظ کا یہ جامہ علام بول چال سے نہ صرف مختلف ہوتا ہے بلکہ ذرا اہم اور پہلودار ہوتا ہے۔ اسی لئے ادب زندگی کو فنکارانہ اظہار کا نام دیا جاتا ہے۔ اس اظہار میں کوئی ادیب یا شاعر کسی خاص صنف میں اپنے خیال کو پروتا ہے۔ تنقید کسی تخلیق فن پارے پر اس انداز میں گفتگو کرنا ہے جس سے اس کے محاسن واضح ہو جائیں۔ اور اگر اس کے اندر کوئی خامی موجود ہے تو اس کی نشاندہی ہو جائے۔ یوں تنقیدی عمل تخلیقی تجربے کے بعد اس کے جائزے کا نام ہے۔

تحقیق، تخلیقی محرکات سے تخلیقی فن پاروں تک اس زاویہ نظر کا نام ہے جس میں حقائق تلاش کیے جائیں اور ہر ممکن طریقے پر تخلیقی اور تنقیدی ماخذات کی سچائی تک پہنچنے کے لئے سائنٹفک بنیادوں کا کام کیا جائے۔ اصل میں تحقیق لفظ عربی زبان میں حق کی دریافت اور تلاش کے مفہوم میں آتا ہے۔ تحقیق کا عمل اگر چہ ادب میں کم کم ظاہر ہوتا ہے، تاہم یہ اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے ایک اہم عمل ہے، اور ادبی میلانات، رجحانات، شخصیات اور کتابوں کی حقیقی قدر و قیمت اور اعتبار کو جانچنے کے لئے ایک ناگزیر عمل ہے۔ ہمارے اس باب کا موضوع "۱۹۵۰ء کے بعد

جموں وکشمیر میں اردو تحقیق وتنقید' پر مشتمل ہے۔

جموں وکشمیر شروع سے ہی ادبی سرگرمیوں اور تحقیق کا گہوارہ ہی نہیں بلکہ علمی، ادبی اور ثقافتی حلقوں کا ایک اہم مرکز رہی ہے۔ اس خطے سے تعلق رکھنے والے جن اصحاب علم و دانش نے ثقافتی، علمی اور ادبی دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں شورش کاشمیری ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

شورشؔ اردو ادب کے مختلف گوشوں پر نہایت ہی گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں سماجی و سیاسی صورت حال، شخصیات، ذاتی واردات، تعلقات، شعریات، نکاہات اور اسلامیات سے متعلق ہزاروں عنوانات کت تحت شورشؔ نے اپنی جولانی طبع، ندرت بیان، قدرتِ کلام، طاقت وادراک، احساس وتفکر اور وجدان کا غیر فانی مظاہرہ کیا ہے۔ خدا نے انہیں تحریر وتقریر دونوں سے نوازا تھا۔ اردو ادب پر ان کی خاص نظر رہی ہے۔ اردو میں طنز ومزاح کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''رشید احمد صدیقی کا طنز شاہانہ ہے ۔ وہ اللہ کے فرمانروا ہیں۔ لیکن ان کی فرمانروائی میں صدیق اکبر کی للّٰہیت اور عمر فاروق کی سطوت ہے۔ احمد شاہ بکاری ظرافت میں وہی حیثیت رکھتے ہیں فصل کاٹنا کہ یک چکی ہے۔ میرے پاس صرف قلم ہے اور میں نے اس عورت کے زخم پیش کئے ہیں۔ جس کا روپ عیاش انسانوں کے قہقہوں کے دست برد میں ہے۔''[1]

عشرت کاشمیریؔ دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ صف اول کے ادیب، شاعر، صحافی، نثر نگار اور مورخ تھے۔ عشرت کاشمیری کا نام غلام مصطفے تھا لیکن قلمی نام عشرت اتنا مشہور ہوا کہ اصل نام دب کر رہ گیا۔ اردو ان کی مادری زبان تھی اس لئے شاعری میں انہیں جلد مہارت حاصل ہوگئی۔ ان کا لسانی اور تقابلی مطالعہ بہت وسیع تھا انہیں اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں پر پوری دسترس حاصل تھی۔ ان کی سب سے پہلی کوشش جو

سامنے آئی وہ تھی ''تاریخ کشتواڑ (ایک تقابلی مطالعہ'' ہے۔ اس کے علاوہ برصغیر ہند و پاک کے کئی خبارات و رسائل میں آپ کے تحقیقی مقالات شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے تین کتابچے ''پرستان کی شہزادی''، ''کتاب کی کہانی''، اور ''زمین کا ناچ'' بچوں کے لئے شائع کئے۔ انہوں نے اداریوں کے علاوہ سیاسی کالم لکھنے کا کام بھی کیا جو بہت سراہا گیا۔

اردو کے ممتاز ادیب، محقق، ناقد اور معروف افسانہ نگار نصیر احمد قریشی المعروف امین بنجآرا کا شمار ریاست جموں و کشمیر کی ان ادبی شخصیات میں ہوتا ہے جو اپنی اردو دوستی، ادب نوازی، عالمانہ بصیرت، عصری آگہی اور فنکارانہ چابکدستی کے بل بوتے پر ایک مقام حاصل کر چکے ہیں۔ مسلہ اردو زبان کی ترویج و ترقی کا ہو یا ادبا و شعرا کی عزت افزائی اور قدر دانی کا، امین بنجآرا ہر جگہ صفِ اول میں نظر آتے ہیں۔ شعبہ تحقیق و تنقید کا ہو یا تخلیقی ادب کا امین بنجارا ہر شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ملک گیر سطح پر ایک محقق و ناقد کی حیثیت سے اُن کے وجود کو تسلیم کیا جا چکا ہے تاہم اُن کا اصل اور پسندیدہ موضوع فکشن ہے اور اُن کے فن کی مقبولیت نے انھیں اردو کے معتبر افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔

امین بنجارہ کی ادبی زندگی کا آغاز ۸-۱۹۷۷ء میں ہوا۔ شروع میں انھوں نے شعر بھی کہے اور اس سلسلے میں ریاست کے بزرگ شاعر پنڈت کیلاش ناتھ کول میکش کاشمیری سے اصلاح بھی لی لیکن طبیعت چونکہ شروع ہی سے نثر کی طرف مائل تھی اس لئے کہانیاں بننے کا عمل شروع کر دیا۔ اُن کی افسانہ نگاری کے پہلے دور کے افسانون میں ''الجھنیں''، ''حق ادا نہ ہوا''، ''رنگے سیار''، ''انتظار''، ''واپسی''، ''گناہ عظیم''، ''مجبور''، ''کتا''، ''اکیلا ہوں میں''، اور ''دل فروش'' جیسی معاشرتی اور علامتی کہانیاں شامل ہیں، جو مقامی اخبارات و رسائل میں شائع ہوئیں۔ لیکن ان کے دوسرے دور کی کہانیوں نے انھیں ایک مخصوص پہچان دی اور وہ ملک کے معیاری رسائل و جرائد میں چھپنے لگے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''الاؤ'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا جس کی رسم رونمائی ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے کی۔

جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کی صورتِ حال، گذشتہ دہائیوں سے کہیں زیادہ زرخیز اور بہتر ہے۔ اگر چہ موجودہ محقق اور نقاد میں چند ایک ہی ایسے ہیں جن کو جموں وکشمیر کے اساتذہ تنقید وتحقیق مثلاً اکبر حیدری، طالب کشمیری، حامدی کاشمیری، برج پریمی، ظہورالدین، محمد یوسف ٹینگ اور قدوس جاوید وغیرہ کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں بیشتر تحقیق وتنقید کے بہترین نمونے پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے اکیسویں صدی میں ریاست جموں وکشمیر میں اُردو محققین اور ناقدین کی خدمات کا جائزہ کہیں تفصیل سے تو کہیں اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

پریمی رومانی: ۔تنقید وتحقیق کے میدان میں پریمی رومانی نے اُردو ادب کو کئی معیاری تصانیف دی ہیں جن میں 'جدید اُردو شاعری چند مطالعے'' ''اوراق'' ''تحریر وتقریر'' ''انتخابِ مضامین'' ''ردِّعمل'' ''تاثرات'' ''پیشِ رفت'' وغیرہ اہم ہیں۔

''ردِّعمل'' میں پریمی رومانی نے اُردو کے نامور جدید شعراء جن سے وہ کافی متاثر ہوئے ہیں، پرخامہ فرسائی کی ہے۔ ان شعراء میں اختر الایمان، خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، کرشن موہن، مخمور سعیدی، وزیر آغا، شہریار، مظہر امام، ساقی فاروقی، زبیر رضوی، بمل کرشن اشکؔ، حامدی کاشمیری، محمد علوی اور ندا فاضلی وغیرہ شامل ہیں۔ ان مضامین میں پریمی نے شاعروں کا مختصر خاکہ کھینچا ہے اور پھر ان کی شاعری پر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ ساتھ ہی مضامین کو شاعروں کے نمونۂ کلام سے بھی مرصع کیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر شاعر علائم اور استعاروں سے کام لیتے ہیں مگر ان کے یہاں ''ترسیل کا المیہ'' کہیں نظر نہیں آتا۔

''تاثرات'' میں پریمیؔ رومانی نے ایک طرف سیمابؔ اکبر آبادی، حفیظؔ جالندھری، قتیل شفائی اور عنوانؔ چشتی جیسے چند شاعروں کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور دوسری طرف منشی پریم چند اور کرشن چندر جیسے مقبول فکشن نگاروں پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ بقول پریمیؔ۔

''سیماب سامراج کے سفاک رویہ سے دل برداشتہ تھے اور فرنگی شاطروں کی فریب کاریوں سے آشنا تھے۔ اُن کا دل بھی آزادیٔ وطن کے لیے بے چین تھا۔ اتنا ہی نہیں وہ اہلِ وطن کو آزادی کی جدوجہد کے لیے آمادۂ پیکار دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے ارادوں میں بغاوت کے شعلوں کی آگ دیکھنا چاہتے ہیں۔'' ؎

''پیش رفت'' (۲۰۰۲ء) میں مضامین کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔ جہاں ایک جانب اقبالؔ، ٹیگورؔ، جگن ناتھ آزادؔ اور مظہر امام پر تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں تو دوسری طرف جموں و کشمیر کے ادیبوں میں پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ مستؔ کاشمیری، شام لال ایمہ، رسؔا جادانی، میر غلام رسول نازکؔی، موتی لال ساقؔی، مرغوب بانہالؔی، بنسی نردوش، سائل کاشمیری اور کشوری منچندہ پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ان میں سے چند ایک ادیب کشمیری زبان و ادب کے جانے مانے قلم کار رہیں۔ ان مضامین کے علاوہ گیت ہماری تہذیب کے آئینہ دار، ''اُردو داستاں اور ہندوستانی داستانیں'' اور اُردو کے تیئں ریاست کے ادبی اداروں کا رول بھی شاملِ اشاعت ہیں جو پریمی رومانی کی تحقیقی صلاحیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جمہوری فکر اور ٹیگور کی شاعری، میں ٹیگور کے نظریے کو پیش کیا گیا ہے۔

حال ہی میں پریمی رومانی کی ایک اور کتاب بعنوان ''میزان'' منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہے۔ اس میں چھتیس تصانیف پر ڈاکٹر رومانی کے تبصرے شامل ہیں۔ ان تصانیف میں ناول، افسانے، ڈرامے، تحقیق و تنقید اور اقبالیات سبھی کچھ شامل ہیں۔ تبصرے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں انتقادی عنصر نمایاں ہے اور پریمی رومانی نے تصانیف کا بغور مطالعہ کر کے انہیں قلم بند کیا ہے۔ البتہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہاں بھی پریمی رومانی نے زیادہ تر جموں و کشمیر سے وابستہ ادیبوں کو ترجیح دی ہے۔ پریمی رومانی کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین خان فرماتے ہیں۔

''پریمی رومانی نے تنقید کرتے وقت نہایت عزم اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ کیونکہ ان کا ذوق شعری بھی نفیس ہے۔ اس لیے کمالِ فن کی اچھی پرکھ بھی کی ہے۔ جہاں فن کی

کسوٹی پر کسی نظم یا شاعر کو پورا نہیں پایا، وہاں بے باکی سے انگلی بھی دھری ہے۔'' ۳؎

پریمی رومانی نے نثری اور شعری ہر نوع کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ کہیں تفصیلی تجزیہ کرتے ہیں تو کہیں اختصار سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جامعیت کے ساتھ اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ ہر چرن چاولہ کے افسانوں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے۔

''انسان کے مسائل اور ان کا درد و کرب اور اُن کے مصائب و مشکلات کا چاولہ کو بخوبی اندازہ ہے۔ ان کی کہانی آج کل کے ٹوٹے اور بکھرے ہوئے انسان کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کا مشاہدہ تیز اور مطالعہ وسیع ہے۔ چاولہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے بلکہ معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے قائل ہیں۔ ان کے کردار چلتے پھرتے کردار ہیں۔ یہ کردار ایسے سچے اور کھرے ہیں کہ حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوڑتے۔'' ۴؎

اسی طرح ڈاکٹر ظہور الدین کے افسانوں کے مجموعہ ''تلافی'' دیپک بدکی کے افسانوی مجموعے ''ادھورے چہرے'' مشتاق احمد وانی کے افسانوں کے مجموعے ''ہزاروں غم'' اور زنفر کھوکھر کے افسانوں کے مجموعے ''کانچ کی سلاخ'' اور ایسے ہی بہت افسانہ نگاروں کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے اجمال سے ضرور کام لیا ہے لیکن پتہ کی بات کہہ جاتے ہیں۔ زنفر کھوکھر کے افسانوں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے۔

''زنفر کا اسلوب صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں بلکہ وہ براہ راست اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی قائل ہیں۔ ان کی زبان میں فارسیت کا غلبہ نہیں، انہوں نے آسان اور خوشنما الفاظ اور تراکیب کا سہارا لے کر اپنے افسانوں میں رنگ آمیزی کی ہے۔'' ۵؎

پریمی رومانی کسی موضوع، مصنف یا کتاب وغیرہ پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی رائے کولاتے نہیں بلکہ موضوع کا اس عمدگی سے تجزیہ کرتے ہیں کہ قاری اپنی رائے آپ قائم کر لیتا ہے یا ناقد کا ہم آواز ہو جاتا ہے۔جموں وکشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ لکھا ہے۔ایسا ضروری بھی تھا کیوں کہ کشمیر کے بعض قلم کار ایسے ہیں جو ملک کے دیگر حصوں میں کم متعارف ہیں۔ پریمی نے ان قلم کاروں کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے ایک اہم ادبی ذمہ داری کی تکمیل کی ہے۔آنندسروپ انجم کے بارے میں یہ اقتباس اہم ہے۔

''انجم کی شاعری میں نئے اور تازہ فکری لہجے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری کا رچاؤ
ملتا ہے۔ان کے خیالات نرم، ملائم اور نازک ہیں۔ وہ جچے تلے انداز میں بات کو
واضح کرنے کے قائل ہیں۔'' ۶

اقبالؔ پر پریمی رومانی نے ''اقبال اور جدید اُردو شاعری'' جیسی وقیع اور بھرپور کتاب لکھی۔ اپنے تبصروں کے مجموعہ ''میزان'' میں اقبالیات سے متعلق چار کتابوں ''اقبال اور مشاہیر کشمیر''، ''پیامِ اقبال''، ''اقبالیاتِ آزاد''۔ ایک جائزہ'' اور'' مفتاح اقبال'' پر اُن کے تبصرے ہیں جو محنت سے تسوید کیے گئے ہیں اور اقبالیات سے ان کے شغف اور ایک نوع کی وابستگی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ پریمی کی یہ کتاب اقبالیات میں اپنے طور پر اضافہ ہے۔انہوں نے اقبالؔ کے فکر وفن کے کئی گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔انہوں نے اقبالؔ کے افکار کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر پریمی رومانی کا قلم خاصا سنبھلا ہوا ہے، پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ اپنی بات کہتے ہیں۔مسعود حسین خان صاحب نے پریمی کی تنقیدات کے مطالعہ کے بعد نہایت جچی تلی رائے یوں دی ہے۔

''پریمی نے تنقید کرتے وقت نہایت عزم واحتیاط سے کام لیا ہے کیوں کہ اُن کا ذوقِ
شعری بھی نفیس ہے اس لیے کمال فن کی اچھی پرکھ کی ہے۔ جہاں فن کی کسوٹی پر کسی

نظم یا شاعر کو پورا نہیں پایا، وہاں بے باکی سے انگلی بھی دھری ہے۔'' ۷

پریمی رومانی کا طرزِ تحریر دلکش ہے وہ سادہ اور صاف زبان استعمال کرتے ہیں۔ بعضوں کی طرح بات چبا کر نہیں کہتے اور نہ لفاظی کرتے ہوئے ظاہری طور پر متاثر کرتے ہیں لیکن معنویت سے ان کی تحریریں خالی نہیں ہوتی ہیں۔ پریمی کی تنقید متعلقہ فنکار کے فن کی تفہیم میں معاونت کرتی ہیں۔ موضوعات کے انتخاب، اُن کے تعلق سے اپنے رویہ اور طرزِ تحریر کی اپنائیت اور دلکشی کے باعث پریمی کی تحریریں پڑھی جاتی ہیں۔ ان کا ادبی سفر یقین ہے اسی آن بان سے جاری رہے گا اور نئی نسل کے اچھے اور سچے ناقدین میں ان کی جگہ ممتاز ہو گی۔

ڈاکٹر پریمی رومانی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ''فکر و نظر'' کے نام سے ۲۰۱۲ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں مستند شاعروں اور ادیبوں کے حوالے سے ۱۲ تحقیقی و تنقیدی مضامین کے علاوہ چھ شاعروں کے شعری مجموعوں پر تبصرے شامل ہیں۔ فکر و نظر میں شامل مضامین کے بارے میں ڈاکٹر پریمی رومانی نے کتاب کے آغاز میں ''میری بات'' کے عنوان سے اپنی تحریروں کی معنویت کی وضاحت کرتے ہوئے خود لکھا ہے۔

> ''فکر و نظر'' میرے تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل مقالات اُردو ادب کی مختلف جہات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ مقالات گرچہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان میں تسلسل قائم رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔'' ۸

اگر دیکھا جائے تو فکر و نظر میں شامل پریمی رومانی کے بعض مضامین ان کی تنقیدی بصیرت مندی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ خاص طور پر فیض احمد فیض، مظہر امام، صوفی تبسم اور عثمان جوہری کی شاعری کے بارے میں ان کے تنقیدی خیالات اپنا ایک معیار رکھتے ہیں اسی طرح ابو الکلام آزاد، علامہ اقبال اور سعادت حسن منٹو پر ان کے مضامین تحقیقی عناصر کے بھی حامل ہیں۔ بحیثیت مجموعی ڈاکٹر پریمی رومانی ایک ایسے محقق اور نقاد ہیں جن کی تحریریں جموں و کشمیر میں اُردو تحقیق و تنقید کی موجودہ صورتِ حال کو روشن رکھنے کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

پروفیسر ضیاء الدین:۔ کشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کی موجودہ صورتِ حال کا کوئی بھی جائزہ پروفیسر ضیاء الدین کے ذکر کے بغیر نامکمل تصور کیا جائے گا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ کم لیکن معیاری اور اچھوتے موضوعات پر قلم اُٹھانے پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ کے اب تک بیس سے زائد تحقیقی وتنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی درجہ ذیل یک موضوعی تصنیفات ان کے تحقیقی ذوق اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

۱ : خواجہ احمد عباس

۲ : اسالیب نثر پر ایک نظر

۳ : گوپال متل۔ شخص اور شاعری

۴ : اطرافِ تنقید

پروفیسر ضیاء الدین کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اطرافِ تنقید'' (۲۰۰۶ء) میں منظرِ عام پر آیا۔ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ ضیاء الدین عام طور پر روایتی موضوعات پر قلم اُٹھانے سے گریز کرتے ہیں۔ انہوں نے شاعری، افسانہ، ڈرامہ اور سفرنامہ کے حوالے سے معیاری تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ غالب پر اُردو کے اکثر و بیشتر ناقدین نے لکھا ہے لیکن غالبؔ کی تنقید کے لیے غالب کی تفہیم ضروری ہے اور یہ ایک ایسا دشوار گزار عمل ہے جس پر ہر کس و ناکس کھرا نہیں اُتر سکتا۔ تفہیم غالب کے لئے اُردو اور فارسی شاعری کی روایات اور رسومیات ہی نہیں مشرقی جمالیات کی آگہی بھی لازمی ہے۔ خاص طور پر غالب کی شاعری کے اشاراتی واستعاراتی اسلوب، زبان کے انوکھے لسانی برتاؤ اور غالبؔ کے جدت پسند اختراعی ذہن کو سمجھنے کے بعد ہی غالب شناسی کے میدان میں قدم رکھنا ممکن ہے۔ پروفیسر ضیاء الدین نے غالبیات کے حوالے سے متعدد معرکتہ الارا مقالات لکھے ہیں۔ ان میں سے پانچ مقالات ان کی کتاب ''اطرافِ تنقید'' میں شامل ہیں۔

۱ : غالب کی ایذا پسندی

۲ : غالب کی شاعری میں نرگسیت

۳ : غالب اور جدید شعری ذہن

۴ : غالب اور تصوف

۵ : مالک رام غالبیات کی روشنی میں

خواجہ احمد عباس ایک ترقی پسند فکشن نگار، فلم ساز، ہدایت کار اور اُردو ڈرامہ نگار کے طور پر کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن پروفیسر ضیاءالدین نے اُردو افسانہ کی شعریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں ان کے نظریے کے عمل دخل کا نہایت بصیرت مندانہ تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور جدیدیت کے حامیوں کے اس نکتے کو رد کیا ہے کہ ادب میں مقصدیت یا نظریئے کے برتاؤ سے ادب کی جمالیاتی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔ پروفیسر ضیاءالدین اس سلسلے میں واضح اور متوازن خیالات رکھتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں مقصدیت اور تخلیقی و جمالیاتی محاسن کے برتاؤ کے بارے میں ضیاءالدین بڑے ہی غیر جانبدارانہ انداز میں لکھتے ہیں۔

> ''مقصد اور جذبے کے امتزاج ہی سے اعلیٰ ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ خواہ وہ افسانہ ہو یا ناول، غزل ہو یا نظم، مقصد اور جذبے کا امتزاج تخلیق فن کے لئے ضروری ہے یہ امتزاج خواجہ احمد عباس کی ہر کہانی میں نظر نہیں آتا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ مقصد اور جذبے کے امتزاج کی اہمیت سے بیگانہ رہے ہوں یہ امتزاج ان کی جن کہانیوں میں موجود ہے وہ کہانیاں اونچے پائے کا ادب پارہ بن گئی ہیں۔ ۹؎

پروفیسر ضیاءالدین کا مذکورہ بالا اقتباس خالصتاً تنقیدی ہے اس میں نہ تو مدلل مداحی ہے اور نہ عیب جوئی بلکہ اپنی ادبی بصیرت کی بنا پر غیر جانبدارانہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو تنقید کا فرض منصبی ہے اور اگر پروفیسر ضیاءالدین کی تحریروں کا بہ غور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ضیاءالدین ریاست جموں وکشمیر کے ایک ایسے بالغ نظر اور پختہ

ذہن نقاد اور محقق ہیں جن کا شمار برصغیر کے نمائندہ نوجوان ناقدین میں کیا جانا چاہئے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی:۔ تحقیق وتنقید کے لئے زبان وادب کی روایات اور رجحانات، اقدار اور نظریات کے گہرے شعور کے ساتھ ساتھ صبر وسکون ریاضت اور ادب سے بے لوث وابستگی بھی ضروری ہے۔ یہ صفت کشمیر کے معاصر محققین اور ناقدین میں سب سے زیادہ ڈاکٹر مشتاق وانی کے یہاں نظر آتی ہے۔ مشتاق وانی گذشتہ تین دہائیوں سے ادب کے مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ایک عرصہ تک مشتاق وانی کی شناخت بطورِ افسانہ نگار کی جاتی رہی ہے۔ ان کے افسانوں کا اولین مجموعہ ۲۰۰۱ء میں ''ہزاروں غم'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کا پیشِ لفظ ریاست جموں وکشمیر کے مشہور دانشور جناب امین بنجارہ نے لکھا تھا۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ مشتاق وانی شاعری سے بھی شوق رکھتے ہیں لیکن ۲۰۰۰ء تک آتے آتے انھیں اور کشمیر کے اُردو قارئین کو بھی اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ مشتاق احمد وانی طبعاً ومزاجاً تحقیق وتنقید کے مردِ میدان ہیں۔ ان کی تصنیف ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' نے اس خیال کی تصدیق بھی کر دی۔

''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' (۲۰۰۲ء) میں شائع ہوئی گرچہ یہ مقالہ مشتاق احمد وانی نے شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھا تھا لیکن اپنے موضوع کی انفرادیت اور ترتیب اور پیش کش کے اعتبار سے یہ مقالہ یونی ورسٹیوں میں لکھے جانے والے مقالوں سے بہت منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے مشتاق احمد وانی کے اس تحقیقی وتنقیدی مقالہ کے بارے میں درست لکھا ہے کہ۔

> ''ان کا (مشتاق احمد وانی کا) مقالہ عام تحقیقی مقالات کے برعکس اپنی سطح اور معنویت کے اعتبار سے یقیناً اہمیت کا حامل ہے اور اس سے اُردو فکشن کے ایک اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے وانی صاحب کا طریق کار علمی ہے اور اس میں وہ متانت ملتی ہے جو

سنجیدہ مطالعے کے بغیر ہاتھ نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب شوق سے پڑ
ھی جائے گی اور فکشن سے شغف رکھنے والے اس کی قدر کریں گے۔'' ۱۰

مشتاق وانی کے مذکورہ بالا تحقیقی وتنقیدی کارنامے کی اہمیت اور معنویت کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور نقاد اور دانشور پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی نے کتاب کے ''پیشِ لفظ'' میں لکھا ہے۔

''ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی موجودہ کوشش اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ اس کے وسیلے سے اُردو ناول کی عہد بہ عہد بدلتی ہوئی صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور خصوصاً آزادی کے بعد زندگی کے رزم نامے میں ناول کے خصوصی کردار اور عمل کو بھی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ یوں تہذیبی بحران یہاں قدرے غلط فہمی کو ضرور راہ دیتا ہے اس لیے کہ مصنف کا مقصد تہذیب (culture) کے حوالے سے تاریخی نقوش کو نشان زد کرنے کے بجائے سیاسی وسماجی سطح پر اخلاقی اور معاشرتی زندگی میں پیدا ہونے والے خلفشار کی نشان دہی کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے گذشتہ پچاس برسوں میں ممتاز ترین فکشن کے کارناموں کو بحث کا موضوع بناتے ہوئے اُن کے فنی و فکری تجزیے سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ تعبیر کی صحت اور استدلال کی مضبوطی کے سبب ہمیں قائل مطمئن کرتے ہیں''۱۱

اُردو میں غزل اور افسانہ کے بعد سب سے مقبول صنف ناول ہے۔ اُردو ناول کی تاریخ وتنقید کے حوالے سے پریم چند، علی عباس حسینی، حسن فاروقی اور وقار عظیم سے لے کر پروفیسر ارتضیٰ کریم، اسلم آزاد اور پروفیسر انور پاشا تک نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستانی تہذیب وتمدن پر مغربی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کے سبب، متحدہ ہندوستان میں جو تہذیبی بحران پیدا ہوا اسے کسی اور محقق اور نقاد نے ایک مستقل

موضوع کے طور پر پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی خصوصیت کے ساتھ اُردو کے ابتدائی ناولوں سے لے کر عصر حاضر تک کے ناولوں میں اس تہذیبی کشمکش انتشار اور بحران کی واضح نشاندہی کی ہے۔ حالانکہ ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسواؔ اور پریم چند سے لے کر سجاد ظہیر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی تک اور قرۃ العین حیدر اور جوگندر پال سے لے کر عبدالصمد، الیاس احمد گدی، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی اور سید محمد اشرف تک اُردو کے تمام ناول نگاروں نے عہد بہ عہد رونما ہونے والے سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں اور اُتار چڑھاو کا کہیں اشاراتی تو کہیں وضاحتی اسلوب میں اظہار خیال تو کیا ہے اور اسی لئے اُردو ناول کو زندگی کا ترجمان اور عکاس بھی کہا جاتا ہے لیکن اُردو ناول میں اقوامِ عالم میں تہذیبی بحران کے حوالے سے مشرق خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں رونما ہونے والے تہذیبی بحران کی عکاسی کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پہلی بار مشتاق احمد وانی نے ہی پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں مشتاق وانی نے سائنسی انقلاب، صنعتی انقلاب، انقلابِ فرانس وروس کے عالمی اثرات کا بھی جائزہ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی مارکسؔ، فرائڈؔ اور درخیم جیسے فلسفیوں کے نظریات کے ترقی پذیر ممالک کے عوام اور علوم وفنون پر پڑنے والے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اُردو کے کلاسیکی ناولوں، فسانۂ آزاد اور اُمراؤ جان وغیرہ میں بھی تہذیبی بحران کی عکاسی پر روشنی ڈالنے کے بعد مشتاق وانی نے جدید دور کے ناولوں میں تہذیبی بحران کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے تحقیقی وتنقیدی رویوں کا مظاہرہ جس بصیرت مندی کے ساتھ کیا ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا کتاب ''تقسیم کے بعد اُردو ناولوں میں تہذیبی بحران'' سے ماخوذ ان کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

> ''۱۹۴۷ء کے بعد اُردو میں موضوعاتی اعتبار سے نہ صرف سماج کے گرتے ہوئے ملبے کو پیش کیا گیا ہے بلکہ ہیئتی اعتبار سے بھی ناول کے فرسودہ اصولوں سے انحراف کرنے کو اہمیت دی گئی اور اس چیز کی خاص طور پر کئی ادیبوں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ موضوع کے ساتھ ناول کی ہیئت کو بھی بدلا جائے۔ چنانچہ اب کہانی کو سیدھے اور

سپاٹ انداز میں آگے بڑھانے کے بجائے اُسے پیچیدہ راستوں سے آگے بڑھا
نے کی کوشش کی گئی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے زیر اثر علامتی کہانیوں اور علامتی ادب
کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا اور ترقی پسند نے ''شعور کی رو'' کو اپنا کر تخلیقی ادب میں مز
ید پیچیدگیاں پیدا کر دیں اور انہیں تحریکوں کے زیر اثر سجاد ظہیر کی ناولٹ ''لندن کی
ایک رات'' اور عزیز احمد کا ناول ''گریز'' منظر عام پر آئے۔'' ۱۲؎

مشتاق احمد وانی نے اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ مسلسل جاری رکھا۔ ۲۰۰۸ء میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''آئینہ آئینہ'' کے نام سے شائع ہو کر قبولیتِ عام حاصل کر چکا ہے۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''شعور بصیرت'' اور ''افہام و تفہیم زبان و ادب'' بھی اسی دوران شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا تازہ ترین تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ''اُردو ادب میں تانیثیت'' ہے۔ ۷۸۰ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف، تانیثیت کے موضوع پر پہلی جامع تصنیف ہے۔ جس میں مابعد جدیدیت کی ایک اہم شق تانیثیت Feminism کا ایک سماجی و ثقافتی رویہ اور علمی و ادبی رجحان کی حیثیت سے تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن مشتاق احمد وانی نے اپنی اس ضخیم تصنیف میں تنقیدی بصیرت سے کم اور جذباتی خیالات سے زیادہ کام لیا ہے۔ انہوں نے تاثینیت کے معنی و مفہوم کی وضاحت مغربی دانشوروں کے فرمودات کے حوالے سے کی ہے۔ عالمی پیمانے پر تانیثیت کے رجحان کے آغاز و ارتقاء کی تاریخ انہوں نے تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے جن سے مابعد جدید تصور ادب سے واقفیت رکھنے والے ناقدین اور باذوق قارئین واقف ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ، نظام صدیقی، ابوالکلام قاسمی اور قدوس جاوید وغیرہ نے تانیثیت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ خود خواتین میں شہناز نبی، ترنم ریاض، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید وغیرہ نے بھی اپنے اپنے انداز میں تانیثیت اور تانیثی شعر و ادب کے بارے میں مضامین لکھے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مشتاق احمد وانی نے ایسی تمام معلومات کو یکجا کر کے پیش کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی یہ تصنیف تحقیقی

اعتبار سے تو اہم ہے لیکن اس میں تنقیدی مباحث اور نتائج کا فقدان ہے۔ بلکہ انہوں نے خواتین کے بارے میں ابتداء سے آخر تک بڑی معصومیت کے ساتھ جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ انسانی اور اخلاقی اعتبار سے قابل قدر ہیں۔ لیکن اس طرح کے عام جذبات وتصورات کو نہ تو تحقیق کا نام دیا جا سکتا ہے نہ تنقید کا مثلاً۔ اس کتاب کی تمہید کے درج ذیل اقتباس پر ایک نظر ڈالیں۔

''عورت' خالق کائنات کا ایک عظیم شاہکار ہے اس کی عظمت اور اہمیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کے کئی روپ ہیں وہ ماں جیسے مقدس رشتے کی علامت بھی ہے اور بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کی بہترین ساتھ بھی بہن کی صورت میں اپنے بھائیوں کی ہمدرد اور غمگسار بھی اور بیٹی کی حیثیت سے اپنے والدین کی خدمات گزار بھی عرض یہ کہ عورت اپنے ہر روپ میں محبت بھرا دل رکھتی ہے۔ قدرت نے اسے حسن و جمال اور آرائش وزیبائش کا ایسا جذبہ عطا کیا ہے کہ وہ ہر چیز کو خوبصورت دیکھنا چاہتی ہے۔ دنیا کے تمام دانشوروں، عالموں اور عظیم ہستیوں نے عورت کی عظمت اور اُن کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ تاریخ عالم کی سینکڑوں مثالیں عورت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔ وہ نہ نفاست میں پیچھے ہے اور نہ ذہانت میں۔ اُم المومنین حضرت عائشہؓ اسلام کی سب سے پہلی مفتی قرار دی گئیں۔ رحم دلی اور خدمتِ خلق میں مدر ٹریسا کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چاند بی بی اور جھانسی کی رانی کی بہادری کے کارنامے تاریخ میں محفوظ ہی۔ اسی طرح کئی خواتین نے بہادری، ذہانت اور ہنرمندی کے بہترین کارنامے انجام دیئے ہیں جنہیں انسانی تاریخ ہرگز فراموش نہیں کر سکتی'' ۱۳؎

مشتاق احمد وانی کو یہ غلط فہمی ہے کہ تانیثی ادب سے مراد صرف اور محض عورتوں کا لکھا ہوا ادب ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ واقعتاً ہر وہ تحریر جو ادب سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں عورت اور مرد کی تفریق ختم کر نے پر اصرار کرے تانیثی تحریر ہے خواہ وہ تحریر کسی عورت نے لکھی ہو یا مرد نے۔ چنانچہ مشتاق احمد وانی نے اُردو کی قدیم و جدید خواتین شاعرات اور فکشن نگاروں کی شعری اور نثری تحریروں میں ہی تانیثت کے عناصر ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس ضمن میں بھی انہوں نے نہ جانے کیوں ترنم ریاض، صادقہ نوابِ سحر، ذکیہ مشہدی اور لالی چودھری جیسی خواتین کی تحریروں پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے جبکہ تانیثیت کو ان خواتین نے اپنی تحروں میں بڑے ہی دانشورانہ انداز میں تمام تر فنی و جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ برتا ہے۔ البتہ اُردو ناول میں تانیثیت کی جستجو انہوں نے نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور قاضی عبد الغفار کے ناولوں میں تو کی ہے لیکن پیغام آفاقی، مشرف عالم ذوقی اور غضنفر کے ناولوں کو زیر بحث لانے کی زحمت نہیں کی ہے جبکہ آفاقی کے ناول مکان، غضنفر کے ناول کینچلی اور مشرف عالم ذوقی کے ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' وغیرہ میں تانیثیت کے عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں لیکن ان کمیوں کے باوجود اُردو ادب میں تانیثیت ایک اہم تحقیقی و تنقیدی تصنیف ہے جس سے طلباء کو استفادہ کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس کتاب میں بھی جہاں مشتاق احمد وانی نے بعض نظموں اور غزلوں کے تجزیئے پیش کئے ہیں وہاں انہوں نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی پوری کوشش کی ہے پھر بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مشتاق وانی جموں و کشمیر کے ایک ایسے محقق اور نقاد ہیں جن کے ذکر کے بغیر کشمیر میں اُردو تحقیق و تنقید کی موجودہ صورتِ حال کو سمجھا نہیں جا سکتا ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید:۔ اردو تنقید کی عصری دنیا میں مابعد جدید ادب کے بڑے نقاد جن کا اصل نام محمد قدوس المروف قدوس جاوید کی پیدائش ۱۹۴۷ء کو رانچی میں ہوئی۔ ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

''تقسیم کے بعد میرے والد موجود جھارکھنڈ کے شہر رانچی میں سکونت پذیر ہو گئے۔

میری پیدائش ریکارڈ کے مطابق سندی اعتبار سے ۱۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہوئی۔ یہیں میری تعلیم و تربیت بھی ہوئی۔''[۱۴]

آپ کے والد سیاسی اعتبار سے کانگریس پارٹی کے معروف لیڈر تھے۔ آپ چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ بڑے بھائی شاید احمد شعیب Anthropology کے پروفیسر رہے اور ساتھ ہی اردو ادب کو اپنے شعری مجموعہ ''لے سانس بھی آہستہ'' سے ہمکنار کیا۔ پروفیسر شعیب ایک اچھے کامیاب شاعر، اردو، فارسی، انگریزی کے علاوہ علم بشریات اور سماجیات سے فہم و علم رکھتے تھے۔ پروفیسر قدوس جاوید کو گھر کے علمی و ادبی ماحول، دوستوں اور اساتذہ کی نگرانی نے ان کے اندر تحقیقی اور تنقیدی شعور پیدا کیا۔ ان کی ادبی خدمات اور ادبی ذوق و شوق سے عیاں ہوتا ہے کہ ابتداء سے ہی صحافت کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید میں دلچسپی تھی جو ان کی شہرت کا سبب بنی۔ آپ نے اپنے تنقیدی شعور کا ثبوت ۱۹۸۴ء میں اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعہ 'ادب اور سماجیات'' کو شائع کروا کر دیا۔ اس مجموعے کے بعد آپ تقریباً چالیس برس سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مسلسل مصروف ہیں۔ مضامین کا مجموعہ ''ادب اور سماجیات'' ہند و پاک کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہے جس کے اندراج میں تخلیقی عمل کی سماجیات کی شناخت اور تخلیقی زبان، جدیدیت اور عصری مسائل، جدید افسانے میں حقیقت کا محمل جیسے مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید نے ۱۹۶۸ء میں بعنوان ''اردو افسانہ آزادی کے بعد'' پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ ۱۹۷۰ء میں ایک رسالہ ''زبان و ادب'' پٹنہ سے نکالتے رہے۔ ۱۹۷۸ء میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے بعد میں شعبہ اردو کے صدر رہے۔ ۲۰۰۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ قدوس جاوید کی ادب نوازی اور ادبی دلچسپی کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ ملازمت سے سبکدوشی کے دوسرے سال ہی یو۔ جی۔ سی کے فیلوشیپ پر ''کشمیر میں اردو نثر کے آغاز'' پر مکمل مقالہ تحریر کیا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی، حامدی کاشمیری، قاضی افضال اور شمیم حنفی کے بعد اردو تنقید

میں قدآور نام ہے اگر کوئی ہے تو وہ قدوس جاوید کا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے ترقی پسندی کا زمانہ بھی دیکھا اور جدیدیت کے زمانہ کے بعد مابعد جدیدیت کا بھی۔ بلکہ یوں کہنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ ان کی تنقید نگاری کا دائرہ کلاسیکل ادب سے لے کر مابعد جدید ادب تک پھیلا ہوا ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم کے دوران خدا بخش لائبریری میں مطالعہ کے وقت مشہور ادب فہم شخصیات سے ملاقات کا موقع ملتا رہا۔ جن شخصیات کی سرپرستی میں قدوس جاوید مابعد جدید تنقید میں بڑے نقاد کے طور پر سامنے آئے ان میں پروفیسر عسکری، پروفیسر محمد محسن، پروفیسر عبدالمغنی، مشہور ناقد پروفیسر کلیم الدین، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے انہیں ادبی ماحول کی طرف مائل ہی نہیں کیا بلکہ تنقید کی باریکیوں سے واقف بھی کرویا۔

ان کے ادبی سرمائے کو اگر دیکھا جائے تو انہوں نے اپنا ایک الگ مقام بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے پہلے مضامین کے مجموعے کے بعد دوسرا مضامین کا مجموعہ ''تعبیر وتنقید'' ۱۹۹۱ء، تیسرا مضامین کا مجموعہ ''شعر نثر آہنگ'' کے نام سے شائع ہو کر ادبی دنیا میں اپنی پہچان قائم کر چکے ہیں۔ مجموعہ ''شعر نثر آہنگ'' میں بنیادی طور پر اردو نثر نگاروں کا سماجی وثقافتی زاویوں سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ مابعد جدیدیت ان کا پسندیدہ موضوع رہا جس کے لئے انہوں نے کشمیر یونیورسٹی کے مجلّہ ''بازیافت'' میں اپنا پہلا مضمون شائع کیا۔ تحقیق وتنقید کے جو نمایاں امتیازات ہیں ان میں زبان وبیان پر دسترس، شگفتہ بیانی، شیریں اسلوب، تجرباتی شعور، گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ گہرا مشاہدہ، تعمیری رویہ، غیر جانبدار رہنا، اہمیت کے حامل ہیں۔ قدوس جاوید کی تنقیدی کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ تمام امتیازات ملتے ہیں۔ علامہ اقبال بھی ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے جن کے حوالے سے انہوں نے دو کتابیں ''اقبال کی جمالیات'' اور ''اقبال کی تخلیقیت'' ۲۰۰۷ء کے نام سے لکھی ہیں۔ کتاب ''اقبال اور تخلیقیت'' سات ابواب پر مشتمل ہے جس میں بخوبی بیان کیا گیا ہے کہ کون سے ایسے اسباب کارفرما رہے جن سے اقبال کی تخلیقیت ایک مخصوص سانچے میں ڈھل گئی۔ ریڈیو کشمیر سرینگر میں ایک انٹرویو

دیتے ہوئے بتاتے ہیں:

''شکیل الرحمٰن اردو میں جمالیاتی تنقید کا سب سے بڑا نام ہے اور یہ بات درست ہے کہ شکیل الرحمٰن کی کتاب ''غالب اور ہند جمالیات'' اور دیگر تحریروں کا مجھ پر اثر ہوا اور میں نے جمالیاتی نقطہ نظر سے اقبال کا جائزہ لیا اور کتاب کی تصنیف کے پیچھے مرحوم اندرابی کے اسرار کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ادب کے جمالیاتی مطالعے میں میں نے پروفیسر شکیل الرحمٰن کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ ۱۵؎

مابعد جدید تنقید میں قدوس جاوید کا قابل ستائش کام ''متن معنی اور تھیوری'' ہے۔ ۳۷۵ صفحات اور پندرہ مقالات پر مشتمل اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں متن، قرات اور بین المتونیت کے اطلاقی امکانات پر بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں ہئیتی تنقید، تانیثی تنقید، اکتشافی تنقید، ساختیاتی تنقید، پس ساختیاتی تنقید، مابعد جدید تھیوریز کے معنی و مفہوم اور تفہیم و تعبیر کو بڑے منجھے ہوئے اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں ساختیات، جدیدیت، بین المتونیت، ہیتی اور تانیثی نظریئے کے علاوہ ترقی پسندی پر بھی سیر حاصل بحث شامل ہے۔ مصنف کا خود دعوی ہے کہ:

''متن، معنی اور تھیوری'' اردو ادب میں رائج متعدد غلط اور گمراہ کن تصورات اور مفروضات کو رد کرنے کا دعوی کرتی ہے۔''

احمد علی جوہران کی کتاب ''متن معنی اور تھیوری'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پروفیسر قدوس جاوید کی تنقید کی اہم خصوصیات مغربی اور مشرقی مطالعات کا توازن سماجی و ثقافتی اور ادبی روایات کے پیش نظر میں ادب کا مطالعہ اور عصری سماجی ،

سیاسی اور معاشی تناظرات میں ادب کی تفہیم و تعبیر اور اس کی قدر کے تعین کی کوششیں ہیں۔۔۔انہوں نے ''متن معنی اور تھیوری'' میں مابعد جدید تنقید اور ادبی تھیوریز پر جس سنجیدہ اور مربوط و مفصل انداز میں عالمانہ گفتگو کی ہے اور اس گفتگو میں جس ژرف نگہی اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے۔۔۔مابعد جدید تنقید کے نظری و علمی مباحث کی تعبیر و تفہیم کے سلسلے میں یہ کتاب یقیناً ایک بنیادی حوالہ ثابت ہوگی۔''١٦

پروفیسر قدوس جاوید کے وسعت مطالعہ ار عالمی ادبیات سے آگہی نے ان کی تنقید کو بے پایاں گہرائی و گیرائی عطا کی ہے۔ بین السطور تصنیفات کے علاوہ آپ کے متعدد مضامین برصغیر ہند و پاک کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں جن میں جدیدیت و مابعد جدیدیت، متن میں معنی کا عمل، مابعد جدید ناول، مابعد جدید افسانہ، مابعد جدیدیت، تخلیقیت اور شاعری کا طلسم، اقبال متن اور بین المتنویت، برف آشنا پرندے ایک مابعد جدید ناول، متن قرات اور معنی کا چراغاں کے علاوہ ولی دکنی، حالی، شبلی، سرسید، محمد حسین آزاد، غالب، اقبال، فیض گو کہ سب کی ادبی عظمت کا جائزہ لیا ہے۔ ان کی طائرانہ نظروں نے اپنے قرب و جوار کے ادیبوں کا بھی حق ادا کیا، مطلب یہ کہ جموں و کشمیر کے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کے لئے بھی ان کی خدمات اہمیت کی حامل ہیں۔ حامدی کاشمیری کی اکتشافی تنقید، اکبر حیدری، محمد یوسف ٹینگ، منصور احمد منصور، غلام رسول نازکی، ترنم ریاض، خالد حسین، فرید پربتی، مشتاق احمد وانی، مجید مضمر، خالد بشیر، نصرت چودھری وغیرہ کی تصنیفات کے تبصرے اور مطالعے پیش کئے ہیں وہ اپنے طریقہ تنقید و تحقیق کے حوالے سے اپنے آپ میں نئے مطالعے ہیں۔

شہاب عنایت ملک:۔ کشمیر کے معاصر محققین و ناقدین میں پروفیسر شہاب عنایت ملک کا نام بھی آتا ہے۔ شہاب عنایت ملک نے شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی کی صدرات کے دوران متعدد سیمینار کروائے۔ ان سیمیناروں میں ریاست جموں و کشمیر کے علاوہ دلی، لکھنؤ اور الہ آباد کے دانشوروں نے بھی تحقیقی و تنقیدی مقالے پیش کئے۔ جنھیں

بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔خود شہاب ملک کی کئی تحقیقی وتنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا ذکر حسب ذیل ہے۔

۱۔ نئے تنقیدی جائزے

۲۔ قرۃ العین حیدر: بحیثیت افسانہ نگار

۳۔ چاندنی بیگم: ایک جائزہ

۴۔ مضامینِ شہاب

۵۔ ارمغانِ شہان

۶۔ عصری ادبی تفکرات

پروفیسر شہاب عنایت صاحب کی اب تک کم وبیش پندرہ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔انہوں نے تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں اور مختلف ادبی شخصیات سے متعلق لاتعداد تنقیدی مضامین بھی ضبطِ تحریر لائے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے غیر افسانوی تحریریں مثلاً سفرنامے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔اور اُن کی بیشتر تصانیف میں قدرت اللہ شہاب کے حوالے سے مضامین موجود ہیں۔ یہ مضامین اس قدر پُر مغز اور جامع ہیں کہ اگر ان مضامین کو الگ سے ترتیب دیا جائے تو قدرت اللہ شہاب سے متعلق ایک ضخیم کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔قدرت اللہ شہاب کی افسانہ نگاری، قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ''یا خدا'' ایک شاہکار،شہاب نامہ میں جموں کی جھلکیاں اور چندراوتی وغیرہ شہاب عنایت ملک کے ایسے مضامین ہیں جو قدرت اللہ شہاب کی فنی بصیرتوں کو ہی اُجاگر نہیں کرتے بلکہ اُن کی تہہ دار شخصیت کے پنہاں گوشے بھی نیاں ہو جاتے ہیں۔قدرت اللہ شہاب سے پروفیسر شہاب عنایت ملک کا یہ والہانہ رشتہ صرف کتابوں اور تحریروں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیت میں بھی قدرت اللہ شہاب کی بہت ساری خوبیاں بیک وقت جمع ہو گئی ہیں۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک اپنی سوانحی تصنیف ''یادوں کے لمس'' میں لکھتے ہیں

''میں قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ''یا خدا'' پڑھ کر ان کا شیدائی بن گیا۔آج میری شخصیت میں جو بے باکی کا عنصر ہے وہ قدرت اللہ شہاب کی تحریروں کی وجہ سے ہے''۔

''مضامینِ شہاب'' پروفیسر شہاب عنایت ملک کے مختلف تحقیقی اور تنقیدی مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں بیشتر مضامین ادب ادیبوں سے متعلق ہیں جن کا تعلق صوبہ جموں سے ہے۔ان ادیبوں کے فن پر ناقدین نے قلم تو اُٹھایا ہے لیکن ان مضامین میں کہیں کہیں تشنگی باقی تھی شہاب عنایت ملک نے ان ادیبوں کی حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقات کو بھی پرکھنے کی ایک اہم کوشش کی ہے۔

ادب کے بعض حلقوں میں یہ بات عام ہوگئی تھی کہ کرشن چندر پونچھ کے رہنے والے تھے لیکن شہاب نے اپنے مضمون ''وادی پونچھ و کرشن چندر'' میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور واضح کیا ہے کہ کرشن چندر پونچھ میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ پانچویں جماعت میں تھے کہ مینڈھر کے ایک اسکول میں داخل کر دیے گئے جہاں ان کے والد اس وقت ڈاکٹر کے فرایض انجام دے رہے تھے۔اور اصل میں کرشن چندر بھرت پور میں پیدا ہوئے تھے۔

غلام رسول کامگار جموں و کشمیر کے اہم شاعر اور دانشور ہو گزرے ہیں ان کی بہت سی تحریریں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ان غیر مطبوعہ تحریروں کی روشنی میں شہاب عنایت ملک نے ان کے فن اور شخصیت سے متعلق اپنی کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اسی طرح ''مضامینِ شہاب'' میں اُنہوں نے ترنم ریاض اور اسیر کشتواڑی کے فن کو بھی پرکھنے کی سعی کی ہے۔

''عصری ادبی تفکرات'' پروفیسر شہاب عنایت ملک کی تازہ ترین تصنیف ہے جو ۲۰۱۳ء میں میزان پبلی کیشنز سے شائع ہوئی۔اس کتاب میں مضامین و مقالات، تاثرات، سفرناموں کا ایک گلدستہ ہے جن کو اُنہوں نے وقتاً فوقتاً ضبطِ تحریر لایا ہے۔

سعادت حسن منٹو اور فکشن میں ایک چونکا دینے والا نام ہے اور جواہر لعل نہرو ہندوستان کی سیاست میں ایک

سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔منٹو کے ایک خط کو مدِ نظر رکھ کر ڈاکٹر شہاب عنات ملک نے جو مضمون تحریر کیا ہے اس سے نہ صرف منٹو کی شخصیت کے نئے نئے جہات سامنے آتے ہیں بلکہ ہندو و پاک کی سیاسی تاریخ وثقافت کے اہم گوشوں سے متعلق ایسی جانکاری ملتی ہے جس پر آج بھی سرے سے سوچا جاسکتا ہے جس میں کشمیر بھی خاص طور پر شامل ہے۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک نہ صرف اپنے طلبہ و اسکالرز میں مشہور ہیں بلکہ جموں یونی ورسٹی کی انتظامیہ بھی اُن کی تدریسی صلاحیتوں کے علاوہ اُن کی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا بھی مانتی ہے۔پروفیسر شہاب عنایت ملک نے جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں دو چار برسوں میں تن تنہا جتنے سیمینار، ورکشاپ اور توسیعی خطابات منعقد کروائے ہیں اُتنے کسی اور کے لئے مشکل ہے۔

پروفیسر نصرت چودھری:۔کشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کے عصری منظرنامے میں ایک خاتون قلم کار بھی شامل ہیں جنھیں ادبی دنیا نصرت چودھری کے نام سے جانتی ہے۔پروفیسر چودھری ایک پختہ کار شاعرہ بھی تھی اور افسانہ نگار بھی۔ان کا شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' (۲۰۰۴ء) میں شائع ہوکر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔افسانوں کا ایک مجموعہ ''سفر چہرے کا'' کچھ عرصے قبل شائع ہو چکا ہے۔لیکن اسکے ساتھ ہی نصرت چودھری کو تحقیق وتنقید سے بھی گہری دلچسپی رہی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے نصرت چودھری نے اپنی ساری توجہ تحقیق وتنقید پر مرکوز کر رہی تھی۔تحقیق وتنقید کے حوالے سے نصرت چودھری کی درج ذیل تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

۱۔ فیض احمد فیض کی شاعری: ایک مطالعہ

۲۔ فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت

۳۔ اُردو تنقید میں فیض شناسی

۴۔ فیض احمد فیض اور جدید شعری ذہن

۵۔ اُردو کے چند اہم افسانوں کا تجزیاتی جائزہ

مذکورہ بالا تصنیفات کے عنوانات سے صاف ظاہر ہے کہ نصرت چودھری کی تحقیق وتنقید نگاری کا مرکز ومحور فیض احمد فیضؔ رہے ہیں۔ اس بات میں شک نہیں کہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد فیض احمد فیضؔ کو ہی اُردو شاعری کا چوتھا ستون مانا جاتا ہے اور اس سے کسی کو انکار بھی نہیں ۲۰۱۱ء میں فیض صدی کے حوالے سے پورے ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں اُردو کی کئی نئی بستیوں میں بھی فیض کے حوالے سے سیمنار، سمپوزیم اور مشاعرے منعقد ہوئے، سینکڑوں رسالوں نے فیض نمبر یا خصوصی گوشے شائع کئے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر و بیشتر نوجوان ناقدین نے فیض پر نصرت چودھری کی کتابوں سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ دراصل فیض پر تحقیقی مقالے اور تنقیدی مضامین تو ہزاروں کی تعداد میں لکھے گئے۔ فیض پر لکھی گئی کتابوں کی بھی کمی نہیں لیکن فیض کی شخصیت اور فن ذہن اور ضمیر روایات کی پاسداری اور شاعرانہ انفراد وافسانہ امتیاز کے حوالے سے نصرت چودھری نے اپنی تصنیفات میں جو تحقیقی انکشافات اور تنقیدی نتائج پیش کئے ہیں۔ اس کی مثالیں اُردو کے چند ایک محققین اور ناقدین کی تحریروں میں ہی ملتی ہیں۔ اسی لیے نصرت چودھری کا شمار اُردو کے چند گنے چنے فیض شناسوں میں ہوتا ہے۔

نصرت چودھری کی تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بھی موضوع پر تحقیقی یا تنقیدی مقالہ قلم بند کرنے سے پہلے وہ اس موضوع سے متعلق بذاتِ خود چھان بین کرتی تھیں۔ محض سنی سنائی یا دوسروں کی لکھی لکھائی باتوں سے متاثر یا مرعوب ہو کر رائے قائم نہیں کرتیں بلکہ متعلقہ حالات کا خود مطالعہ اور مشاہدہ کرتی تھیں۔ ضرورت کے مطابق فن پارہ متن یا متون کو حرف حرف لفظ لفظ خود پڑھ کر اس متن شعر، نظم یا افسانہ کے لسانی پہلوؤں موضوعی معنویت، جمالیاتی محاسن اور فنی انفراد اور تہہ داری کی نشاندہی تحقیقی شواہد اور تنقیدی افکار دلائل کے ساتھ کرتی ہیں۔ نصرت چودھری کسی پختہ کار دانشور کی طرح اول تو اپنے تحقیقی منصوبے کا مقصد قائم کرتی ہیں اور پھر موضوع کی معنویت کو سمجھنے سمجھانے کے لیے موضوع سے متعلق سوالات کرتی تھیں۔ تحقیق کے مرحلوں سے گزر کر ان کے

جوابات تنقیدی تجزیوں کے ساتھ سامنے لاتی تھیں۔ مثلاً نصرت چودھری نے اپنی کتاب ''فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت'' کے پیش لفظ میں یہ سوال قائم کیا ہے کہ۔

> ''وہ کون سا اسم اعظم ہے جس کے باعث نہ صرف موجودہ صدی کے متعدد
> شعراء اور خاص کر اپنے معاصرین میں انہوں نے اپنے انفرادی وجود اور
> مقام کو اپنائے رکھا ہے؟'' ۱۷؎

فیض کی شاعرانہ عظمت کے اسرار کھولنے والے ان دلائل کی نشاندہی بھی کی ہے جن پر فیض کی شاعری سے متعلق ان کا تحقیقی وتنقیدی مقالہ قائم ہے۔ مثلاً نصرت چودھری نے مذکورہ سوال کے جواب میں خود لکھا ہے۔

۱۔ فیض تجربہ پسند اور بغاوت کے حاوی مروجہ میلانات سے گزرنے کے باوجود خود ضبطی، توازن اور اعتدال کو رواں رکھ کر اپنی جداگانہ حیثیت قائم رکھے ہوئے ہیں۔

۲۔ وہ روایت سے ہم رشتہ ہونے کے باوجود اپنی شخصیت اور عصری آگہی کی بنا پر روایت کے اسیر ہو کر نہیں رہے بلکہ روایت کے ایک نئے شعور کی آبیاری کی۔

۳۔ فیض لاشعوری تجربات کے ساتھ ساتھ شعوری تجربات سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اسی لئے کے تخلیقی عمل کا انحصار شعوری اور لاشعوری دونوں طرح کے محرکات پر ہوتا ہے۔

۴۔ اُردو شاعری کے روایتی موضوعات مثلاً عشق، رومانیت، جنس، جمالیات، سماجی تضادات کے علاوہ سیاست ،تحریکِ آزادی، وطنیت اور عالمی سیاسیت وغیرہ کے برتاؤ میں وہ اپنے منفرد تخلیقی رویّے کو بروئے کار لا تے ہی۔

۵۔ فیض کی شاعری پر چند منتخب کلاسیکی شعراء کے ساتھ ساتھ بعض مغربی شاعروں کے اثرات نظر آتے ہیں۔

فیض کی شاعری کی ایک نمایاں انفرادیت ان کی منفرد زبان بھی ہے۔ اس ضمن میں نصرت چودھری نے بجا

طور پر لکھا ہے:

''نئے شعراء کے سامنے فیض احمد فیضؔ کی زبان بھی تھی۔فیض نے اختر الایمان کی طرح نئے الفاظ استعمال نہیں کیے اور نہ ہی میراجی کی طرح ایک لچکدار زبان برتی۔ انہوں نے زبان میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی بلکہ روایتی زبان ہی کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔ ان کی علامتیں بھی اُردو شاعری کے روایتی الفاظ سے ماخوذ ہیں۔لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ناگزیر الفاظ کی شناخت کی اور پھر لفظوں کی مرکبات سے شعری لسانیات کو ایک دل پذیر شکل عطا کی اور زبان کو نئے ادراک کے ساتھ استعمال کیا۔''۱۸؎

ڈاکٹر ریاض احمد:۔ ڈاکٹر ریاض احمد کے اب تک بیس سے زائد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ریاض احمد ایسے اُردو قلم کار ہیں جو زیادہ نہیں عمدہ اور معیاری لکھنے کے قائل ہیں۔تحقیق وتنقید کے معاملے میں وہ ''سرسری ہم جہان سے گزرے'' کے قائل نہیں ہیں۔اسی لئے کسی بھی موضوع پر مضمون سپردِ قلم کرنے سے پہلے وہ اس موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات اور مواد جمع کر کے ان پر غور وفکر کرتے ہیں، پھر اپنے ذوقِ تحقیق اور شعورِ تنقید کی مدد سے اس موضوع سے متعلق تحقیقی وتنقیدی نتائج سامنے لاتے ہیں۔ان میں جدت اور تازہ کاری تو ہوتی ہی ہے ساتھ ہی ان سے تحقیق وتنقید کے سرمائے میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد کے مضامین ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ابھی تک انہوں نے اپنے مضامین کا مجموعہ شائع نہیں کروایا ہے لیکن مختلف یونی ورسٹیوں کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں میں شامل ہیں۔ڈاکٹر ریاض احمد کی اب تک صرف ایک تحقیقی وتنقیدی تصنیف ''ترقی پسند تحریک اور اُردو ناول'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ریاض احمد کی یہ تصنیف موضوع کے اعتبار سے بے حد اہم تصنیف ہے کیونکہ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند شاعری، ترقی پسند افسانہ پر تو خلیل الرحمٰن اعظمی، سردار جعفری اور پروفیسر محمد صادق

کی کتابیں موجود ہیں۔ ناول پر بیسویں صدی میں اُردو ناول (یوسف سرمست) برصغیر میں اُردو ناول (خالد اشرف) اورآزادی کے بعد اُردو ناول ،جیسی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن ترقی پسند تحریک اوراُردو ناول کے موضوع پر ریاض احمد کی تصنیف پہلی تصنیف ہے۔

ہرشخص جانتا ہے کہ اُردو میں آج تک جتنی بھی تحریکات سامنے آئی ہیں ان میں سرسید تحریک کے بعد سب سے اہم کارنامے ترقی پسند تحریک نے ہی انجام دیے ہیں۔ دوسری جانب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو ناول لکھے گئے۔ ان سے اُردو ناول کے موضوع اسلوب اور ہئیت وتکنیک میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ادب کو عام آدمی کے جذبات ومسائل اور زندگی اور زمانہ کے حقائق سے جڑے رہنے کا سلیقہ اصلاً ترقی پسند ناولوں کے وسیلے سے ہی سامنے آیا۔ ڈاکٹر ریاض احمد نے اپنی اس تصنیف میں ترقی پسند تحریک اور ناول کے ایسے تمام مضمرات کی نشاندہی بڑی دیدہ ریزی اور بصیرت مندی کے ساتھ کی ہے۔

ترقی پسندی اور ترقی پسند ناول کے حوالے سے ریاض احمد نے روایتی مفروضیات اور مدرسانہ تاثرات کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ اپنے مطالعہ کی وسعت اور تحقیقی مشقت سے کام لے کر جو کچھ بھی لکھا ہے اسے تازہ کار، غیر روایتی اور تعمیری تنقید ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس بات کا اندازہ ریاض احمد کی مذکورہ کتاب کے چند فقروں سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔

> ’’ترقی پسند ادبی تحریک کو تاریخ کے بندھن میں قید کرنا قطعاً درست نہیں کیوں کہ ظلم وجبر ،استحصال، ذات پات، فرقہ واریت، دلتوں کے حقوق، غریب کسانوں اور مزدوروں کی مفلوک الحالی سے ہمیشہ شعراء اور ادباء کے دل متاثر ہوتے رہے ہیں۔‘‘ [19]

ڈاکٹر ریاض احمد کی یہ تحقیقی وتنقیدی تصنیف، ترقی پسند تحریک اوراُردو ناول کے سفر کے حوالے سے غیر روایتی انداز میں کئی ایسے زاویوں کو سامنے لاتی ہے جن پر ابھی تک ترقی پسند تحریک اوراُردو ناول کے ناقدین نے توجہ نہیں

دی تھی۔سجاد ظہیر کی تصنیف ''روشنائی''، خلیل الرحمٰن اعظمی کی اُردو میں ترقی پسند تحریک اور علی سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' سے قطعِ نظر، ریاض احمد نے ایک طرف تو جارج لوکاچ، رالف فاکس، ٹیری انگلٹن اور پیری اینڈرسن جیسے نو مارکسی (Neo Marxist) دانشوروں کی مارکسی جمالیات سے متعلق تازہ ترین تشریحات وتو ضیحات کو بھی ذہن میں رکھا ہے۔ساتھ ہی ڈاکٹر عبدالعلیم، اصغر علی انجنیئر، ڈاکٹر ممتاز حسین، سبط حسن، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر اختر اور پروفیسر قمر رئیس تک نے ترقی پسند تحریک سے متعلق جن پس نوشت محرکات اور حقائق و واقعات کی نشاندہی کی ہے، ریاض احمد نے اپنی تصنیف میں انھیں بھی سامنے رکھا ہے۔اسی طرح ترقی پسند ناولوں میں سماجی و تاریخی شعور، ہئیت وتکنیک اور اسلوبیاتی و جمالیاتی تنوع کو بھی زیر بحث لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔نظریات اور تخلیقی و جمالیاتی محاسن کو توازن وتناسب کے ساتھ برتنا کمال فن کاری کا تقاضہ کرتا ہے اور ترقی پسند ناول نگاروں میں سے اکثر و بیشتر نے اس کا مظاہرہ اپنے طور پر کس کس انداز میں کیا ہے۔ریاض احمد نے کی اس نشاندہی غیر جانبدارانہ تحقیقی وتنقیدی شعور کے ساتھ کی ہے۔مشہور ترقی پسند دانشور اور نقاد پروفیسر قمر رئیس نے ڈاکٹر ریاض احمد کی اس تصنیف کے بارے میں لکھا ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد نے اپنے اس مطالعہ میں اُردو ناول کے ترقی پسند کردار کا تشخص بڑی محنت اور خوبی سے کیا ہے۔انہوں نے جا بجا طور پر ترقی پسندی کو اُردو ناول کے ایک غالب رجحان کے طور پر سمجھا اور پیش کیا ہے۔اس میدان میں پریم چند اوران کے دوسرے معاصرین کے رویوں کا جائزہ بھی انہوں نے علمی استدلال سے لیا ہے لیکن اس کا اصل موضوع ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیب ہی رہے ہیں۔کرشن چندر، عصمت چغتائی اور عزیز احمد سے شروع ہوکر یہ سلسلہ عبدالصمد اور اقبال مجید کے عہد تک جاری ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد کی مذکورہ بالا تصنیف اور دیگر متفرق تحقیق وتنقید مقالوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ریاض احمد ایک با مطالعہ اور باشعور نقاد ہیں۔وہ قارئین تک اپنے ماضی الضمیر کی ترسیل کا ہنر جانتے ہیں۔ان

کے اسلوب سے خود اعتمادی ٹپکتی ہے، اظہار و بیان کے معاملے میں وہ کلیم الدین اور قمر رئیس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مختصر، سادہ، سہل اور عام فہم الفاظ وتراکیب کے ذریعے وہ اپنے خیالات کا اظہار تقلیل لفظی (Economy of words) کے ساتھ شگفتہ انداز میں اس طرح کرتے ہیں کہ قاری کو ان کے تحقیقی انکشافات اور تنقیدی تجربات کی تفہیم میں کوئی دشواری اور اُلجھن پیش نہیں آتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے موجودہ محققین و ناقدین میں ڈاکٹر ریاض احمد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اکیسویں صدی میں جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کی صورتِ حال کے حوالے سے مذکورہ بالا محققین اور ناقدین کے علاوہ بھی کئی اور ناقدین ہیں جنہوں نے آٹھویں نویں دہائی میں اُردو تحقیق وتنقید کے میدان میں بڑے ہی طمطراق کے ساتھ قدم رکھا لیکن پھر ان کی دلچسپیاں دوسرے شعبوں کی طرف مڑ گئیں۔ ایسے لوگوں میں درج ذیل حضرات کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔

پروفیسر مجید مضمر (مرحوم):۔ اب تک ان کی تین کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔

۱۔ اُردو میں علامتی افسانہ

۲۔ کشمیری ڈرامہ

۳۔ رنگ باتیں کریں (مضامین کا مجموعہ) اس کے علاوہ مجید مضمر نے علامہ اقبال، علی محمد لون، حامدی کاشمیری وغیرہ پر بھی تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں۔

مجید مضمر ایک روشن دماغ نقاد ہیں اُن کی تحریریں بتاتی ہیں کہ وہ نہ صرف شعر وادب کا مطالعہ نئے زاویوں سے کرنے پر یقین رکھتے ہیں، بلکہ موضوع کے نادیدہ گوشوں کو روشن کرنے کا رویہ بھی اپناتے ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کی ساتویں آٹھویں دہائی سے لے کر ۱۳۔۲۰۱۲ء تک مجید مضمر کی جتنی بھی تحریریں سامنے آئی ہیں موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے، ہی نہیں متن سے اخذ معنی تخلیقی تجربات کی بازیافت اور فن پارہ کے لسانی، ادبی اور فکری پہلوؤں

کے تجزیہ کے حوالے سے مجید مضمر کی دیدہ ریزی اور بصیرت مندی ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مجید مضمر کا شمار اُردو کے معتبر نئے نقادین میں ہوتا ہے جن کی اکثر و بیشتر تحریریں کشمیر کی اُردو تنقید میں اضافے کا حکم رکھتی ہیں۔ مجید مضمر کی اب تک تین کتابوں ''اُردو میں علامتی افسانہ''، ''رنگ باتیں کریں''، ''علی محمد لون کا فن'' کے علاوہ متعدد مضامین شائع ہیں۔ جو اِدھر اُدھر رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن مجید مضمر کی تنقید کا مرکزی نقطہ اور بحیثیت نقاد اُن کی شناخت کا بنیادی حوالہ افسانہ کی تنقید رہا ہے۔ مجید مضمر کی تصنیف ''اُردو کا علامتی افسانہ'' یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ انہوں نے اپنے گہرے ادبی ذوق سے کام لے کر افسانوی تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ مجید مضمر کا امتیاز یہ ہے کہ اُن کی تصنیف ''اُردو کا علامتی افسانہ'' موضوع کے اعتبار سے علامتی اُردو افسانہ کا اولین تنقیدی جائزہ ہے۔ ۶۰۔۱۹۵۵ء کے آس پاس سے جدیدیت کے رجحان کے تحت اُردو افسانہ میں جو نیا اسلوب حاوی رہا وہ افسانہ کا علامتی اسلوب ہی تھا۔ اگرچہ افسانہ میں ثقافتی اور مذہبی علامتوں کا برتاؤ کوئی نئی چیز نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتظار حسین، اقبال مجید، رشید امجد، محمد منشا، سریندر پرکاش، بلراج منیرا اور ظفر اوگانوی سے قطعِ نظر اُردو میں جو علامتی افسانے لکھے گئے اُن کی چند خامیاں بھی تھی۔ اکثر و بیشتر افسانوں میں علامت سازی کا عمل تو ملتا ہے لیکن ان میں سماجی و ثقافتی حقائق و مسائل کے حوالے سے معنی خیز گہرائی نہیں ملتی۔ حد درجہ ذاتی یا پھر غیر مانوس علامتوں کے استعمال اور علامت کو افسانے کے آغاز سے انجام تک ایک ہی معنی میں برتنے کی عدم صلاحیت کے سبب اکثر و بیشتر علامتی افسانے چیستان بن کر رہ گئے۔ مثلاً بلراج مینرا نے ''پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ''، سریندر پرکاش نے ''تلقارمس'' اور ظفر اگانوی نے ''انٹر اموراسس'' کے عنوان سے جو تحریریں علامتی و تجریدی افسانہ کے نام سے پیش کی ہیں انہیں چاہے کچھ بھی نام کیوں نہ دے دیا جائے افسانہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ افسانہ سادہ اسلوب میں لکھا جائے یا علامتی اسلوب میں، تجریدیت کی تکنیک اپنائی جائے یا میجک تکنیک کی ضروری ہے کہ قاری اپنی قرات کے ذریعے جب افسانے کو نچوڑے تو اس سے افسانویت یا کہانی پن

ٹپکے کیونکہ کہانی پن ہی افسانے کا اصل اور بنیادی صنفی جوہر ہے،لیکن مذکورہ افسانوں میں یہ بات نظر نہیں آتی ان کے برعکس ان ہی افسانہ نگاروں کے افسانے مثلاً بلراج مینرا کا'' ماچس''، سریندر پرکاش کا'' دوسرے آدمی کا ڈرائینگ روم'' اور ظفر اوگانوی کا'' بیچ کا ورق'' بہترین علامتی افسانے ہیں۔ پروفیسر مجید مضمر نے اپنی تصنیف'' اردو کا علامتی افسانہ'' میں علامت کے معنی ومفہوم، علامت نگاری کی تاریخ اور ادب میں علامت کے برتاؤ کی نزاکتوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اُردو میں علامتی افسانہ کی خوبیوں اور خامیوں کا بہترین تجزیہ پیش کیا ہے۔ مجید مضمر نے اپنی کتاب کے آغاز میں خود لکھا ہے:

> ''موجودہ صدی کی چھٹی دہائی سے اب تک جو افسانوی سرمایہ سامنے آچکا ہے وہ نہ صرف اپنی مقدار کے لحاظ سے بلکہ معیار اور کیفیت کے اعتبار سے بھی ایک علحدہ وجود منوا چکا ہے۔ افسانہ کی یہ منفرد صورت زیادہ تر علامتی ورتخلیقی برتاؤ سے متشکل ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامتی افسانہ نے اظہار کی سطح پر عصرِ جدید کی پیچیدگیوں کا ساتھ دیا، فارمولا زدہ کہانی کا قلع قمع کر دیا اور سطحی رومانیت اور کھوکھلی جذباتیت کے ساتھ ساتھ خارجیت، وضاحت پسندی اور برہنہ مقصدیت کا انہدام کر کے افسانہ کے فنی تشخص کی تعمیر اور ادبی اقدار کی بحالی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یوں بھی شعری تخلیق کی طرح، افسانہ فن کار کی تخلیقی شخصیت کی جملہ توانائی، تابناکی اور اسراریت کا حامل ہوتا ہے اور ایک ناگزیر، قائم بالذات لسانی وتخلیقی وجود رکھتا ہے، اس کا جوہر بھی وضاحت، تکرار، طوالت اور خالص بیانیہ کے غیر تخلیقی عناصر کی بجائے ارتکاز، تہہ داری، داخلیت اور تجربے کے علامتی ادراک واظہار میں ہی کھلتا ہے اُردو افسانہ میں اس نوع کا تخلیقی رجحان، جسے ہم علامتی رجحان کے نام سے پہچانتے ہیں،

باقاعدہ طور پر ۱۹۵۵ء کے آس پاس شروع ہوا۔لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کے
جدید اُردو افسانہ کی پشت پر پریم چند، یلدرم، منٹو اور بیدی جیسے افسانہ نگاروں کی جو
قابل قدر میراث ہے۔اسے یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔'' ۲۰؎

مجید مضمر نے مذکورہ کتاب کے پہلے ہی مضمون ''ادب اور علامت'' میں علامتی عمل کی قدیم اور موجودہ صورت اور الفاظ کے علامتی برتاؤ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''زبان انسانی ذہن کی سب سے اہم اور پُر اسرار پیداوار ہے۔زبان کے بغیر واضح
خیال کا وجود بہت حد تک ناممکن ہے۔ماہرین لسانیات کے مطابق زبان کی ابتدا کا
اصل سبب انسان کے ''حقیقت کو علامتی روپ میں دیکھنے'' کا رجحان ہے۔سوسین
لینگر کے خیال میں زبان علامتوں کے آزادانہ اور بھر پور استعمال اور تخیلات و
تصورات کا ذریعۂ اظہار ہے۔تجربے کو علامتی شکل میں تبدیل کرنے کا رجحان قوت
گویائی کا پہلا قدم ہے۔زبان اپنی ترقی یافتہ صورت میں ایک دہرا علامتی نظام ہے
کہ ایک تو اس میں وہ اصوات شامل ہیں جو مختلف خیالات، حقائق اور اشیا کی
علامتیں ہیں اور جنہیں ہم الفاظ کہتے ہیں۔دوسرے وہ بصری علامتیں جن کو صوتی علا
ئم کا قائم مقام تصور کیا جاتا ہے اور جو ہماری زبان کے تحریری حروف یا الفاظ ہیں۔
تقریری اور تحریری دونوں صورتوں کے علامتی سلسلے مل کر ایک جامع نظام علائم فراہم
کرتے ہیں جو انسان کے کرداری عمل کو اسقدر ہمہ گیر اور جامع بناتا ہے۔'' ۲۱؎

اُردو علامتی افسانہ کا دیباچہ پروفیسر حامدی کاشمیری نے لکھا ہے۔ان کی رائے میں:

''مجید مضمر کی تنقید سے ان کے متوازن اور دقیقہ رس ذہن کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے تا

ہم اس سے بڑھ کر ان کے ذہن کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ افسانے کا مطالعہ مکتبی انہ انداز سے نہیں ، بلکہ ایک ایسے بیدار مغز ناقد کی حیثیت سے کرتے ہیں جو اپنی تر جیحات وتعصّبات سے بالاتر ہو کر اس (افسانے) کے اسراری وجود میں دوب جاتے ہیں اور سراغِ فن پاتے ہیں۔ وہ غیر مشروط ذہن سے جدید افسانے کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ چونکہ جدید ادب تمام عاید کردہ نظریات کی نفی کرتا ہے اس لئے مجید مضمر کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ان کی تنقیدوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ افسانے کا تعارف یا اس کی تلخیص پیش نہیں کرتے بلکہ اس کے لسانی در و بست اور اس کی استعاراتی اور علامتی ساخت کی تجزیہ کاری پر تکیہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انور سجاد، انتظار حسین، رشید امجد اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں سے متعلق ان کے مقالے بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔" ۲۲

مجید مضمر نے اپنی تصنیف میں جن عنوانات کے تحت علامت، علامت نگاری اور علامتی افسانہ نگاری کے معیار، نزاکتوں اور شرائط کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس کا اندازہ آپ کی تصنیف "اُردو کا علامتی افسانہ" کے ابواب سے لگایا جاسکتا ہے جو اس طرح ہیں۔

۱۔ ادب اور علامت

۲۔ صنفِ افسانہ کے تخلیقی امکانات

۳۔ اُردو افسانہ میں علامتی برتاؤ۔ روایت اور تجربہ

۴۔ قرۃ العین حیدر کا تخلیقی برتاؤ

۵۔ انتظار حسین کا فن۔ گمشدہ ماضی کی بازیافت

۶۔ انور سجاد کی افسانوی کائنات

۷۔ رشید امجد۔ ریت کے پیکروں کا خالق

۸۔ علامتی افسانہ کے پیچ وخم

''اُردو کا علامتی افسانہ'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد مجید مضمر کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ'' رنگ باتیں کریں'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں ''اُردو افسانے کی تنقید''، ''میر تقی میؔر اور اُردو تنقید '' کے علاوہ فیض احمد فیض، حکیم منظور اور حامدی کاشمیری کی شاعری کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مجید مضمر ایک مکمل نقاد ہیں اور شعروادب کی تنقید کے عمل سے گزرتے ہوئے۔ جس وسیع مطالعہ، نگاہ تیز اور تجزیاتی شعور کی ضرورت ہوتی ہے، مجید مضمر ان تمام اوصاف سے متصف تھے۔ اس کا اعتراف حامدی کاشمیری، مرغوب بانہالی ،غلام رسول ملک، شفیع شوق، اور رشید مجروح جیسے تمام دانشوروں کو ہے۔ بقول پروفیسر قدوس جاوید''ضرورت اس بات کی ہے کہ اب جبکہ مجید مضمر ہمارے درمیان نہیں ہیں کشمیر میں اُردو تنقید کے میدان میں ان کی خدمات کا تفصیلی اور سنجیدہ مطالعہ سامنے لایا جائے۔''

پروفیسر اسداللہ وانی:۔ پروفیسر اسداللہ وانی گذشتہ تیس برسوں سے تحقیق وتنقید سے وابستہ ہیں۔ ان کے مطبوعہ مضامین کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔ اقبالیات سے انھیں خاص دلچسپی ہے، اس ضمن میں ''اقبالیاتِ آزاد'' کے عنوان سے ان کی تصنیف مشہور ہے۔ ''شیخ العالم ایک مطالعہ'' میں اس اللہ وانی نے تحقیق نگاری کی عمدہ مثال پیش کی ہے جبکہ ''کشمیر میں اُردو افسانہ'' ان کے تنقیدی شعور کا ثبوت ہے۔

پروفیسر نذیر احمد ملک:۔ پروفیسر نذیر احمد ملک اصلاً ''لسانیات'' کے مردمیداں ہیں۔ لسانیات کے حوالے سے ان کی دو تحقیقی وتنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ا۔ کشمیری سرمایہ الفاظ کے سرچشمے

۲۔ اُردو رسم خط ارتقاء اور جائزہ۔

اس کے علاوہ انہوں نے اقبال ، سعادت حسن منٹو اور اُردو ناول کے حوالے سے بھی چند تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ مافی چاہتا ہوں مواد کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے پروفیسر نذیر احمد کے اوصاف و نقائص کا تفصیلاً جائزہ پیش نہیں کر سکا۔

پروفیسر محمد زماں آزردہ:۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں۔ان کے کشمیری انشائیوں کے مجموعے ''ایسے'' پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ مل چکا ہے۔اُردو میں ان کا واحد تحقیقی و تنقیدی کارنامہ'' سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے'' ہے جو دراصل ان کا وہ مقالہ ہے جس پر انھیں لکھنؤ یونی ورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی (پی۔ایچ۔ڈی) کی ڈگری تفویض کی تھی ۔ یہ مقالہ مرزا سلامت علی دبیر کی حیات اور کارناموں کے بارے میں ایک عمدہ تحقیقی و تنقیدی تصنیف تصور کیا جاتا ہے۔محمد زماں آزردہ نے اس کے علاوہ بھی چند عمدہ تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔

اپنی واحد تحقیقی اور تنقیدی تصنیف ''سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے'' میں ڈاکٹر زماں اذردہ نے مرزا دبیر کا بچپن، خاندانی پسِ منظر، ان کا شجرۂ نسب، تعلیم ، ذرائعِ معاش، ان کے سفر، قیامِ لکھنؤ، صحافتی اور فلمی اداروں کے ساتھ وابستگی اور آخر میں وفات وغیرہ سے متعلق تفصیلی بحث و مباحثہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دبیر کی شخصیت کے پنہاں گوشوں کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ان کی گھریلو زندگی ، مذہبی اور سیاسی اعتقادات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

محمد زماںؔ آزرودہ کی تحقیقی اور تنقیدی تصنیف اور چند تنقیدی مضامین سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ اور باصلاحیت ادیب، باذوق اور صاحبِ نظر نقاد، ایک محنتی اور ذمہ دار محقق اور ایک ایماندار اور پُرخلوص اُستاد

تھے۔ان کی تحریریں خواہ تنقید سے متعلق ہوں یا تحقیق سے، اُردو زبان وادب سے متعلق ہوں یا کشمیری زبان وادب سے تاریخ وتمدن سے متعلق ہوں یا تہذیب وثقافت سے اُن میں فلم کی بات کہی گئی ہو یا عوامی زندگی کی غرض یہ کہ کوئی پہلو کیوں نہ ہو تمام مضامین موضوعات کی بوقلمونی اور خشکی کے باوجود ان کے اسلوب نگارش، طرز اظہار اور طریقہ استدلال کی بدولت ایسی حلاوت وشیرینی میں ڈھل جاتے ہیں کہ قاری کی طبیعت بوجھل یا گرانباری کا شکار نہیں ہوتی۔ان کی نثر شگفتہ، رواں، آساں اور عام فہم مگر زوردار اور پُر اثر ہے انھوں نے ابتدا میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا یا بعدازاں ایک نقاد اور محقق کے طور پر بھی اپنی شخصیت تسلیم کروائی۔انھوں نے اُردو زبان وادب کے علاوہ کشمیر اور بیرون کشمیر کی شخصیات کے ساتھ ساتھ دوسرے موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا اور جاندار تحریریں پیش کیں۔''سلامت علی دبیر۔حیات اور کارنامے'' سے ان کے وسعتِ مطالعہ کی کشادہ نظری، عمیق مشاہدہ، تجربہ علمی، محققانہ بصیرت کا بین ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق نعیمی:۔معاصر ناقدین میں عبدالحق نعیمی ایک با مطالعہ محقق اور نقاد ہیں۔اب تک ان کی کئی تحقیق وتنقیدی تصنیفات منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

۱۔ اُردو میں عربی وفارسی کے اقوال ضرب الامثال

۲۔ دریا بہ دریا جو بہ جو (پروفیسر ظہور الدین کی شخصیت اور فن پر مضامین کا مجموعہ)

۳۔ قران حکیم کی فصاحت وبلاغت

۴۔ تعبیر وتفہیم

اس کے علاوہ عبدالحق نعیمی نے افسانہ، تنقیدی، شاعری اور اقبالیات کے حوالے سے متعدد مضامین بھی لکھے ہیں۔

ڈاکٹر شفق سوپوری:۔شفق کا شمار اُردو کے معتبر معاصر شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کے کئی شعری مجموعے شائع

ہو چکے ہیں ان میں ''آب رواں'' کو کافی شہرت ملی۔شفق سوپوری نے شاعری اور موسیقی کے تعلق سے کئی کتابیں شائع کی ہیں۔اس کے علاوہ عروض و بلاغت ،افسانہ،انشائیہ وغیرہ کے حوالے سے بھی ان کے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہین۔شفق سوپوری کی تحقیقی وتنقیدی تصنیفات میں درجِ ذیل اہم ہیں۔

۱۔ غ۔م۔طاوس:ایک مطالعہ

۲۔ کلامِ فیض کا عروضی مطالعہ

۳۔ اُردوغزل اور ہندوستانی موسیقی

۴۔ مخزن موسیقی

۵۔ موسیقی،شاعری اور لسانیات

۶۔ جہات (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ)

ڈاکٹر نذیرآزاد:۔ شفق سوپوری کی طرح نذیر آزاد کا بھی پہلا عشق شاعری ہے۔نذیر آزاد کی غزلیں اور نظمیں ہندو پاک کے موقر رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔کئی شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔تحقیق وتنقید کے حوالے سے نذیر آزاد کی دو کتابیں اہم ہیں۔

۱۔ کشمیری پر اُردو کے اثرات (ایک لسانی تجزیہ ۲۰۱۲ء)

۲۔ کشمیرامکانات (تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۲۰۱۱ء)

اس کے علاوہ نذیر آزاد نے مختلف موضوعات پر جو تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں ان سے کشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کی موجودہ صورتِ حال کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔

جان محمد آزاد:۔ جان محمد آزاد فکشن نگار ہیں لیکن ان کی بعض تصنیفات مثلاً ''آدابِ صحافت'' اور ''جموں و کشمیر کے اُردو مصنفین''، تحقیق وتنقید کی اچھی مثالیں ہیں۔جموں وکشمیر کے اُردو مصنفین میں انہوں نے جموں وکشمیر

کے ایک سوبیس اُردو قلم کاروں کے بارے میں اختصار کے ساتھ معلوماتی نوٹس (Notes) لکھے ہیں۔ان میں تحقیقی وتنقیدی عناصر تو ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اس کتاب ''جموں کشمیر کے اُردو مصنفین'' کی حیثیت ایک معلوماتی کتاب کی ہے جس میں جموں وکشمیر کے قدیم وجدید افسانہ نگاروں، ناول نگاروں، صحافیوں، محققوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ معلومات جمع کی گئی ہیں۔لیکن یہ معلوماتی تصنیف طلباء وطالبات کے لئے مفید ہے۔

بشیر احمد نحوی:۔ بشیر احمد نحوی کشمیر میں ایک مخلص عاشقِ اقبال اور خطیب کے طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ کشمیر انسٹی چیوٹ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے انہوں نے کئی قومی اور بین القوامی سیمنیار کروائے جن میں اقبالیات کے حوالے سے معیاری تحقیقی وتنقیدی مقالے پیش کئے گئے۔ یہ مقالے بعد میں یا تو کتابی صورت میں شائع کئے گئے یا پھر اقبال انسٹی چیوٹ کے مجلّہ اقبالیات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔بشیر احمد نحوی نے اپنے ڈائریکٹر شپ کے زمانے میں مرغوب بانہالی، پروفیسر قدوس جاوید، حکیم منظور اور غلام رسول ملک سے اقبال پر کتابیں لکھوائیں اور خود بھی دو کتابیں لکھیں ہیں۔

۱۔ اقبال اور تصوف

۲۔ اقبال افکار واحوال

اس کے علاوہ بھی اقبال پر انہوں نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔تاریخ کے مطالعے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر علمی اور ادبی شخصیت کی بقائے دوام کا راز اس کے غیر معمولی کارناموں میں مضمر ہوتا ہے۔اس لئے یہاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پروفیسر نحوؔی کی اقبالیات سے جو والہانہ وابستگی رہی ہے، متذکرہ بالا تاریخی فیصلے کے عین مطابق ہے کیونکہ پروفیسر نحوؔی، اقباؔل سے کچھ اس قدر متاثر ہیں کہ مطالعۂ اقبالیات ان کے لئے روزمرہ کی غذا بن گیا ہے۔ بے شک وہ ایک پختہ کار دانشور، صاحبِ طرز ادیب اور ایک مثالی استاد کی شخصیت کے وارثِ جائز ہیں، نحوؔی، اقباؔل کی فکر، پیغام اور روح کو عام انسان کے دل میں منتقل کرنے والی جستجو کا

نام ہے۔فکر وفن کو پیش کرنے کا، ان کا اندازِ بیان ہی کچھ ایسا انوکھا اور نرالا ہے کہ ان کی زبانی ،فکر اقبال عوامی دل چسپی اور پسندیدہ موضوع بنا جاتا ہے۔

پروفیسر نحوی کو بحیثیت اقبال شناس اور اقبال فہم قبولِ عام حاصل ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ علامہ اقبال کو پیش کرتے وقت خوبصورت عنوانات کے تحت ان کی زندگی، شخصیت اور فکر وفن کے پیالے، ایسے فکری پیمانے سے پلانے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں ہر سننے والا آبِ حیات سمجھ کر پی جاتا ہے۔

مجموعی طور پر وفیسر بشیر احمد نحوی جس اخلاصِ نیت کے ساتھ اقبال فہمی اور اقبال شناسی کو بانٹنے کا حق ادا کر رہے ہیں وہ یقیناً قابلِ تحسین وآفرین ہی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے لئے باعث صد افتخار بھی ہے۔آپ کی سر براہی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سمیناروں، مباحثوں، مذاکروں اور مشاعروں کا یہ سلسلہ جو دیکھنے کو ملتا ہے واقعی اقبالیات میں ایک قابلِ قدر اضافے کی دلیل پیش کرتا ہے۔اس مستزاد یہ کہ آپ کی حوصلہ افزائی کی بدولت اب نوآموز ادیبوں اور محققوں کے متعدد مقالے بھی شعبے کے مجلّے اقبالیات میں جگہ پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اب اقبالیات پر سنجیدہ تحقیق اور تنقید کرنے والے بے تاب نوجوان محققین بھی شعبے کے مستقبل کا دروازہ کھٹکھٹاتے نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ اب تک شعبۂ اقبالیات میں پروفیسر نحوؔی کی زیر ادارت تقریباً تیس کتب و جرائید شائع ہو چکے ہیں جن میں سے درجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ اقبال ایک تذکرہ:حکیم منظور

۲۔ اقبال ایک تجزیہ۔ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

۳۔ مطالعۂ مثنوی اسرارِ خودی۔ڈاکٹر تسکینہ فاضلؔ

۴۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے مسلم اعلام۔ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

۵۔ وہ دانائے سبل۔ڈاکٹر ع بشیر احمد نحوؔی

۶۔ نفحات اقبال۔ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

۷۔ اقبال کا تخلیقی شعور۔حامدی کاشمیری

۸۔ رازالوند۔سید حبیب

۹۔ اقبال اور عالمِ عربی و دیگر مقالات۔ڈاکٹر بدرالدین بٹ

۱۰۔ جاوید نامہ۔پروفیسر سراج الدین اور اقبال کی تخلیقت۔پروفیسر قدوس جاوید

اس کے علاوہ پرفیسر بشیر احمد نحوی نے اقبالیات سے متعلق جو سیمینار منعقد کروائے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔	اقبال اور معاصر نظامِ تعلیم	۲۰۰۰ء	پرفیسر بشیر احمد نحوی
۲۔	اقبال اور تعمیرِ آدمیت	۲۰۰۱ء	....
۳۔	پروفیسر جگن ناتھ آزاد سیمینار	۲۰۰۳ء	....

الغرض کہ بشیر احمد نحوی نے کشمیر میں اُردو تحقیق و تنقید کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور خصوصاً جو اُنہوں نے اقبال شناسی کے فروغ میں اپنا کردار نبھایا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس کے علاوہ بھی اقبال پر انہوں نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔بشیر احمد نحوی نے کشمیر میں اُردو تحقیق و تنقید کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جموں و کشمیر میں اُردو تحقیق و تنقید کی صورتِ حال کے منظرنامے میں اگر جموں یونی ورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی سے وابستہ بعض اساتذہ اور اسکالرز کو بھی شامل کر لیا جائے تو بظاہر جموں و کشمیر میں تحقیقی و تنقیدی ادب لکھنے والوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جائے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو شعر و ادب کو مثبت اور تعمیری سمت دینے والے ایسے محققین اور ناقدین کم ہیں لیکن جو ہیں ان کی کاوشوں کو برصغیر ہندو پاک کے دوسرے مراکز کے محققین اور ناقدین کی تحریروں کے بالمقابل رکھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ اعجاز احمد ککرو: شورش کاشمیری نمبر، شیرازہ، ص، ۳۵، جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر

۲۔ پریمی، رومانی: بحوالہ فکروفن، (مرتب) اسداللہ وانی، ص، ۳۹، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء

۳۔ پریمی، رومانی: بحوالہ فکروفن، (مرتب) اسداللہ وانی، ص، ۴۳، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء

۴۔ پریمی، رومانی: بحوالہ فکروفن، (مرتب) اسداللہ وانی، ص، ۴۳، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء

۵۔ پریمی، رومانی: بحوالہ فکروفن، (مرتب) اسداللہ وانی، ص، ۴۸، رچنا پبلی کیشز ۲۰۱۱ء

۶۔ پریمی، رومانی: بحوالہ فکروفن، (مرتب) اسداللہ وانی، ص، ۴۹، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء

۷۔ پریمی، رومانی: بحوالہ فکروفن، (مرتب) اسداللہ ونی، ص، ۵۰، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء

۸۔ پریمی، رومانی: بحوالہ فکروفن، (مرتب) اسداللہ وانی، ص، ۵۱، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء،

۹۔ پریمی، رومانی: بحوالہ فکروفن، (مرتب) اسداللہ وانی، ص، ۵۱، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء

۱۰۔ ضیاءالدین، پروفیسر: اطرافِ تنقید، ص، ۸۸، ناشر، سیمانت پرکاش دہلی ۲۰۰۶ء

۱۱۔ عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر: بحوالہ، مشتاق احمد وانی، تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران، ص، ۱۳، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۲ء

۱۲۔ مشتاق احمد وانی: تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران، ص، ۱۵۸، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۲ء

۱۳۔ مشتاق احمد وانی: اُردو ادب میں تانیثیت، ص، ۱۴، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۳ء

۱۴۔ راشد عزیز: انٹرویو، قدوس جاوید سے، بمقام ریڈیو کشمیر، سرینگر۔

۱۵۔ ایضاً۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۱۶۔ احمد علی جوہر: تبصرہ، ''متن، معنی اور تھیوری''، یونیورسل اردو پوسٹ ڈاٹ کام

۱۷۔ نصرت چودھری، پروفیسر: فیض احمد فیض، روایت اور انفرادیت، ناشر، سیمانت پرکاش نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

۱۸۔ نصرت چودھری، پروفیسر: فیض احمد فیض، روایت اور انفرادیت، ص، ۳۱۴، ناشر، سیمانت پرکاش نئی دہلی ۱۹۹۵ء

۱۹۔ ڈاکٹر ریاض احمد: ترقی پسند اُردو تحریک اور اُردو ناول، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی،

۶۰۔ مجید مضمر، پروفیسر: اردو کا علامتی افسانہ، ص۱۰، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی

۲۱۔ ایضاً ۔۔۔۔: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص۱۵، ۱۶۔

۲۲۔ حامدی کاشمیری، پروفیسر: دیباچہ، اردو کا علامتی افسانہ، ص۷، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی

☆☆☆☆☆☆

حاصل مطالعہ

جموں وکشمیر کو اپنے قدرتی حسن کے علاوہ داخلی حسن کے باعث جنت عرضی کا شرف حاصل ہے۔ مذہبی اعتبار سے ہندو دھرم اور بدھ دھرم، شیومت اور اسلام نے بھی جموں وکشمیر کی عوام کو عقائد کے حوالے سے متاثر کیا اور لسانی وادبی سطح پر بھی، جموں وکشمیر نے فکر وشعور کو بالیدہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جموں وکشمیر میں اردو زبان کے آغاز وارتقاء میں، سنسکرت، کشمیری، فارسی، عربی اور دیگر مقامی زبانوں اور بولیوں کے سرمایہ الفاظ کی آمیزش وآویزش کا تاریخی کردار رہا ہے۔ تاریخی اور لسانی کتابوں سے یہ واضح شواہد ملتے ہیں کہ جموں وکشمیر میں کشمیری خاندان کی اسلامی حکومت کے قیام سے قبل کچھ بعد تک سنسکرت رائج تھی۔ اس دور کا تمام تر علمی وادبی اور مذہبی سرمایہ سنسکرت زبان ہی میں ملتا ہے اور سنسکرت لکھنے کے لئے شاردا رسم الخط رائج تھا۔ جموں وکشمیر میں سنسکرت زبان کے گہرے رسوخ کا اندازہ اس امر سے بھی بخوبی ہوتا ہے کہ جموں وکشمیر کا تمام تر سرکاری ودرباری نظام، خط وکتابت، حتیٰ کہ مسلمانوں کی قبروں کے کتبے بھی سنسکرت زبان میں کندہ ہیں۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ سنسکرت زبان اس قدر اہمیت حاصل ہونے کے باوجود بھی عام بول چال کی زبان کا درجہ حاصل نہیں کر سکی جو بعد میں اردو زبان کو حاصل ہے۔

یوں تو جموں وکشمیر میں بدھ مذہب کی تعلیمات علم عروض، قواعد، شعریات، شاعری اور ناٹک پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں لیکن ان تمام تصانیف میں سب سے زیادہ اہمیت اور شہرت پنڈت کلہن کی تصنیف ''راج ترنگنی'' جو پانچ ہزار سالہ تاریخ جموں وکشمیر پر مشتمل ہے کو حاصل ہوئی۔ یہ تصنیف (راج ترنگنی) جموں وکشمیر کی تاریخ کا قدیم اور مستند ماخذ ہے جس میں کلہن نے ابتداء سے بارہویں صدی کے وسط تک جموں وکشمیر کے تمام حکمرانوں کا تفصیلی

تذکرہ کیا ہے۔اس تصنیف کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر سلطان زین العابدین جنہوں نے اپنے دور میں دالترجمہ بھی قائم کیا تھا کے حکم سے ملا احمد نے ''بحرالاسمار'' کے نام سے فارسی ترجمہ کیا۔شاہمیری خاندان کی اسلامی حکومت کا قائم ہونا اور پھر سکھوں کا عہد سنسکرت زبان کے مائل بہ زوال ہونے اور بدر ہونے کی دلیل ہے۔

جموں وکشمیر میں فارسی زبان کی آمد کے واضح آثار تو شہمیری عہد کی اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ محسوس کئے جا سکتے ہیں لیکن محققین کے پیش نظر اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت سے قبل بھی فارسی زبان کا محدود حد تک عمل دخل رہا۔ڈاکٹر صابر آفاقی لکھتے ہیں ''پنڈت کلہن نے راج ترنگنی (مولفہ ۱۱۴۹ء) دویرا اور گنجور جیسے فارسی الفاظ برتے ہیں جو فارسی زبان کے نفوذ کا پتہ دیتے ہیں''۔ ۱۳۷۷ء میں روحانی اور علمی شخصیت سید علی شاہ ہمدانی جموں وکشمیر میں تشریف لائے جنہوں نے جموں وکشمیر کے مذہبی، سماجی تہذیبی اور لسانی تاریخ پر انقلابی اور دیرپا نشان چھوڑے۔بلند پایہ عالم دین اور مصنف نے فارسی زبان میں کم از کم بیس سے زائد رسالے لکھے جن میں معرفت زہد، چہل حدیث، کشف الحقائق اور رسالہ مکتوبات قابل ذکر ہیں۔آپ ایران سے ہمراہ سات سو سادات کے تشریف لائے جن میں فارسی زبان کے قدردان، علم وادب کے رسیا، شعر وسخن کا اچھا مذاق رکھنے والے موجود تھے۔شہمیری سلاطین کا دور حکومت خانہ جنگی اور خلفشار کا شکار ہوتا گیا جس کے باعث علم وادب کے فروغ کا سلسلہ محدود ہوتا گیا لیکن زبان کا ارتقاء مسلسل جاری رہا۔

جموں وکشمیر میں شہمیری خاندان کی حکومت کے خاتمے کے بعد چک برسر اقتدار آئے۔ چک حکمران بنیادی طور پر شعیہ عقائد کے حامل تھے۔ چنانچہ ایران کی زبان ہونے کے ناطے فارسی کے ساتھ ان کی دلچسپی فطری تھی۔ چک حکمرانوں میں حسین شاہ چک اور یوسف شاہ چک کے دور میں فارسی زبان کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس عہد میں محمد امین مستغنی، میر علی، ملا نامیؔ اور مہریؔ جیسے شاعر منظر عام پر آئے جن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا زمانہ معترف

ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ذیل میں درج ہیں:

گل بدستم چہ نہی در کفِ من خار خوش است

ایں گلِ تازہ براں گوشہ دستار خوش است

(میر علی)

دستم بریدہ باد چہ کار آیدم بگو

در گردن بتاں چو حمائل نمی شود

(نامی)

نم خندہ نیم بہ طبع عاشق ناساز

یا گریہ کہ بر روی روم چوں غماز

(مستغنی)

یوسف شاہ چک خود بھی اچھے شاعر تھے۔ کشمیر میں ایک خوبصورت مقام ہے یہاں آپ تفریح کے لئے گئے اور سبزہ زار میں قریب قریب دو چشمے نکلتے تھے جن کے نام تارسر اور مارسر تھے ان چشموں سے موتیوں کی صورت نکلتے پانی کو دیکھ کر یوسف کی شاعرانہ حس پھڑکی اور بت کشمیر (حبہ خاتون) کی یاد میں یہ خوبصورت شعر کہا:

بہ یاد دو زلف بتِ کشمیر نژادی

شد تارسر و مارسر از گریہ چشم

جموں و کشمیر میں چکوں کے بعد مغلوں کا دور آیا اس دور میں جموں و کشمیر بلند پایہ شعر و سخن کا مرکز بن گیا اسی عہد میں فارسی کو سرکاری اور درباری زبان کا درجہ دیا گیا اور مغلوں کی علم نوازی اور ادب پروری نے جموں و کشمیر

میں فارسی علم وادب اور خصوصاً شعروادب کے نئے باب کھول دیئے اس عہد کو جموں وکشمیر میں فارسی شعروادب کا عہد ذریں کہا جاتا ہے۔ اسی عہد میں جموں وکشمیر کے شعروادب کا ایک ایسا سخن سنج بھی پیدا ہوا جس کی شہرت ہندوستان سے نکل ایران تک پھیل گئی یہ صاحب کمال ملا محمد طاہر غنی ہیں۔ غنی نامور عالم اور شاعر ملا محسن فانی کے شاگرد تھے۔ غنی کے متعلق یہ روایت اکثر محققین نے نقل کی ہے کہ ''مکاں کی متاع بے بہا تو میں ہوں نہ ہوں گا تو مکاں کے دروازے بند کرنا بے سود ہے''۔

جموں وکشمیر میں مغلوں کے بعد افغان دور کے خاتمے کے ساتھ ہی فارسی علم وادب کے سوتے خشک ہوتے رہے اور فارسی زبان کا وہ چراغ گل ہو گیا جس کی لو سے اہل ایران نے بھی حرارت اور راہنمائی حاصل کی تھی۔

مختلف حصوں میں تقسیم جموں وکشمیر کا المیہ یہ رہا ہے کہ یہاں کبھی بھی کوئی مشترکہ زبان پراوان نہیں چڑھ سکی، سنسکرت اور فارسی یہاں کی علمی، ادبی، تہذیبی و درباری زندگی پر راج کرتی رہی ہیں، لیکن ان زبانوں کو عام بول چال کا مقام حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ اسی کے پیش نظر آج ہم دیکھتے ہیں کہ جموں وکشمیر لسانی اعتبار سے کئی حصوں میں منقسم ہے۔ جموں میں عام بول چال کی زبانیں ڈوگری، گوجری، پہاڑی، پنجابی ہیں۔ کشمیر میں 'کشمیری' زبان بولی جاتی ہے جبکہ لداخ میں لداخی، شینا، بلتی وغیرہ زبانیں۔ ان تین صوبوں میں بسنے والوں کا مذہبی اور علاقائی بندھنوں کے باعث آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے، لیکن لسانی اختلافات ان کے معاملات اور اختلاط میں رکاوٹ کا باعث تھے۔ ان حالات میں کسی مشترکہ زبان کی ضرورت تھی جو اہل جموں وکشمیر کے رابطے اور ہم آہنگی کا ذریعہ بنتی۔ اسی ضرورت نے جموں وکشمیر میں اردو زبان کی ترویج وترقی اور نشو ونما کے امکانات پیدا کئے اور آج اردو وہ واحد زبان ہے جو جموں وکشمیر کے تینوں حصوں میں نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ ادب کی مختلف اصناف کی صورت میں اہل جموں وکشمیر کے احساسات وجذبات کی ترجمان اور سفیر بھی ہے، ساتھ ہی عوام کی بیداری

اور ترقی کی نقیب بھی۔ آج جموں وکشمیر میں اردو زبان کو سرکاری ودفتری زبان ہونے کا درجہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس مضبوط پل کی بھی حیثیت حاصل جو ان خطوں کے باسیوں کو آپس میں ملانے ان میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے اور ایک منزل متعین کرنے میں ان کی معاون ہے۔

جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کو باقاعدہ فروغ بخشنے میں مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۸ء) کا عہد قابل ذکر ہے۔ رنبیر سنگھ کو ریاستی امور چلانے اور اسے زمانے سے ہم آہنگ کرنے کے لئے تعلیم یافتہ اہلکاروں اور عہدے داروں کی ضرورت محسوس ہوئی، جس کے تحت انگریزی، عربی، فارسی اور اردو کی تدریس کے لئے مختلف مدرسے اور اسکول قائم کیے۔ پنجاب سے طالب علم بھی حصول تعلیم کے لئے ادھر کا رخ کرنے لگے، اس باہمی میل جول اور علمی فضا نے ایک نئے شعور کو جنم دیا۔ ان کالجوں میں اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے اردو کے رسالے اور مجلّے جاری ہونے لگے تھے۔ پرنس آف ویلز کالج جموں سے ''توی'' اور امر سنگھ کالج سری نگر سے ''لالہ رخ'' کے علاوہ محکمہ تعلیم کی سرپرستی میں ''تعلیم جدید'' کے نام سے ایک معیاری رسالہ بھی شائع ہوتا تھا۔

جموں وکشمیر کو اردو ادب کی ابتدا کے حوالے سے یہ اعزاز حاصل ہے بقول محمود شیرانی ''دلی میں ابھی اردو دبستان قائم ہی نہیں ہوا تھا کہ لوگوں نے اردو مثنویاں لکھنی شروع کر دی تھیں''۔ ان کا مطلب قدیم مثنوی ''گلزار فقیر'' ۱۱۳۱ھ (۱۵۶۰ اشعار) سے ہے جس کے خالق میاں غلام محی الدین ہیں۔ ''بہار گلشن کشمیر'' از پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ میں ۱۸۸۰ء سے پہلے دو ہندو شاعروں کا تذکرہ ملتا ہے جن کے نام پنڈت شیو نرائن بھان عاجز اور دینا ناتھ چکن مست کشمیری ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی کی آخری دہائی اور اٹھارویں صدی کے اوائل میں میر کمال الدین حسین اندرابی رسواؔ کی اردو شاعری شہرت کی حامل ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ریاست میں علمی وادبی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ اردو کو سرکاری

زبان کا درجہ مل گیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں جموں کے کچھ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ’’بزمِ سخن‘‘ کے نام سے ایک ادبی انجمن کا قیام عمل میں لایا۔ اس کے بعد ۱۹۲۴ء سب سے پہلا کامیاب مشاعرہ ہوا جس کی صدارت رچھپال سنگھ کی اور نظامت کے فرائض کیفوی دہلوی نے سرانجام دیئے۔ جموں وکشمیر میں شروعاتی دور کے شعرا میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، شہہ زور کاشمیری، منشی محمد الدین فوق، منشی غلام نبی مسکین، مرزا مبارک بیگ، پنڈت راک کشن غافل، عبدالسمیع پال اثر صہبائی، لالہ پریم داس، درگا سہائے شوق، پنڈت نند لال طالب، دینا ناتھ مست، مرزا کمال الدین بلبل کشمیری، کیف اسرائیلی، غلام رسول نازکی، قیس شیروانی، غلام حیدر چشتی، خورشید احمد خورشید اور حبیب کیفوی وغیرہ نے پہلی بار جموں وکشمیر میں باقاعدہ شعر وسخن کی آبیاری کی۔ مرکزی شہروں کے علاوہ جزوی علاقوں میں بھی ارباب ذوق گرئی محفل کا سامان بہم کئے ہوئے تھے جیسے کٹھوعہ میں ماسٹر احمد دین اختر جیسے سلجھے ہوئے شاعر موجود تھے، بھدرواہ کے دور افتادہ گوشے میں عبدالقدوس رسا جاویدانی شاعر شمع انجمن بنے ہوئے تھے، پونچھ میں چراغ حسن حسرت، ضیاء الحسن ضیاء، نبی بخش نظامی، سراج الحسن سراج تحسین جعفری، خالد نظامی وغیرہ بڑے ذوق و شوق سے ہفتہ وار مشاعروں کا اہتمام کرتے رہتے تھے تقسیم ملک کے بعد اُبھرنے والے اُردو شعراء وادباء میں شمیم احمد شمیم، حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، اکبری حیدری، اکبر لداخی، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، مخمور بدخشی، غلام نبی خیال، سلطان الحق شہیدی، حکیم منظور، ہمدم کاشمیری، پرتپال سنگھ بیتاب، آنند لہر، خالد حسین، نور شاہ، رفیق راز، بلراج بخشی، اکبر جئے پوری، ویندر پٹواری، محمد زمان آزردہ اور دوسرے فن کاروں نے اُردو کی آبرو بنائے رکھی۔ اور اپنی لگن، محنت اور خلوص سے چند ہی برسوں میں جموں وکشمیر کے اُردو ادب کی تاریخ میں اپنے نئے انداز بیان، نئے افکار، نئے موضوعات اور نئے ولولوں کے ساتھ کو ملک کے دوسرے حصوں کے ہم عصر اُردو ادب کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔ یہ فضا ۱۹۶۰ء تک اپنے شباب پر رہی بعد میں ملک گیر پیمانے پر ادب میں تحریکوں کے اُبھرنے کے ساتھ ساتھ

ریاست جموں کشمیر میں بھی جدیدیت کے رجحان اور دیگر لسانی، موضوعاتی اور تیکنیکی تجربات کا ریاست کے لکھنے والوں پر بھی براہ راست اثر ہوا۔ یوں کہنہ مشق لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کچھ نئے نام سامنے آنے لگے۔ ان میں فاروق نازکی، فرحت گیلانی، صادق علی اسیر، ہردے کول بھارتی، نور شاہ، بنسی نردوش وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

موجودہ دور میں ریاستی زبان وادب کو فروغ دینے والوں میں سیفی سوپوری، مظفر ایرج، ہمدم کاشمیری، مخمور بدخشی، طاہر مضطر، غلام نبی خیال، عرش صہبائی، عابد مناوری، حامدی کاشمیری، قاضی غلام، ریاض پنجابی، بشیر کلد پب، شجاع سلطان، شبنم قیوم، ترنم ریاض، قدوس جاوید، ظہورالدین، محمد علی حسینی، ، غلام رسول ملک، شہباز راجوری، صابر مرزا، شبنم قیوم، ثنا اللہ بٹ، صوفی غلام محمد، رفیق راز، ترنم ریاض، رخسانہ جبیں، نسرین نقاش، شفیقہ پروین، عارفہ بشریٰ، نور رشاہ، محمد یوسف ٹینگ، جاوید آزر، پریمی رومانی، فرید پربتی، خالد بشیر، شمس الدین شمیم، شفق سوپوری، زاہد مختار، احمد شناس، قاسم سجاد، مبشر رفاعی، یوسف عاجز، جی۔ ایم آجر، حسن ساہو، شبیب رضوی، بلرج بخشی، وجید احمد اندرابی، طاہر محی الدین، ظہورالدین، بشیر احمد نحوی، الطاف انجم، محمد زمان آزردہ، سلیم سالک، مجید مضمر (مرحوم) نذیر ملک، شہاب عنایت ملک، نصرت آراء چوہدری، ضیاء الدین، محمد ریاض احمد، اسداللہ وانی، ریاض توحیدی، مشتاق حیدر، راہگیر لداخی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔

موجودہ دور میں اُردو شاعری کو فروغ دینے والے شعراء میں رفیق راز، ایاز رسول نازکی، خالد بشیر احمد، پرویز مانوس، شفق سوپوری، نذیر آزاد، صابر مرزا، پروین راجا، مشتاق مہدی، پریمی رومانی، نگہت فاروق نظر، عرش صہبائی، پرتپال سنگھ بیتاب، ترنم ریاض، سیدہ نسرین نقاش، رخسانہ جبیں، شبنم عشائی کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء کے شعری مجموعے آئے دن وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔ جن میں سے بعض کو نہ صرف ریاستی سطح پر سراہا جاتا ہے بلکہ عالمی سطح پر انہیں قدرومنزلت کی نگاہ سے بھی دیکھا جارہا ہے۔

اُردو نثر کے حوالے سے اگر بات کریں تو حبیب کیفوی نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ۶۵۔۱۹۴۶ء میں چودھری شیر سنگھ کی تحریر ''سفرنامہ بخارا'' کشمیر میں اردو کی پہلی تحریر ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے مطابق مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور اقتدار میں ۱۸۵۶ء میں لالہ بوٹا مل ایک سرکاری ملازم تھے جن کے ذمے جموں میں چائے کی کاشت کی نگرانی کا فریضہ سونپا تھا اس نے جموں کے بارے میں کانگڑہ کے ڈپٹی کمشنر کو رپورٹ اردو زبان میں پیش کی تھی۔ مہتہ شیر سنگھ کے ''سفرنامہ بخارہ'' کی مختصراً تحریر بطور مثال پیش ہے ''واضح ہو کہ یہ نمک پرودرہ، قدیمی حضور انور سری مہاراجہ صاحب بہادر فیاض زماں والی جموں و کشمیر سکنہ رامپور کا مہتہ شیر سنگھ نام قوم برہمن۔۔۔۔''۔ اس رپورٹ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اردو جموں و کشمیر میں خاصا رسوخ حاصل کر چکی تھی اور عوام و خواص میں اپنی جڑیں خاصی مضبوط کر چکی تھی۔

اس سفرنامے کے بعد ۱۸۷۷ء میں پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ کی تاریخ جموں و کشمیر ''گلدستہ کشمیر'' منظر عام پر آئی۔ جموں و کشمیر میں اردو زبان میں لکھی جانے والی یہ ہمہ جہت تصنیف ہے جو اس ریاست کے جغرافیائی حالات تاریخی نشیب و فراز، ہندو راجگان اور عہد اسلامیہ کے حالات و کوائف کے ساتھ ساتھ اہل جموں و کشمیر کے مذہبی رجحانات و میلانات، افکار و نظریات کے علاوہ اہل جموں و کشمیر کے رہن سہن، روایات و اقدار لباس و پوشاک اور تہذیب و تصانیف کے بیش بہا نمونے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ تصنیف نہ صرف جموں و کشمیر میں اردو نثر کا ایک سنگ میل ہے بلکہ اپنے عہد کی ایک ہمہ رنگ اور دلکش تاریخی دستاویز بھی ہے۔ ان ابتدائی کوششوں کے بعد رفتہ رفتہ جموں و کشمیر میں اردو نثر اپنے بال و پر نکالنے لگی اور عام لوگ بھی اردو بولنے اور لکھنے لگے۔ اخبار بینی کے فروغ نے بھی لوگوں کو اردو کے قریب لانے میں کردار ادا کیا اور رفتہ رفتہ اردو نہ صرف رابطے کی زبان قرار پائی بلکہ افکار و خیالات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنتی گئی۔ اہم نثر نگاروں میں پریم ناتھ پردیسیؔ، چراغ حسن حسرت، کرشن چندر،

قدرت اللہ شہاب، ٹھاکر پونچھی، رامانند ساگر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

دورِ حاضر کے لکھنے والوں میں نور شاہ، ترنم ریاض، حامدی کاشمیری، آنند لہر، خالد حسین، آمین بنجارا، وید راہی، مشتاق احمد وانی، ولی محمد، حسن ساہو، ڈاکٹر ظہور الدین، ورنید رپٹواری، جان محمد آزاد، مشراق مہدی، بشیر شاہ، خواجہ فاروق، غلام نبی شاہد، دیپک بدکی، زاہد مختار، شیام طالب، شیخ بشیر احمد، ذنفر کھوکھر، منصور احمد منصور، پرویز مانوس، سیدہ نکہت فاروق، مجیدار جمند، شیخ خالد کردار، مقبول ساحل، میر ایوب میر، ناصر ضمیر، ریاض توحیدی وغیرہ ایسے معتبر فن کار ہیں جنہوں نے صنف افسانہ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنا کر اُردو افسانے کی نئی راہیں ہموار کر رہے ہیں۔

جموں کشمیر میں اُردو ناول کی اگر بات کی جائے تو صرف چند ناول نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں اور اُن کے ناولوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ یہ ناول انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جموں وکشمیر میں اُردو ناول کی روایت ویسے بھی کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہاں آزادی کے بعد ہی اُردو ناول کی طرف توجہ دی گئی ہے اور جس طرح یہاں اُردو افسانے کو فروغ ملا ہے اس اعتبار سے جموں وکشمیر اُردو ناول کی صورتِ حال مایوس کن ہے۔ لیکن اکیسویں صدی تک آتے آتے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کے ساتھ ساتھ اُردو ناول کے معیار و مزاج اور رفتار میں بھی تیزی اور تبدیلی آئی ہے۔ آج اُردو ناول کی کیفیت اتنی مایوس کن نہیں ہے جتنی گذشتہ دہائیوں سے تھی۔

غیر افسانوی اصناف ہیئتی، موضوعات اور تکنیکی سطح پر اعلیٰ روایات پر قائم ہیں۔ ان میں خاص طور پر اردو خودنوشت کو مقبولیت حاصل ہے چونکہ اردو خودنوشت کی روایت میں شہرت و بلندی اختیار کرنے والی خودنوشت ''شہاب نامہ'' کے خالق قدرت اللہ شہاب کا تعلق بھی جموں وکشمیر سے تھا۔ اس علاوہ دیگر معیاری خودنوشت ہیں جن پر ریاستی اردو ادب کو ناز ہے جن میں ''یادوں کے چنار''، ''آتش چنار''، ''روداد قفس''، ''ولر کنارے''، ''یادوں کے لمس'' وغیرہ اپنی اہمیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔ موجودہ دور میں ریاستی سطح پر جو غیر افسانوی ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ بین الاقوامی

انشائیوں اور سفرناموں کے مقابلے رکھا جاسکتا ہے۔جموں وکشمیر میں اُردو نثر کے حوالے سے اردو صحافت،سفرنامہ اور انشائیہ نگاری کو زیادہ ترجیح ۱۹۵۰ء کے بعد دی گئی۔اس روایت کو مقالے میں واضح اور تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

المختصر یہ کہ جموں وکشمیر میں اُردو زبان کی تشکیل کا عمل مسلم دورِ حکومت کے قیام اور فارسی داں اولیا کرام کی آمد کے بعد اور ڈوگرہ حکومت کے قیام سے اُردو میں شعری اور نثری تخلیقات کی پیش کش کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔۱۸۸۹ء میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کے بعد سے ۱۹۵۰ء یا تقسیم ہند تک جموں وکشمیر کے شاعروں اور ادیبوں نے اُردو شعر وادب کے سرمائے میں ہر پہلو سے اضافہ کیا جس کی بدولت ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو زبان وادب کی صورت حال بعض خامیوں کے باوجود اتنی ہمہ جہت اور اطمینان بخش ہے کہ جموں وکشمیر کو بھی دہلی،لکھنؤ، لاہور،کراچی،عظیم آباد وغیرہ کی طرح اُردو کا ایک اہم مرکز مانا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

کتابیات اور رسائل و جرائد

۱۔ آزاد، عبدالاحد: کشمیری زبان اور اردو شاعری (حصہ اول)، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز سرینگر ۱۹۸۴ء

۲۔ آزاد، عبدالاحد: کشمیری زبان اور اردو شاعری (حصہ دوم)، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز سرینگر ۱۹۸۴ء

۳۔ آزاد، عبدالاحد: کشمیری زبان اور اردو شاعری (حصہ سوم)، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز سرینگر ۱۹۸۴ء

۴۔ آزاد جان محمد: جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، میکاف پرنٹرس، دہلی ۲۰۰۴ء

۵۔ آغا اشرف: کچھ لکھیئے کے لوگ کہتے ہیں، شالیمار آرٹ پریس، سرینگر، ۲۰۰۹ء

۶۔ آل احمد سرور: اردو فکشن، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۷۔ آنند لہر: سرحد کے اس پار (افسانوی مجموعہ)، سیمانت پرکاش دریا گنج دہلی ۲۰۰۱ء

۸۔ آنند لہر: انحراف (افسانوی مجموعہ)، ملک بک ڈپو ترکمان گیٹ، دہلی ۲۰۰۲ء

۹۔ اسیر، ولی محمد کشتواڑی: ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت، سال اشاعت ۱۹۹۸ء

۱۰۔ امیر اللہ خان شاہین: تخلیق و تنقید، موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۶ء

۱۱۔ اسلوب احمد انصاری: اقبال کی منتخب نظمیں، غالب اکیڈمی نظام الدین نئی دہلی ۱۹۹۴ء

۱۲۔ اکبر حیدری کاشمیری: تحقیق و انتقاد، اکبر حیدری کاشمیری ۱۹۶۶ء

۱۳۔ اکبر حیدری کاشمیری: تحقیقات حیدری نصرت پبلشرز امین آباد لکھنؤ ۱۹۸۴ء

۱۴۔ اے۔ این پرشانت: عبدالاحد آزاد تحقیقی مقالہ، پرشانت پبلی کیشنز رہاڑی جموں ۲۰۰۸ء

۱۵۔ ابوالکلام قاسمی: معاصر تنقید رویے، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۷ء

۱۶۔	احمد شناس	پس آشکار،	ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۱۰ء
۱۷۔	ایم۔ای خان	کشمیر تاریخ کے آئینے میں،	جے کے بک شاپ، سرینگر ۲۰۰۴ء
۱۸۔	ایم ایس ناز	امیر اللہ خان شاہین، تخلیق وتنقید،	موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۶ء
۱۹۔	اسداللہ وانی (مرتب)	فکروفن،	رچنا پبلیکیشنز ۲۰۱۱ء
۲۰۔	اسلوب احمد انصاری:	اقبال کی منتخب نظمیں،	غالب اکیڈمی نظام الدین، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء
۲۱۔	ابوالکلام قاسمی:	ناول کا فن	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۸ء
۲۲۔	احمد صغیر، ڈاکٹر:	اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ،	عصفی آفیسٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۹ء
۲۳۔	اشفاق احمد:	ذکرِ شہاب،	اردو سائنس بورڈ، لاہور ۱۹۸۶ء
۲۴۔	انوار پاشا:	ہندوپاک میں اردو ناول،	پیش رو پبلی کیشن، نئی دہلی ۔۱۹۹۲ء
۲۵۔	اختر انصاری:	غزل کی سرگزشت،	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۱۰ء
۲۶۔	افضال عامل، ڈاکٹر:	اردو شاعری کا منظر نامہ،	اثبات ونفی پبلیشرز کولکاتا ۲۰۱۴ء
۲۷۔	انور سدید، ڈاکٹر:	اردو ادب کی مختصر تاریخ،	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۱ء
۲۸۔	ابواللیث صدیقی:	آج کا اردو ادب،	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۵ء
۲۹۔	برج کشن بے خبر پنڈت:	بہار کشمیر،	انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۲
۳۰۔	برج پریمی:	جلوہ صدر رنگ،	دیپ پبلی کیشنز، نئی پورہ سرینگر ۱۹۸۵ء
۳۱۔	برج پریمی:	حرفِ جستجو،	دیپ پبلی کیشنز، نئی پورہ سرینگر ۱۹۸۵ء
۳۲۔	برج پریمی:	ذوق نظر تحقیق وتنقید،	رچنا پبلی کیشنز جموں توی ۱۹۸۷ء
۳۳۔	برج پریمی:	سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے،	مرزا پبلی کیشنز حسن آباد ر ۱۹۸۶ء
۳۴۔	برج پریمی:	جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما،	دیپ پبلی کیشنز، نئی پورہ سرینگر ۱۹۸۵ء

۳۵۔ برج پریمی: کشمیر کے مضامین، دیپ پبلی کیشنز، نئی پورہ سرینگر ۱۹۸۹ء

۳۶۔ بسمل، خورشید احمد: ابرنیساں (شعری مجموعہ)، مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ بی غ ش اکادمی راجوری ۲۰۱۰ء

۳۷۔ برج پریمی: چند تحریریں، دیپ پبلی کیشنز، نئی پورہ، سرینگر ۱۹۸۸ء

۳۸۔ بیخود سید احمد موہانی: گنجینۂ تحقیق، اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۷۹ء

۳۹۔ بیتاب، پرتپال سنگھ: موج ریگ (شعری مجموعہ)، رہبر آفسٹ پرنٹر، سرینگر ۲۰۱۳ء

۴۰۔ بیتاب، پرتپال سنگھ فلک آثار (شعری مجموعہ)، سرسبز پبلی کیشنز دھرمشالہ ۲۰۱۳ء

۴۱۔ پریمی رومانی: اوراق انتقادی، مضامین کا مجموعہ، دیپ پبلی کیشنز، نئی پورہ سرینگر ۱۹۸۷ء

۴۲۔ پریمی رومانی: برج پریمی ایک مطالعہ، دیپ پبلی کیشنز، نئی پورہ سرینگر ۱۹۹۳ء

۴۳۔ پریمی رومانی: برج پریمی: شخصیت اور فن، رچنا پبلی کیشنز جموں توی ۲۰۰۳ء

۴۴۔ پریم ناتھ در: بے تال لمحے، ناولستان، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔۲۵

۴۵۔ پریم ناتھ در: کاغذ کا واسدیو اور دیگر افسانے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

۴۶۔ پریم ناتھ در: چناروں کے سائے، فنکار کلچرل آرگنائزیشن ۱۵۹، ہاؤسنگ کالونی، سری نگر

۴۷۔ پرویز مانوس: مٹھی بھر چھاؤں (افسانوی مجموعہ)، درخشاں پبلی کیشنز ۱۱۵۰، آزاد بستی ویسٹ، نٹی پورہ، سرینگر

۴۸۔ پرویز مانوس: بیتے لمحوں کی سوغاتیں، درخشاں پبلی کیشنز ۱۱۵۰، آزاد بستی ویسٹ، نٹی پورہ، سرینگر

۴۹۔ پرویز مانوس: شکارے کی موت (افسانوی مجموعہ) درخشاں پبلی کیشنز ۱۱۵۰، آزاد بستی ویسٹ، نٹی پورہ، سرینگر

۵۰۔ پرویز مانوس: چاند، لمس، گلاب، درخشاں پبلی کیشنز، سنٹرز زوال انڈیا ریڈیو پونچھ، جموں وکشمیر

۵۱۔ پطرس بخاری: تنقیدی مضامین، ادبی دنیا میٹا محل دہلی ۱۹۸۳ء

۵۲۔ پنڈت، محمد امین: آئینہ تاریخ کشمیر، گلشن پبلیشرز، سری نگر ۲۰۰۲ء

۵۳۔ پونچھی، سجاد: سمندر آشنا (شعری مجموعہ) درخشان پبلی کیشنز، سری نگر ۲۰۱۵ء

۵۴۔ ترنم ریاض: فریب خط گل مورتی، امیکس بکس، سری نگر ۲۰۰۹ء

۵۵۔ ترنم ریاض: یہ تنگ زمین، ایچ۔ایس،آفسٹ پریس، دہلی ۱۹۹۸ء

۵۶ ترنم ریاض: مرارخت سفر، عفت آفسٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۸ء

۵۷۔ تاراچند، ڈاکٹر: اہل ہند کی مختصر تاریخ، اردواکیڈمی دلی (یونین پرنٹنگ، پریس دہلی ۱۹۶۸ء

۵۸۔ ٹینگ محمد یوسف: شناخت تحقیقی اور تنقیدی مقالات، محمد یوسف ٹینگ جواہرنگر سرینگر ۱۹۸۸ء

۵۹۔ ٹینگ محمد یوسف: جستہ جستہ تاریخی، تحقیقی اور تہذیبی مقالات، میکاف پرنٹرس دہلی ۲۰۰۱ء

۶۰۔ جمیل جالبی: نئی تنقید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۸ء

۶۱۔ جی۔ایم میر؛ جموں وکشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں، مکتبہ رضوان میر پور

۶۲۔ جمیل کاشمیری، آغا: انتخاب کلام آغا کاشمیری۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنوء ۱۹۹۱ء

۶۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء

۶۴۔ حامدی کاشمیری: تجزبہ اور فن، کمپیوٹرسٹی، راج باغ سرینگر ۲۰۰۳ء

۶۵۔ حامدی کاشمیری: اکتشافی تنقید کی شعریات، کمپیوٹرسٹی، راج باغ سرینگر ۱۹۹۹ء

۶۶۔ حامدی کاشمیری: ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ادب، گلشن پبلشرز سرینگر ۱۹۹۱ء

۶۷۔ حامدی کشمیری: معاصرِ تنقید ایک نئے تناظر میں، شیخ عثمان اینڈ سنز گاؤ کدل سرینگر ۱۹۹۲ء

۶۸۔ حامدی کاشمیری: جموں وکشمیر میں اردو ادب، گلشن پبلی کیشن سرینگر ۱۹۹۱ء

۶۹۔ حامدی کاشمیری: شاخ زعفران، جے کے آفسٹ پرنٹرس، دہلی ۱۹۹۱ء

۷۰۔ حامدی کاشمیری: نئی حسیت اور عصری اردو شاعری، جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی، ۱۹۹۱ء

۷۱۔ حامدی کاشمیری: شہر افسوں (افسانے) کمپیوٹرسٹی راج باغ، سرینگر، ۲۰۰۹ء

۷۲۔ حسینی، علی عباس: اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

۷۳۔ حشمت اللہ لکھنوی، مولوی: مختصر تاریخ جموں وکشمیر، جے کے بک ہاؤس، ریذیڈنسی روڈ، جموں (توی) ۱۹۹۸ء
۷۴۔ خان، نصیر احمد، پروفیسر: اُردو ساخت کے بنیادی عناصر، جے۔این۔یو، نئی دہلی ۱۹۹۱ء
۷۵۔ خان، محمد امین: آئینہ تاریخ کشمیر، جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی، سرنگر ۲۰۰۲ء
۷۶۔ خستہ، ہرگوپال: گلدستہ کشمیر، شاہین پبلیشرز، سری نگر ۱۹۸۶ء
۷۷۔ خواجہ محمد اعظم: واقعاتِ کشمیر، جموں وکشمیر اسلامک ریسرچ سنٹر ۱۹۹۸ء
۷۸۔ خورشید الاسلام: تنقیدیں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۵۷ء
۷۹۔ خوشحال زیدی: نئے تنقیدی زاویے، خضر راہ غفا مزل نئی دہلی
۸۰۔ رشید حسن خان: ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۸ء
۸۱۔ سید شاہ محمد: تحقیقی مقالے، عظیم الشان بکڈ پو سلطان گنج ۱۹۶۵ء
۸۲۔ سید شاہ رشید: تنقیدی مضامین، عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۱۹۷۰ء
۸۳۔ سید عقیل رضوی: معاصر اردو غزل، معیار پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۰۶ء
۸۴ سرور آل احمد: تنقیدی اشارے، ادارہ فروغ اُردو امین آباد لکھنو
۸۵۔ سروری عبد القادر: اُردو کی ادبی تاریخ، شیخ عثمان اینڈ سنز گاکدل سرینگر ۱۹۷۵ء
۸۶۔ سروری عبد القادر: کشمیر میں اُردو، پہلا حصّہ، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز سرینگر ۱۹۸۴ء
۸۷۔ سروری عبد القادر: کشمیر میں اُردو، دوسرا حصّہ، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز سرینگر ۱۹۸۴ء
۸۸۔ سروری عبد القادر: کشمیر میں اُردو، تیسرا حصّہ، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز سرینگر ۱۹۸۴ء
۸۹۔ شبیب رضوی، ڈاکٹر: لہولہو (شعری مجموعہ)، مصنف ونشر 2012ء
۹۰۔ شمس الدین احمد: راج ترنگنی (ترجمہ وتحقیق) گلشن پبلی کیشنز، سری نگر ۲۰۰۷ء
۹۱۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر: تاریخ کشمیر (اسلامی عہد میں) سنگ میل پبلیشرز ۱۹۸۴ء

۹۲۔ شہاب عنایت ملک، پروفیسر: جموں وکشمیر میں اردو زبان، ماضی، حال اور مستقبل، جموں یونیورسٹی

۹۳۔ شہاب عنایت ملک، پروفیسر: یادوں کے لمس، میزان پبلیشرز، سری نگر ۲۰۱۲ء

۹۴۔ شہناز قادری: اردو کے چند مشاہیر ادبستان پبلیشرز، دہلی ۲۰۱۳ء

۹۵۔ شیخ محمد عبداللہ: آتش چنار، گلشن بکس، ریذیڈنسی روڈ، سری نگر ۲۰۰۸ء

۹۶۔ ظہور الحسن ناظم، قاضی: نگارستان کشمیر، درجید برقی پریس بلیماران دہلی

۹۷۔ عشرت رحمانی: اردو ڈرامے کی تاریخ وتنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

۹۸۔ عرش صہبائی: دسترس (شعری مجموعہ، بزم اردو ادب، جموں ۲۰۰۷ء

۹۹۔ عرش صہبائی: تجھ بن چین کہاں (شعری مجموعہ)، مالوی پبلی کیشنز، جموں ۲۰۰۹ء

۱۰۱۔ غنی غیور: سروش، ادب سلسلہ پبلیکیشنز، لکشمی نگر دہلی

۱۰۲۔ فاروقی، شمس الرحمٰن: اردو کا ابتدائی زمانہ، ۲۶۶ مدینہ سٹی مال عبداللہ ہارون روڈ، کراچی ۲۰۰۹ء

۱۰۳۔ فاروقی، شمس الرحمٰن: اردو غزل کے اہم موڑ، نیو پرنٹ سنٹر، دریا گنج، نئی دہلی ۲۰۰۶ء

۱۰۴۔ فدا راجوروی: شہر دل (شعری مجموعہ)، الحیات پرنٹو گرافراس، سری نگر ۲۰۱۴ء

۱۰۵۔ فوق، محمد الدین: شباب کشمیر، گلشن پبلیشرز، سری نگر ۱۹۹۳ء

۱۰۶۔ فوق، محمد الدین: مختصر تاریخ کشمیر، گلشن پبلیشرز سری نگر ۲۰۰۲ء

۱۰۷۔ گیلانی، سید علی شاہ: روداد قفس، الہدی پبلیشنگ ہاؤس، سرینگر ۱۹۹۳ء

۱۰۸۔ گیلانی، سید علی شاہ: ولر کنارے، مرکزی مکتبہ تحریک حریت، حیدر آباد ۲۰۱۰ء

۱۰۹۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، اورینٹ پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء

۱۱۰۔ منصور احمد منصور: کشمیر، خواب، سراب اور گرداب، میزان پبلیشرز سری نگر

۱۱۱۔ مرزا خلیل احمد بیگ: اردو کی لسانی تشکیل، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۷ء

۱۱۲۔ مرزا خلیل احمد بیگ: اُردو زبان کی تاریخ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۷ء

۱۱۳۔ محمد منور مسعودی، ڈاکٹر: زیچن سے نجیت تک (تاریخ کشمیر)، انڈین پرنٹنگ پریس ڈلگیٹ، سری نگر ۱۹۹۳ء

۱۱۴۔ محمد منور مسعودی، ڈاکٹر: کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ، انڈین پرنٹنگ پریس ڈلگیٹ، سری نگر ۱۹۹۳ء

۱۱۵۔ معین الدین: اُردو زبان کی تدریس، قومی کونسل برائے فروغ اُردو۔۔۔

۱۱۶۔ نادر علی خاں: اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۷ء

۱۱۷۔ نصرت آرا، چودھری: ہتھیلی کا چاند: ۲۰۰۴ء

۱۱۸۔ نصرت آرا، چودھری: فیض احمد فیض، روایت اور انفرادیت، سیمانت پرکاش، نئی دہلی ۱۹۹۵ء

۱۱۹۔ نذیر ملک: اُردو رسم خط کا ارتقاء، امیکس بکس سرینگر ۱۹۹۷ء

۱۲۰۔ نقوی، ذولفقار: اجالوں کا سفر (شعری مجموعہ) اردو فاؤنڈیشن، ممبئی ۲۰۱۳ء

۱۲۱۔ نور الٰہی و محمد عمر: ناٹک ساگر، قومی انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۹۱ء

۱۲۲۔ نور شاہ: جموں و کشمیر میں اردو افسانہ

۱۲۳۔ وانی، مشتاق احمد: تقسیم کے بعد اردو ناول میں تنقیدی بحران، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۲ء

۱۲۴۔ وانی، مشتاق احمد: اردو ادب میں تانیثیت، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۲

۱۲۵۔ وزیر آغا: تنقید اور جدید اُردو تنقید، قومی کونسل برائے فروغ اُردو ۲۰۰۶ء

☆☆☆☆☆

رسائل وجرائد

۱۔ آجکل، دہلی: ماہنامہ، کشمیر نمبر، جلد۱۴، شمارہ ۱، اگست، ۱۹۵۵ء

۲۔ آجکل، دہلی: ماہنامہ، کشمیر نمبر، جلد نمبر ۲۷، شمارہ ۶، نومبر، ۱۹۵۹ء

۳۔ آزاد دنیا، لاہور: ماہنامہ، کشمیر نمبر، جلد ۱۱، شمارہ ۲۱، فروری، ۱۹۶۹ء

۴۔ ادبی دنیا، لاہور: ماہنامہ، کشمیر نمبر، دورِ ششم شمارہ ۱۹، مارچ، اپریل، ۱۹۶۶ء

۵۔ اخبار اُردو: مقتدرہ قومی زبان اسلان آباد پاکستان، جولائی ۲۰۰۷ء

۶۔ اُردو دنیا: قومی کونسل برائے فروغ اُردو، دہلی، مارچ ۲۰۰۸ء جلد ۱۰، شمارہ ۳

۷۔ اُردو دنیا: قومی کونسل برائے فروغ اُردو، دہلی، جولائی ۲۰۰۸ء جلد ۱۰، شمارہ ۷

۸۔ اُردو دنیا: قومی کونسل برائے فروغ اُردو، دہلی، دسمبر ۲۰۰۸ء جلد ۱۰، شمارہ ۱۲

۹۔ اُردو دنیا: قومی کونسل برائے فروغ اُردو، دہلی، اپریل ۲۰۰۱ء

۱۰۔ اردو دنیا: قومی کونسل برائے فروغ اُردو، دہلی، جون ۲۰۱۴ء

۱۱۔ اردو دنیا: قومی کونسل برائے فروغ اُردو، دہلی، دسمبر ۲۰۰۸ء

۱۲۔ اردو دنیا: قومی کونسل برائے فروغ اُردو، دہلی، جون ۲۰۱۷ء

۱۳۔ ایوان اردو: اردو اکادمی، دہلی، مارچ ۲۰۱۳ء

۱۴۔ ایوان اردو: اردو اکادمی، دہلی، مئی، ۲۰۰۷ء

۱۵۔ ایوان اردو: اردو اکادمی، دہلی،، جنوری، ۲۰۱۶ء

۱۶۔ بازیافت: شعبہ اُردو کشمیر یونی ورسٹی، جموں توی، سال ۲۰۰۶ء

۱۷۔ بازیافت: شعبہ اُردو کشمیر یونی ورسٹی، جموں توی، سال ۲۰۰۷ء

۱۸۔ تسلسل: شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں توی، سال ۲۰۰۹ء

۱۹۔ تسلسل: شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں توی، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۴ء

۲۰۔ تسلسل: شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں توی، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء

۲۱۔ تسلسل: شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں توی، جنوری تا جولائی ۲۰۰۵ء

۲۲۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، ۱۹۹۵ء تا ۲۰۱۷ء

۲۳۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، فرید پربتی نمبر

۲۴۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، آغا شورش کاشمیری نمبر

۲۵۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، پشکر ناتھ نمبر

۲۶۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، جموں و کشمیر میں اردو کے پچاس سال نمبر

۲۷۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، ہم عصر شعری انتخاب نمبر

۲۸۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، جموں، کشمیر، لداخ۔۔۔ جلد نمبر ۴ تا ۷

۲۹۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، صوفیانہ موسیقی اور کشمیر نمبر

۳۰۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، پروفیسر حامدی کاشمیری نمبر

۳۱۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، افسانہ نمبر

۳۲۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، جدید شاعری نمبر،

۳۳۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، ناول نمبر

۳۴۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، مہجور نمبر

۳۵۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، بیاد کشمیری، نمبر

۳۶۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، بیاد حکیم منظور، نمبر

۳۷۔ شیرازہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لینگویجز، سرینگر، غلام رسول نازکی، نمبر

۳۸۔ ترسیل: نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۲۰۱۱ء

۳۹۔ ترسیل: نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۲۰۱۲ء

۴۰۔ ادبستان علم وادب: جون تا دسمبر ۲۰۱۴ء

۴۱۔ فکروتحقیق (سہ ماہی): قومی کونسل برائے فروغ اُردو، نئی دہلی جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۱۳ء

۴۲۔ ماہ نوہ، لاہور: ماہنامہ جلد ۴۳، شمارہ ۵، جون ۱۹۹۰ء

☆☆☆☆

URDU LITERATURE IN JAMMU AND KASHMIR: A CRITICAL STUDY OF SELECT WRITINGS 1950 TO 2000

Dissertation submitted to the Jawaharlal Nehru University
In partial fulfillment of the requirements
for the award of the Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

By

LIAQAT ALI

Under the Supervision of

PROF. KHWAJA MD. EKRAMUDDIN

Centre of Indian Languages
School of language, Literature & Culture Studies
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
NEW DELHI-110067, INDIA

2017